تہی دامن



فہمی فردوس کا خصوصی طور پر کتاب گھر کے قارئین کیلیئے لکھا گیا ناول

''مہربانو'' کا زندگی نامہ......ایک لغزش اس کی پوری زندگی تہہ و بالا کر دیتی ہے......

تہی دامن

فہمی فردوس

پیش لفظ

میں فہمی فردوس ایک کہانی کار، ایک ناول نگار ہوں۔ ویسے تو مختصر کہانیوں اور افسانوں وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کرتی رہتی ہوں۔ مگر ناول لکھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔اور ناول لکھنا بہ نسبت افسانہ لکھنے کے زیادہ پسند ہے۔قارئین کی سند مقبولیت پا کر میرے چار ناول کتابی شکل میں مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ میرے دو ناول ''کرب محبت'' اور ''گرفتار ذات'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیے۔ ''کرب محبت'' نے ادبی حلقوں میں بہت شہرت سمیٹی۔ مزید دو ناول ''چاند جلتا رہا'' اور ''دل دیا در دلیا'' دُعا پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیے۔

''تہی دامن'' میرا پانچواں ناول ہے۔اس کا موضوع اور تھیم بہت منفرد اور ہٹ کے ہے۔

یہ ''مہربانو'' نامی عورت کا زندگی نامہ ہے۔جس کی ایک لغزش اس کی پوری زندگی کو تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ وہ دردر بھٹکتی ہوئی، زندگی کے کیسے کیسے نشیب و فراز طے کرتی ہے۔کہاں کہاں کی خاک چھانتی ہے۔کیسی کیسی اذیتیں سہتی ہے۔اور بالآخر یہ صعوبتیں برداشت کرتے کرتے وہ کیا سے کیا بن جاتی ہے۔

یہ جاننے کے لیے پڑھیں، اپنی طرز کا ایک انوکھا اور منفرد ناول۔۔۔''تہی دامن''

 

قسط نمبر 1

میں، مہربانو حجلہ عروسی میں پھولوں کی لڑیوں سے مزین بیڈ پر دلہن بنی بیٹھی اپنی قسمت پر اترا رہی تھی۔ اور اتراتی کیوں نہ، لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی مہربانو کو سیٹھ ناصر بڑے چاؤ سے بیاہ کر لایا تھا اور اس بات کا سارا کریڈٹ بلاشک وشبہ میرے اس حسن نوخیز کو جاتا تھا۔ میں، بائیس سالہ مہربانو جس کی خوبصورتی دیکھ کر چاند بھی شرماتا تھا، کسی طور بھی سیٹھ ناصر سے میرا جوڑ نہ بنتا تھا۔

بتیس سال کا سیٹھ ناصر، اپنی لحیم شحیم جسامت کی بدولت اپنی عمر سے دس سال بڑا دکھتا تھا۔ سانولی رنگت کے ساتھ، چہرے کے بھدے نقوش، اسے عام سے بھی عام شخص بناتے تھے مگر سچ کہتے ہیں سیانے، دولت میں بڑی طاقت ہے۔ یہ پاس ہو تو دنیا کی ہر چیز حاصل کی جاسکتی ہے۔ مہربانو جیسی حسینہ بھی۔

یوں سر جھکائے، ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے، میری کمر دکھنے لگی تھی۔ میں نے پیچھے رکھے ہوئے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر کمر کو بہم آرام پہنچایا اور کمرے کا ازسرنو جائزہ لینے لگی۔

سب سے پہلے بیڈ پر آویزاں مسہری کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور یہ عقدہ کھلا کہ مسہری اصلی پھولوں کی بجائے کاغذی پھولوں سے تیار کی گئی ہے۔

"تبھی میں کہوں، خوشبو کیوں نہیں آ رہی... بھلا کاغذ کے پھولوں سے بھی کبھی خوشبو پھوٹی ہے۔" مجھے اپنے نئے نویلے شوہر کی بدذوقی پر غصہ آنے لگا۔

کمرے میں سارا سامان میرے جہیز کا بھرا ہوا تھا۔ ایک مسہری، سسرال کی جانب سے ودیعت کی گئی تھی اور وہ بھی نقلی پھولوں والی۔ میرا جی برا ہو گیا۔ اب تو غریب غربا بھی اصلی گلاب کے پھولوں سے مسہری تیار کرواتے ہیں اور یہاں کاغذی پھول منہ چڑا رہے ہیں۔ اتنے میں کسی کے کمرے کی طرف آتے قدموں کی مدھم سی چاپ ابھری تو میں فٹ سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ گھونگٹ کو چہرے پر گرا کر سر جھکا لیا۔

دل دھک دھک کرنے لگا، جب کسی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازے کو لاک کر دیا۔ میں نے گھونگٹ کی آڑ سے، اپنے لمبے تڑنگے دلہے کا جائزہ لیا جو سرشاری سے معمور، خراماں خراماں چلتا ہوا بیڈ کی اور بڑھ رہا تھا۔ دلہے میاں کو دیکھتے ہی وہ سارا سبق بھولنے لگی جو اماں نے بڑی محبت اور محنت سے یاد کروایا تھا کہ مرد کی شکل نہیں اس کی کمائی دیکھی جاتی ہے۔

''ہائے اماں! کتنی ظالم ہو تم... اپنی چاند سی بیٹی کے لئے کیا یہی سانڈ ملا تھا تم کو۔'' میرے دل سے ہوک اٹھی۔

دلہے صاحب نے بیڈ پر تشریف رکھی تو میں نے قسمت کا لکھا سمجھ کر پھر سے سر جھکا لیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے پر گرا ہوا گھونگٹ الٹایا اور پھر جیسے سانپ سونگھ گیا۔ میں کافی دیر تک اس کے منہ سے اپنے لئے کسی تعریفی کلمے کا انتظار کرتی رہی مگر اس کی جانب سے مسلسل خاموشی نے مجھے حیران کر دیا اور میں نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ گڑبڑا گیا۔

''تم بہت خوبصورت ہو۔'' اس کے منہ سے بے اختیار یہ جملہ پھسل گیا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا تھا۔ وہ میرا ملکوتی حسن دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا۔

فتح یابی کے احساس سے دل جھوم اٹھا۔ میرا مجازی خدا، جسے پوجنے کا حکم میرے خدا نے مجھے دیا تھا وہ میرے سامنے رعب حسن سے مرعوب، میری پرستش کرنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔

''آنکھیں بند کر کے اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔'' وہ محبت سے بھیگے لہجے میں بولا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے، اپنا سفیدی مائل نرم گداز ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ذہن میں اس وقت اپنی عزیز سہیلی فوزیہ کے شرارت بھرے فقرات اٹکھیلیاں کر رہے تھے، جو وہ سرگوشیوں کی صورت میں، میرے کانوں میں وقتاً فوقتاً انڈیلتی رہتی تھی۔

''دیکھ لینا! دلہا بھائی سہاگ رات کو منہ دکھائی میں ڈائمنڈ کی رنگ پہنائیں گے یا یہ بھی ہو سکتا ہے، ڈائمنڈ کا نیکلس ڈال دیں تمہاری اس صراحی دار گردن میں، پھر وہ ٹھٹھہ لگا کر ہنستی اور شرارت آمیز لہجے میں کہتی۔'' ویسے ایک بات ہے، جب دلہا بھائی اپنے ہاتھوں سے تمہاری گردن میں ہار ڈالیں گے تو گدگدی تو بہت ہو گی۔'' وہ پھر سے بے ہنگم قہقہہ لگاتی اور میں شرم سے لال ہو جاتی۔

ناصر نے میرا لرزتا ہوا ہاتھ تھاما تو ایک کرنٹ سا پورے جسم میں دوڑ گیا۔ مردانہ ہاتھوں کا انجانا سا لمس دل کو گدگدانے لگا۔ اس نے میرے الٹے ہاتھ کو سیدھا کیا اور اس پر کوئی چیز رکھ کے بولا۔

''اب آنکھیں کھول سکتی ہو۔''

میں فٹ سے آنکھیں کھول کر کاغذ کے اس پرچے کو دیکھنے لگی جو تہہ کیا میری ہتھیلی پر رکھا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''یہ اماں کی دوا کھانے کے ٹائم کا شیڈول ہے۔ وہ کیا ہے کہ اماں ہمیشہ سے دوا کھانے کی بہت بری ہیں۔ میں تینوں وقت کی دوائی خود اپنے ہاتھ سے انہیں کھلاتا ہوں اور آج سے یہ ذمہ داری تمہیں سونپ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے تم یہ ذمہ داری احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کرو گی۔'' وہ خاموش ہو کر جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

اور اس وقت زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ دل خون کے آنسو کیسے روتا ہے اور ارمانوں پر اوس کیسے گرتی ہے۔ دل چاہ رہا تھا کہ ہتھیلی پر رکھے ہوئے اس پرچے کے پرزے پرزے کر کے سیٹھ ناصر کے منہ پر دے ماروں۔

کم ظرف، بے حس، بدذوق کہیں کا۔

آنکھوں میں آئے ہوئے تمام آنسو دل میں اتار لئے۔ ہاتھ میں دبا ہوا پرچہ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور خود اپنے مجازی خدا کی طرف پشت کئے لیٹ گئی۔

''کیا ہوا۔؟'' اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں! آرام کرنا چاہوں گی۔'' میری آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

''اوہ! کوئی بات نہیں، تم مکمل آرام کرو۔ آج کے دن دلہن بیچاری واقعی بہت تھک جاتی ہے۔''

وہ شرافت سے پرے ہٹ کر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد، اس کے زوردار خراٹوں سے بیڈ لرزنے لگا اور مجھے کھل کر رونے کا موقع مل گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن اماں، ابا، بھائی، بھابی اور فوزیہ ملنے آئے تو میں اس نقلی مسہری میں بیٹھی اصلی آنسو بہا رہی تھی۔ اماں مجھے یوں روتا دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔

''کیا ہوا بانو! تو رو کیوں رہی ہے، میری بچی۔''

اماں نے سینے سے لگایا تو میں بلک بلک کر رونے لگی۔ ابا اور بھائی نے سر پہ دست شفقت رکھ کے تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ دونوں باہر مردانے میں چلے گئے تو میں پھٹ پڑی۔

''اماں تم تو کہتی تھی، مرد کی شکل نہیں اس کی کمائی دیکھی جاتی ہے۔ کہاں ہے کمائی؟ کہیں نظر آئی تمہیں... مجھے تو ابھی تک نظر نہیں آئی۔ یہ مسہری دیکھ رہی ہو۔ یہ بھی نقلی پھولوں سے تیار کی گئی ہے۔'' میں ابھی تک ماں کے ساتھ لگی سسک رہی تھی۔

''کملی نہ ہو تو، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کون روتا ہے بھلا۔'' اماں نے خود سے الگ کر کے جھڑکا۔ ''تیری شادی ہوگئی ہے۔ سمجھداری کی باتیں کیا کر اب۔ اگر ساس نے سن لیا تو؟''

بھابی نے بھی آگے بڑھ کر گلے سے لگایا اور پیار بھری سرزنش کی تو میں فوزیہ سے مل کر منہ پھلائے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ فوزیہ بھی پاس بیٹھ کر میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے کھٹی میٹھی باتیں کر کے میرا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہاتھ سہلاتے سہلاتے اس کے ذہن میں اچانک کوئی بات آئی تو اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''دلہا بھائی نے جو ڈائمنڈ کی رنگ پہنائی ہے، وہ کہاں ہے؟''

اس کی یہ بات سن کر مجھے تو گویا آگ کے پتنگے ہی تو لگ گئے۔ سرعت سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولا اور اس میں رکھا ہوا رقعہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ رہا میری سہاگ رات کا تحفہ جو میرے شوہر نے مجھے منہ دکھائی میں دیا تھا۔''

تینوں حیران و پریشان سی اس رقعے کو دیکھ رہی تھیں جو میں نے فوزیہ کی طرف بڑھا رکھا تھا۔

فوزیہ نے کاغذ کا وہ پرزہ کھولا اور باآواز پڑھنے لگی۔

''صبح نو بجے ناشتے کے بعد ایک پیلی گولی، ایک لال گولی اور ساتھ ایک چمچ سیرپ، گیس والا۔''

''ارے چپ کر لڑکی! یہ کون سا سبق پڑھنا شروع کر دیا۔'' اماں نے ڈانٹا تو فوزیہ نے کاغذ پھر سے تہہ کر کے میرے ہاتھ میں دے دیا۔

''کیا ہوا اماں! داماد کا دیا ہوا تحفہ پسند نہیں آیا کیا؟'' میں نے طنز سے بھرپور لہجے میں پوچھا تو اماں جز بز ہو کر بول اٹھیں۔

''عجیب ہی کام کر دکھایا داماد صاحب نے۔ پہلے تو کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔''

اماں کا موڈ بھی قدرے خراب ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ساس صاحبہ کمرے میں مہمانوں سے ملنے آئیں تو ان کے ساتھ سب کا رویہ سرد سا تھا۔

''بہن ولیمے کا کیا ٹائم رکھا ہے؟'' اماں نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

''ولیمہ وغیرہ کرنے کا تو کوئی ارادہ نہیں مگر آپ لوگوں کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دیں گے۔'' انہوں نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''کیا! آپ لوگ ولیمہ نہیں کر رہے؟'' اماں کو ان کے جواب نے ششدر کر دیا۔ ''مگر کیوں بہن! ولیمہ کرنا تو سنت نبوی ہے۔''

''مرضی ہے ناصر کی، اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آج کل کی اولاد کہاں سنتی ہے۔ اور بہن ایک بات کہوں، برا نہ ماننا، شادی بیاہ کے دیگر معاملات میں ہم کون سی سنتیں پوری کرتے ہیں۔ بس ولیمے کے حوالے سے ہی سارا زور سنت پر لگایا جاتا ہے۔'' بڑی بی نے کمال مہارت سے بیٹے کی ازلی کنجوسی پر پردہ ڈالا۔

''تو پھر ہمیں اجازت دیجئے! ہم بانو کو لینے آئے ہیں۔ ولیمے کا کوئی پروگرام ہے نہیں تو پھر ہمارا یہاں رکنا بے سود ہے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں! آپ بانو بٹیا کو جب چاہیں لے کر جا سکتے ہیں مگر کھانا کھانے تک رک جاتے تو اچھی بات تھی۔''

''نہیں بہن! کھانے کی کوئی ایسی طلب نہیں۔ صبح سب نے کافی بھاری بھرکم ناشتہ کیا تھا۔''

اور یوں اماں مجھے لے کر واپس اپنے گھر آ گئی۔ نکلتے ہوئے ساس نے تاکید کی تھی کہ شام کو تیار رہنا، ناصر تمہیں لینے آئے گا۔

☆......☆......☆

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ ناصر صرف نام کا سیٹھ ہے ورنہ سیٹھوں والی اس میں کوئی بات نہ تھی۔ اس کی انتہائی درجے کو پہنچی ہوئی کنجوسی کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے ازراہ مذاق اس کے نام کے ساتھ سیٹھ کا دم چھلا لگا دیا تھا جبکہ وہ دونوں ماں بیٹا، یہ لقب پا کر پھولے نہ سماتے تھے۔ بحیثیت مالی، سیٹھ ناصر واقعی کسی سیٹھ سے کم نہ تھا، گھر سے تھوڑے فاصلے پر مین روڈ پر اس کی ''صفیہ بلڈنگ میٹریل'' کے نام سے دکان تھی۔ جہاں کنسٹرکشن کا سارا سامان دستیاب تھا۔

اپنی ماں کے نام پر رکھا ہوا دکان کا نام بہت چل نکلا اور اس چلتے ہوئے کاروبار کو وہ ماں کی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیتا تھا۔ ماں کی تو گویا پرستش کرتا تھا۔ رات کو جتنا بھی تھکا ہوا آتا، سب سے پہلے ماں کی قدم بوسی کرتا، کچھ دیر اس کے پاؤں دباتا اور پھر اپنے کمرے کا رخ کرتا اور اس کی ساری تھکاوٹ اتارنا میرا فرض ٹھہرتا۔

گھر کا سارا انتظام وانصرام، اماں جی نے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کیا پکانا ہے اور کیا کھانا ہے، کہاں جانا ہے اور کہاں نہیں جانا، ہر بات کا فیصلہ اماں کرتی تھیں۔

جہازی جسامت رکھنے والا سیٹھ ناصر، اماں کا بہت ہی سعادت منداور فرماں بردار بیٹا تھا۔ میری حیثیت گھر میں ایک نوکرانی سے زیادہ نہ تھی۔ میں ایسی کل وقتی ملازمہ تھی، جس کا دن صفائی ستھرائی، برتن اور کپڑے دھونے، کھانا پکانے اور سرو کرنے میں گزر جاتا اور رات مجازی خدا کی خدمت میں۔

ملازموں کو تو پھر بھی تنخواہ ملتی ہے اور کبھی کبھار چھٹی بھی مگر میری قسمت میں یہ دونوں چیزیں نہ تھیں۔ کبھی میکے جانے کا نام لیتی تو ساس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ اس صورت جانے کی اجازت ملتی، جب گھر کے سارے کام نپٹانے کے علاوہ کھانا بھی تیار کر کے رکھ جاتی۔

ناصر بائیک پر چھوڑ آتا اور شام کو واپس لے آتا۔

آج بھی اماں کے پاس بیٹھی دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

''اماں! بڑی جلد بازی کر دی تم نے، میں کون سا بوڑھی ہو رہی تھی جو فٹ سے... سیٹھ ناصر کے کھونٹے سے باندھ دیا۔''

''بیٹی! سوچا تو تمہارا بھلا ہی تھا۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں، بیٹی عیش کرے گی مگر کیا پتا تھا کہ دل کے کمینے نکلیں گے۔'' اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ہونہہ عیش... ملازمہ بنا کر رکھا ہوا ہے، دونوں ماں بیٹے نے مجھے۔ ماں کنجوس تو بیٹا مہا کنجوس ہے۔ ایک ایک پیسہ دانتوں سے کھینچتا ہے۔''

''صبر سے کام لے بانو! بچہ ہو لینے دے۔ پھر دیکھنا کیسے بدلتا ہے۔ اولاد چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ بڑوں بڑوں کو بدل کے رکھ دیتی ہے۔''

اماں مجھے ڈھارس دینے کے لئے ہمیشہ اسی آس کا سہارہ لیتی تھی مگر آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ اماں کا یہ خیال کتنا خام تھا۔

ماں تو میں بننے والی ہوگئی مگر ناصر کے رویے میں کوئی واضح بدلاؤ پیدا نہ ہوسکا۔

چھٹا مہینہ لگنے کے بعد بھی کسی کو میری حالت زار پر ترس نہ آیا تو ناصر سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھانی۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے بات چھیڑی۔

''گھر کے کام کاج کے لئے کوئی ملازمہ رکھ دیں۔ مجھ سے اب یہ مشقت نہیں ہوتی۔''

ناصر کا منہ کی طرف جاتا نوالہ ہوا میں معلق ہوگیا۔اس نے اچھنبے سے میری طرف دیکھا، چہرے سے نظر پھسلتی ہوئی پھولے ہوئے پیٹ پر آرکی اور پھر اسے شاید مجھ پر ترس آ گیا۔

''دیکھتا ہوں کوئی شریف عورت... جو گھر کا سارا کام کر دیا کرے گی۔''

اس کی بات سن کر میں نے اطمینان کی سانس لی جو میری ساس سے برداشت نہ ہوئی۔لگی ساسوں والے روایتی ہتھکنڈے استعمال کرنے۔

''بھئی میاں! مرضی ہے تمہاری، بیوی کو ایک چھوڑ، دو دو نوکرانیاں رکھ دو مگر یہ بات ذہن میں رکھو تم دونوں، جو عورت دوران حمل محنت و مشقت والے کام زیادہ کرتی ہے، زچگی کے وقت اتنا ہی فائدے میں رہتی ہے۔ ہمارے وقتوں میں تو کبھی کسی نے ہمارے چونچلے نہ اٹھائے۔ آخری ایام تک سارے گھر کا کام اکیلی کرتی رہی، تمہاری پیدائش سے چند گھنٹے پہلے اتنے بڑے گھر کی چھت کی لپائی کی میں نے اکیلے ہی۔'' اماں نے بات مکمل کر کے فخر اور حقارت کی ایک نظر مجھ پر انڈیلی۔

''اماں چھوڑو پچھلی باتوں کو، وہ دور اور تھا۔'' ناصر نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں اماں کو ٹوک دیا۔

اماں نے اپنا داؤ خالی جاتے دیکھا تو فٹ سے پینترا بدلا۔

''سچ کہتے ہو بیٹا! اب نہ وہ دور رہا اور نہ وہ خوراکیں... آج کل کی لڑکیاں تو بس دو کام کئے نہیں اور کمر پکڑی نہیں۔ یہ بھی کیا کریں بیچاریاں۔ کھادوں والی خوراکوں نے انسانوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا بس۔''

مجھے ساس کی باتوں پر غصہ تو بہت آ رہا تھا مگر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ اس سے الجھنا، ناصر کے خوشگوار موڈ کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔اس لئے خاموشی سے اٹھی اور برتن سمیٹنے لگی۔

☆......☆......☆

آٹھواں مہینہ شروع ہوا تو ساس صاحبہ نے ایک نیا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کچھ ایسے فقرے کانوں میں پڑنے لگے۔

''بہو! تمہاری اماں کب آ رہی ہے تمہیں لے جانے کے لئے؟ بھئی ہمارے ہاں تو یہی رواج صدیوں سے چلا آ رہا ہے کہ پہلا

بچہ میکے میں ہوتا ہے۔"

آخر ایک دن میں بول ہی پڑی۔

"مگر ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ بچے سسرال میں ہی پیدا کئے جاتے ہیں۔میری بھابی کے تینوں بچے ہمارے ہاں ہی ہوئے تھے۔"

"بھئی ہر گھر کے اپنے قاعدے اور اصول ہوتے ہیں۔ہمارے اس صدیوں پرانے دستور کو تم بدل نہیں سکتی۔تمہارا پہلا بچہ تو تمہاری اماں کے ہاں ہی ہوگا۔" ساس نے فیصلہ کن لہجے میں یہ فیصلہ سنا دیا۔

میں نے ناصر سے بات کرنے کا سوچا۔رات کو اپنے کمرے میں ناصر کے سامنے یہ بات چھیڑی۔مجھے پورا یقین تھا کہ ناصر اماں کے اس موقف کی مخالفت کرے گا مگر اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے بھی میرے میکے جانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اماں کے فیصلے کی مکمل تائید بھی کی۔

"مگر میرے میکے والوں کے مالی حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ابا کی ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی تھی وہ میری شادی پر خرچ ہو گئی تھی۔اور بھائی کی تنخواہ سے ان کے بیوی بچوں کا بمشکل گذارہ ہوتا ہے۔ایسے حالات میں، میرا وہاں جانا مناسب نہیں۔" میں نے احتجاج کیا تو وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے! زچگی کے وقت جتنا خرچہ آئے گا وہ میں دے دوں گا مگر ہوگا وہی جو اماں چاہتی ہیں۔" وہ پہلو بدل کر سو گیا اور میں اس کے رویے پر سوائے سلگنے کے کچھ بھی نہ کر سکی۔

اماں مجھے ملنے آئیں تو ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی۔خلاف توقع اماں یہ سن کر بالکل پریشان نہ ہوئی بلکہ مجھے تیاری کا حکم دیا۔

"مگر اماں! آپ اتنا خرچہ کہاں سے کریں گی؟"

مجھے اماں پر واقعی ترس آ رہا تھا اور ساس پر ازحد غصہ، جو بیٹے کے چند سکے بچانے کی خاطر اپنی زمہ داری کا بوجھ ان غریبوں پر زبردستی لاد رہی تھی۔

"تمہارا شوہر اور اس کی ماں تمہیں یہاں سے زبردستی نکالنے پر تلے ہیں۔رسم و رواج کی آڑ میں پیسے بچانا چاہتے ہیں۔بہتر یہی ہے کہ، خود ہی عزت سے تمہیں لے جاؤں ورنہ یہ لوگ زبردستی بھی چھوڑ آئیں گے۔"

میں نے اماں کی حکمت کے سامنے سر جھکا دیا اور اٹھ کر اپنے کپڑے بیگ میں ڈالنے لگی۔

اوپر سے ساس صاحبہ تشریف لے آئیں۔اماں سے دعا سلام کرتے ہوئے کن انکھیوں سے میری تیاریوں کو دیکھتی رہی۔پھر بیٹھتے ہی گویا ہوئی۔

''بہو! کہیں جارہی ہو کیا؟''

''جی! اماں مجھے لینے آئی ہیں۔ان کے ساتھ جارہی ہوں۔''میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ اچھا! وہ خوش ہوگئی۔'' دیکھئے بہن، اچھا تو نہیں لگ رہا کہ پہلے بچے کی پیدائش ہے اور بہو کو آپ کے ہمراہ چلتا کردوں مگر کیا کروں، مجبوری ہے۔ہم بھی آخر شریکا برادری میں بیٹھے ہیں۔نہ گئی تو لوگ بھانت بھانت کی باتیں بنائیں گے۔''

''جی جی! میں آپ کی مجبوری سمجھ رہی ہوں، آپ بے فکر رہیں۔اور پھر بانو یہاں رہے یا وہاں رہے، بات تو ایک ہی ہے۔'' اماں کی وضاحت پر وہ پھولی نہ سمائی۔

''بس اب تو داماد جی کے آنے کا انتظار ہے۔ان سے اجازت لیں اور چلتے بنیں۔''

''ناصر کی فکر مت کریں! وہ آئے گا تو اسے بتا دوں گی۔'' ساس صاحبہ کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ کہیں اماں کا ارادہ نہ بدل جائے یا پھر ناصر مجھے روک نہ لے مگر میں اچھی طرح جانتی تھی کہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔نہ اماں کا ارادہ بدلنے والا ہے اور نہ وہ کم ظرف مجھے روکنا چاہے گا۔

''اماں! میرے خیال میں خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں... وہ ناصر کو سمجھائیں گی تو ناصر سمجھ جائے گا۔'' میری یہ بات اس امر کا اشارہ تھا کہ ہمیں اب وہاں سے چلنا چاہیے۔

گھر سے نکلتے وقت میری ساس نے میرا سر ماتھا چوم کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔اس وقت مجھے اس کے وجود سے گھن محسوس ہورہی تھی۔

☆......☆......☆

بھابی نے میری میکے آمد پر ناک بھوں تو چڑھائی مگر کھل کر کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ بہر حال ابھی اماں، ابا حیات تھے اور ابا اپنی پنشن سے ایک معقول حصہ گھر کے اخراجات میں ڈالتے تھے۔دونوں میاں بیوی، بیٹے پر بوجھ نہ تھے بلکہ کافی حد تک بیٹے کا بوجھ سہار رکھا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے رینگتا رہا اور میں مقررہ وقت پر ایک چاند سے بیٹے کی ماں بن گئی۔بچے کی پیدائش کی خبر سن کر دونوں ماں بیٹا مٹھائی کی ڈبہ اٹھائے ہوسپٹل میں آئے۔سب کا منہ میٹھا کروایا اور ناصر نے بیٹے کو گود میں اٹھا کر اس کے کان میں اذان دی۔

اپنے بیٹے پر، اس کے باپ اور دادی کو یوں محبتیں نچھاور کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا مگر ناصر نے جھوٹے منہ نہ پوچھا کہ ہسپتال میں کتنے پیسے خرچ ہوئے یا یہ پیسہ کون خرچ کر رہا ہے۔اس نے یہ ذکر ہی گول کر دیا اور مجھے بھی اماں نے روک دیا کہ ناصر سے کوئی پیسہ مانگنے کی ضرورت نہیں۔

جب تک میکے رہی، ناصر ہر دوسرے تیسرے دن ملنے کے لئے آتا رہا۔خصوصاً بیٹے کی آمد کے بعد۔اس کے رویے میں ایک

واضح تبدیلی محسوس ہوتی تھی۔اماں ابا بھی بہت خوش تھے۔اماں اکثر پیار بھرے لہجے میں کہتی۔

"دیکھا! میں نہ کہا کرتی تھی... اولاد آنے کے بعد مرد بدل جایا کرتے ہیں۔"

اولاد چیز ہی ایسی ہے اور میں بھی مسکرا کر اماں کی باتوں پر یقین لے آیا کرتی۔ماں بننے کے بعد اپنا آپ بڑا ارفع اور قیمتی لگنے لگا۔

☆......☆......☆

چلہ پورا کر کے سوا مہینے کا بیٹا گود میں اٹھائے شوہر کے ہمراہ اپنے گھر میں داخل ہوئی تو میری گردن احساس تفاخر سے تنی ہوئی تھی مگر تھوڑی دیر بعد جب ساس صاحبہ نے بیڈ پر رکھے ہوئے شاپرز کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ

"بہو! میکے سے کیا لائی ہو؟"

تو فخر سے تنی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔

اگلے ہی لمحے جب ساس نے میکے سے گیا ہوا میرا سامان دیکھا تو اس کا موڈ خراب ہو گیا کیونکہ ان شاپرز میں اس کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔

وجہ صاف ظاہر تھی۔

پرائیویٹ ہوسپٹل میں نارمل زچگی پر بھی اچھا خاصا خرچا اٹھ آیا تھا۔بچے کی پیدائش کے بعد بھی اماں نے خوب اچھی خوراک کھلائی تھی مجھے۔پورے ایک مہینے تک بکرے کے گوشت کے ساتھ روٹی کھلاتی رہی تھیں لہٰذا مجھے وداع کرتے وقت منا اور ہم دونوں میاں بیوی کے کپڑوں کے علاوہ کچھ کھلونوں کے سوا مزید کچھ اور ہمراہ نہ کر سکیں۔

ساسو ماں کو پھر سے طنز کے نشتر چبھونے کا بہانہ مل گیا۔

"بھئی! ہمارے ہاں تو رواج ہے پہلے بچے کی پیدائش پر بہو کے میکے سے گاڑیاں بھر بھر کے سامان آتا ہے... زاہدہ کی بہو اپنی ساس کے دو جوڑے، کپڑوں کے علاوہ سونے کی انگوٹھی بھی لائی ہے۔حق ہاہ۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری اور بولی۔

"ایک ہماری بہو ہے انگوٹھی تو درکنار ایک جوڑا سوٹ بھی نہ لا سکی ہمارے لیے... قسمت اپنی اپنی، اب ہر کوئی زاہدہ جتنا خوش قسمت تو نہیں ہو سکتا نا۔"

میں کچھ دیر تک اس کی طنزیہ باتیں برداشت کرتی رہی پھر اٹھ کر اپنا سوٹ اٹھایا اور اس کے آگے رکھ دیا۔

"یہ کیا! یہ تو تمہارا سوٹ ہے نا؟ میرے آگے کیوں رکھ رہی ہو۔"

"میرے پاس پہلے ہی کافی سوٹ موجود ہیں یہ آپ سلوا لیں۔" میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

"ارے نہیں بہو! تم میری باتوں کا غلط مطلب سمجھی ہو۔" وہ کھسیانی ہو کر مسکرائی۔

''میں آپ کی ہر بات کا مطلب ٹھیک سمجھی ہوں۔ آپ یہ سوٹ رکھ لیں مجھے اماں اور لے دیں گی۔'' میں نے سوٹ اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دیا۔

''اچھا تو نہیں لگتا کہ تمہارے میکے سے تمہارے لئے آیا ہوا جوڑا میں رکھ لوں مگر تمہارے محبت بھرے اصرار کو دیکھتے ہوئے انکار بھی نہیں کر سکتی۔'' ساس نے باچھیں پھیلائیں اور سوٹ بغل میں دبا کر چلی گئی

☆......☆......☆

بیٹے کا نام ناصر نے ''شیراز'' رکھا تھا۔ شیراز تین چار ماہ کا ہوا تو اسے ڈائیریا ہو گیا۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تو اس نے دوا کے علاوہ ڈبے کا دودھ بھی لکھ دیا۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کی انتڑیوں میں انفیکشن ہو گئی تھی۔ بھینس کا دودھ اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

ڈبے کا دودھ تھوڑا مہنگا تھا۔ ایک ڈبہ تو ڈاکٹر کے کہنے پر ناصر نے خرید لیا جو ایک ہفتے کے اندر ختم ہو گیا۔ میں نے اگلے ڈبے کی ڈیمانڈ کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ ''ڈبے کا دودھ میں افورڈ نہیں کر سکتا تم اس کو اپنا دودھ پلاؤ یا پھر بھینس کا۔''

اس کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔

''تم جانتے ہو! مجھے دودھ نہیں اترا، منے کی پیدائش کے بعد ہونے والے ٹائیفائیڈ نے دودھ خشک کر دیا تھا اور بھینس کا دودھ اسے ہضم نہیں ہو گا۔ اس کا معدہ کمزور ہو چکا ہے۔''

''میں یہ سب نہیں جانتا! ڈبے کا دودھ میری پہنچ سے باہر ہے۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

''کیوں تمہاری پہنچ سے باہر ہے؟ تم کوئی مفلس آدمی تو نہیں اچھے بھلے کھاتے پیتے ہو... کس کام کا یہ پیسہ ہے اگر اپنی اولاد پر بھی خرچ نہیں کر سکتے۔'' میں جوش میں نجانے کیا کیا بولے جاتی۔ وہ تو ناصر کا کرارا تھپڑ گال پر پڑا تو چلتی ہوئی زبان کو بریک لگا۔ میں سلگتے ہوئے گال پر ہاتھ رکھے ہونق چہرہ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

''شوہر کے سامنے زبان چلاتی ہو۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا گھر سے باہر چلا گیا اور میں شیراز کو گود میں ڈالے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''برا نہ منانا بہو! شوہر کے سامنے زبان چلانے والی عورتوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔'' بڑی بی نے اپنے تئیں سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے زہرناک نظروں سے اسے گھورا تو گڑبڑا کر بولی۔

''گھر کی بڑی ہوں۔ میرا کام تو سمجھانا ہے کوئی سمجھے نہ سمجھے یہ اگلے کی مرضی۔'' اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

میں اٹھ کر اپنے اور منے کے کپڑے بیگ میں ڈالنے لگی۔ میں اس گھر میں ایک پل بھی رکنے والی نہیں تھی۔ جہاں میری اور میرے بچے کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

ایک ہاتھ میں بھوک سے بلکتے بیٹے کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں، میں بیگ پکڑے گھر سے نکلنے لگی تو ساس نے روکنے کی کمزور سی کوشش کی۔

''کہاں جارہی ہو بہو! شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنے والی عورت ہمیشہ پچھتاتی ہے۔''

''جہنم میں جائے ایسا شوہر جو بیوی اور اولاد کے حقوق ادا نہیں کرسکتا۔'' میں بپھر کر بولی تو بڑی بی سہم کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

میں نے رکشہ کروایا اور اماں کے ہاں آگئی۔اماں نے ساری صورت حال سن کر اپنی عقل اور میری تقدیر دونوں کو خوب کوسنے دیئے اور سب سے پہلے جا کر میڈیکل اسٹور سے منے کے لیے دودھ کا ڈبہ لائی۔

منا دودھ پی کر سو گیا تو اماں میری طرف دیکھ کر فکرمندی سے بولی۔

''تمہاری ساس ایک نمبر کی چالباز عورت ہے۔اب تمہاری غیر موجودگی میں خوب کان بھرے گی بیٹے کے۔''

''مجھے پرواہ نہیں!'' میں سلگ کر بولی۔''اور نہ ہی میرا ارادہ اس گھر میں دوبارہ جانے کا ہے۔''

''ایسا ممکن نہیں ہے میری بچی اب تمہیں وہیں زندگی کے دن پورے کرنے ہیں۔'' اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔''تقدیر بدلنے کا اختیار ہم عورتوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔''

☆......☆......☆

اماں کا کہا سچ ثابت ہوا۔ایک ہفتے بعد ناصر مجھے لینے آگیا تو ابا اور اماں نے بغیر اس سے کوئی باز پرس کیے مجھے اس کے ہمراہ چلنے پر آمادہ کرلیا۔

میں بھی خود کو اس ایک ہفتے میں بھابی اور بھیا کا رویہ دیکھتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر راضی کرچکی تھی۔اسی لیے بغیر کسی چوں چراں کے سیٹھ ناصر کے ہمراہ چل پڑی۔

زندگی پھر سے پرانی ڈگر پر دوڑنے لگی۔شیراز دو سال کا ہوا تو ارباز میری گود میں آگیا اور اسی وقت میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ مزید بچے پیدا نہیں کروں گی بلکہ عملی طور بھی ایک انتہائی قدم اٹھالیا۔

ناصر کی کنجوس فطرت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔نہ بچوں کے پہننے کے لیے اچھے ملبوسات خریدتا اور نہ ہی اچھی خوراک مہیا کرتا۔البتہ اماں کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنے ایمان کا حصہ خیال کرتا۔

صبح دکان پر جانے سے پہلے اماں سے باقاعدہ پوچھ کر جاتا کہ اماں! آج شام کو تمہارے لیے کون سا پھل لے کر آؤں۔''

اماں جواباً جو بھی فرمائش کرتی اسے حتی المقدور پوری کرنے کی کوشش کرتا۔

شام کو اماں کی پسند کا پھل جب اماں کے حوالے کرتا تو میرے دونوں بچے حسرت سے دور بیٹھے تکا کرتے۔ میں ان کی شکلیں دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتی۔

اماں کی شکم سیری سے جو چیزیں بچ جاتیں وہ اماں اگلے دن ہمارے حوالے کر دیتی۔ اس امید پر کہ شام کو پھر سے نئی کھیپ مل جانی ہے۔

☆......☆......☆

دن اور رات ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے اور میں قسمت کا لکھا جان کر صبر و استقامت سے وقت کاٹتی رہی۔ بچوں کی چھوٹی موٹی خواہشات میری اماں پوری کر دیا کرتی۔

شیراز چار سال کا ہوا تو ایک مرتبہ پھر سے ایک معرکتہ لآرا بحث چھڑ گئی جو بالآخر اچھی خاصی تلخ کلامی پہ منتج ہوئی۔

میں شیراز کو کسی اچھے پرائیویٹ اسکول میں داخل کروانا چاہتی تھی جبکہ ناصر کی ازلی کنجوسی یہاں بھی آڑے آئی۔ اس نے میرے موقف کی سختی سے مخالفت کی اور اسے سرکاری اسکول میں داخل کروانے پر زور دیا۔

میں اپنے موقف پر ڈٹ گئی اور وہ اپنی ضد پر۔

حالات خاصی سنگین صورت اختیار کر گئے۔ ساس نے بیٹے کو سمجھانے کی بجائے پھر سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بہو! جن بچوں نے پڑھنا ہوتا ہے وہ سرکاری اسکولوں میں بھی پڑھ جاتے ہیں... اور جنہوں نے نہیں پڑھنا ہوتا وہ کہیں بھی نہیں پڑھتے۔ زاہدہ کے بیٹے کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ سرکاری اسکول میں پڑھ کے اتنا بڑا افسر لگ گیا۔''

''خدا کے لیے خاموش ہو جائیں! اپنے بیٹے کی بے جا حمایت مت کیا کریں۔'' میں بھڑک اٹھی۔ ''میں سرکاری اسکولوں کے بے رحم اساتذہ کے حوالے اپنے بچوں کو نہیں کر سکتی۔''

''اماں سے زبان چلانے کی ضرورت نہیں! بس میں پرائیویٹ اسکول کے چونچلے افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''چلو شیراز بیٹا! اسکول چلیں۔'' اس نے شیراز کا ہاتھ تھاما اور گھر سے نکل گیا۔

میں کتنی دیر تک اپنی اور اپنے بچوں کی قسمت کو بیٹھی روتی رہی۔ جو ایک امیر باپ کے گھر میں پیدا ہو کے بھی غریبوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

میرے سخت احتجاج کے باوجود بھی وہ شیراز کو سرکاری اسکول میں داخل کروا کر گھر لوٹا اور میرے خراب موڈ کو پیش نظر رکھتے ہوئے واپسی پر میرے لیے گول گپے بھی لیتے ہوئے آیا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے گول گپے بہت پسند ہیں۔

گول گپے دیکھ کر بھی میرا موڈ بحال نہ ہوا تو شیراز نے باپ کے کہنے پر ایک گول گپہ اٹھا کر میرے منہ کی طرف بڑھایا۔ اس کے

ننھے سے ہاتھ کو اپنی طرف بڑھا دیکھا تو آنکھیں بھر آئیں اور بے اختیار منہ کھول دیا۔

رات تک میرا موڈ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ ناصر میرے پاس بیٹھا نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں گن رہا تھا۔

اس نے ساری رقم گن کر ان گڈیوں کو کمرے میں رکھی ہوئی لوہے کی بھاری بھرکم سیف میں رکھ دیا۔ سیف کو لاک کر کے چابیوں کا گچھا اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر اس پر سر رکھ کے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

میں جو اس کی حرکات بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ بول پڑی۔

''کیا کرو گے اتنی دولت کا۔''

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے میرے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔

''کیا مطلب! دولت کا کیا کروں گا۔ میری اولاد کے کام آئے گی۔ پیسے کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

''کیا فائدہ اس پیسے کا جو اولاد کی اچھی تعلیم تربیت پر خرچ نہ کیا جائے۔'' میرے لہجے میں تلخی گھل گئی۔

''اوہ! یعنی تمہارا غصہ ابھی تک برقرار ہے... دیکھو کان کھول کر سن لو۔ میں اپنی اولاد کی تعلیم تربیت اپنی مرضی کے مطابق کروں گا۔ مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔'' اتنی بات کہہ کر اس نے کروٹ بدل لی۔

''مگر پیسہ تو انسان بیوی بچوں کے لیے کماتا ہے نا۔ اگر وہی خوش نہ ہوں تو فائدہ اس دولت کا۔''

''بڑی محنت سے یہ پیسے کماتا ہوں۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے فضول کاموں میں نہیں اڑا سکتا۔'' اس نے رخ پھیرے بغیر جواب دیا اور میں دل مسوس کر رہ گئی۔

شیراز سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ میں ہر روز اس سے پوچھتی کہ ٹیچر نے مارا تو نہیں۔ اس کا جواب نفی میں دیکھ کر میں مطمئن ہو جاتی۔ لگتا ہے ناصر ٹھیک کہتا ہے۔ اب سرکاری اسکولوں کا معیار بھی پہلے سے کافی بہتر ہو گیا ہے۔ اب سرکاری ٹیچرز بھی بچوں کو جانوروں کی طرح نہیں مارتے۔

وقت گزرتا رہا اور میں کولھو کے بیل کی طرح سارا سارا دن کام میں جتی رہتی۔ حالات نے پھر کچھ اس انداز سے پلٹا کھایا کہ مجھے ایک بار پھر دونوں بچوں کو ساتھ لے کر اس گھر سے دربدر ہونا پڑا۔

ہوا کچھ یوں کہ شیراز نے بائیسیکل کی فرمائش کی جو ناصر نے حسب توقع پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے خوب زور لگایا مگر ہمیشہ کی طرح اپنی بات منوانے میں ناکام رہی۔ ساس نے ہمیشہ کی طرح اڑنگا لگایا کہ اتنے چھوٹے بچے کو سائیکل لے کر دینا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بچے سائیکل لے کر ہیوی ٹریفک میں گھس جاتے ہیں اور جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

اب کی بار میں نے بھی ہر حال میں اپنی بات منوانے کی ٹھان لی۔ اپنی ضد پر اڑ گئی۔ ناصر بھی لوہے کی لٹھ ثابت ہوا۔ اپنے انکار پر جوں کا توں ڈٹا رہا اور پھر میں پہلی بار بغاوت پر اتر آئی۔ ایک خیال میرے ذہن میں آیا تو بلا خوف وخطر اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

رات کو ناصر نے حسب عادت نوٹ گنے اور انہیں آہنی سیف میں رکھ کے سیف کی چابی سرہانے کے نیچے رکھی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں کن انکھیوں سے اس کی ساری کارروائی دیکھتی رہی اور انجان بنی لیٹی رہی۔

اب مجھے اس کے سونے کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اب مجھے اس کے کروٹ بدلنے کا انتظار تھا۔ جیسے ہی اس نے پشت میری طرف پھیری میرا ہاتھ آہستگی سے رینگتا ہوا اس کے تکیے کے نیچے گیا اور جب باہر آیا تو میرے ہاتھ میں چابیوں کا مطلوبہ گچھا دبا ہوا تھا۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دبے پاؤں بیڈ سے نیچے اتری اور سیف کی طرف بڑھی۔

کانپتے ہاتھوں سے کی ہول میں چابی لگائی۔ ہلکی سی کلک کی آواز سے لاک کھل گیا۔ سیف کا دروازہ کھولا تو سامنے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نہایت ترتیب سے رکھی تھیں۔

میرا دل کانپ رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھ سے ایک گڈی اٹھائی، دروازہ بند کر کے لاک لگایا۔ واپس پلٹی تو ناصر سے ٹکرا گئی۔ جو نجانے کب سے میرے پیچھے کھڑا میری حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بری طرح بوکھلا گئی۔ نوٹ ہاتھ سے نیچے گر گئے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”وہ میں......“ میں ہکلائی

اس کا زناٹے دار تھپڑ چہرے پر پڑا تو لہرا کر اس کے قدموں میں گر گئی۔

”جس تھالی میں کھاتی ہے اسی میں چھید کرتی ہے۔“

اس نے بالوں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور پھر تھپڑوں اور گھونسوں سے میری تواضع کرنے لگا۔ میں چیخنے چلانے لگی میری آواز سن کر بچے بھی جاگ گئے اور رونے لگے مگر اس ظالم کو بالکل ترس نہ آیا۔

ساس نے شور سن کر دروازہ کھٹکھٹایا تو میری جان اس تشدد سے چھوٹی مگر تب تک اس نے اپنے بھاری بھر کم ہاتھوں سے مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ میرا چہرہ سوج کر بدوضع ہو چکا تھا۔ اوپری ہونٹ پھٹ چکا تھا اور اس سے خون رس رہا تھا۔

ناصر نے مجھے بازو سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے آیا۔

”چھوڑو مجھے۔“ میں چلائی

اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور مجھے اس پر زبردستی بٹھا کر رات کے بارہ بجے اماں کے ہاں چھوڑ گیا۔

رات گئے جب اماں نے دروازہ کھولا تو مجھے ناصر کے ہمراہ کھڑا دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔سوالیہ نگاہیں ناصر پر گاڑیں تو اس نے مجھے ان کی طرف دھکا دے کر حقارت سے جواب دیا کہ

''سنبھالیں اپنی ہونہار بیٹی کو مجھے اپنے گھر میں چورنی نہیں چاہیے۔''

وہ چلا گیا۔میں اور اماں لٹی پٹی حالت میں اندر آ گئیں۔

ابا بھی جاگ گئے تھے۔ساری صورت حال سن کر دونوں میاں بیوی دکھوں کی گہری کھائی میں جا گرے۔

میں نے وہ ساری رات روتے ہوئے گزار دی۔

اگلی صبح بھابی کو میری اچانک آمد کا پتا چلا تو اس نے ہمدردی کی آڑ میں طنز کے خوب تیر چلائے۔زندگی ایک بوجھ بن گئی۔سارا سارا دن روتی اور بچوں کو یاد کرتی رہتی۔

جب دل زیادہ پھٹنے لگتا تو بچپن کی عزیز سہیلی فوزیہ کے پاس جا بیٹھتی۔فوزیہ میرے دکھ میں برابر کی شریک تھی۔میری دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتی۔وہ میری ڈھارس بندھاتی۔اسے اس بات کا مکمل یقین تھا کہ ناصر کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ جلدی ہی مجھے آ کر لے جائے گا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب میں بوجھل دل لیے فوزیہ کے گھر گئی۔فوزیہ تو نظر نہ آئی البتہ ایک بہت خوب رو نوجوان بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

میں اسے دیکھ کر جھجک گئی۔

''فوزیہ کہاں ہے۔''میں نے اس سے پوچھا۔

وہ جو اشتیاق بھری نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا میرے سوال پر چونکا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''فوزیہ خالہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔''

''کیا ہوا فوزیہ کو؟''میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''فوزیہ کو کچھ نہیں ہوا خالہ کا بی پی شوٹ کر گیا۔''

''اوہ اچھا۔''میں نے سکون بھری گہری سانس خارج کی۔

''یعنی آپ کو صرف فوزیہ کی خیریت مطلوب ہے۔کسی اور سے کچھ لینا دینا نہیں۔''اس کے چہرے پر ابھی تک شرارت بھری مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''نہیں! خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔''میں نے جز بز ہو کر جواب دیا۔

عجیب باتونی انسان ہے۔بات سے بات نکالنے کا ہنر بخوبی جانتا ہے۔

''ارے آپ کھڑی کیوں ہیں؟ پلیز بیٹھ جائیں... سوری اس بات کا خیال ہی نہیں رہا کہ آپ کھڑی ہیں۔''اس نے کھڑے ہو کر سامنے والی نشست پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں شکریہ! میں چلتی ہوں اب۔''میں جانے کے لیے پلٹی تو اس کی آواز نے پاؤں جکڑ لیے۔

''سنئے! اپنا نام تو بتاتی جائیں۔فوزیہ آئے تو اسے کیا بتاؤں۔''

''بانو... میرا نام مہربانو ہے۔''میں نے رخ پھیرے بغیر جواب دیا۔

''اور میں بابر ہوں۔فوزیہ کا خالہ زاد۔آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر گھر سے باہر نکل آئی۔اس کے آخری جملے نے دل کی دھڑکن بے ترتیب کر ڈالی تھی۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد فوزیہ میرے پاس موجود تھی۔میں کمرے میں لیٹی اسی نوجوان کے متعلق سوچ رہی تھی جب اس نے میری آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ نچایا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں! بچوں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔''

''تم ہمارے گھر آئی تھی؟''

''ہاں! تمہارے کزن نے بتایا تمہیں؟''

''ہاں بالکل... اسی نے بتایا کہ تمہاری بہت خوبصرت سہیلی آئی تھی تم سے ملنے... مگر مجھے دیکھ کر بھاگ گئی۔''

فوزیہ کی بات سن کر دل کی دھڑکن پھر سے اتھل پتھل ہونے لگی۔

''میں اس کو دیکھ کر کیوں بھاگوں گی بھلا؟ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔''میں نے مضبوط لہجے میں جواب دی۔''کیا یہ تمہارا وہی کزن ہے جو تمہارا منگیتر بھی ہے؟''

''نہیں! یہ دوسری خالہ کا بیٹا ہے۔وہ بھی خالہ کا بیٹا ہے۔اس کا نام ریاض ہے جبکہ یہ بابر ہے۔اب سے یہ ہمارے ہاں ہی رہا کرے گا۔''

''کیوں تمہارے ہاں کیوں رہا کرے گا؟''اس کی بات مجھے حیران کر گئی۔

''ہمیشہ تھوڑی رہے گا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''فیکٹری والوں نے بھیجا ہے۔ان کی دوسری برانچ ہمارے شہر میں ہے۔ایک ماہ تک رہے گا۔خالہ لڑکی ڈھونڈ رہی ہے اپنے کماؤ پوت کے لیے۔''

''اچھا! میں تو شادی شدہ سمجھی تھی۔''میں نے فوزیہ کو چھیڑنے کی خاطر کہا۔

''لو جی! تمہیں کس اینگل سے وہ شادی شدہ لگا؟''

''دیکھنے میں تو خاصی پکی عمر کا دکھائی دے رہا تھا۔'' سچ تو یہ ہے کہ مجھے بابر کے متعلق بات کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

''ابھی تو اٹھائیس سال کا ہوا ہے۔''

''اٹھائیس سال کی عمر اتنی کم بھی نہیں ہوتی۔اکثر لوگ اس عمر تک ایک دو بچوں کے باپ بن چکے ہوتے ہیں۔''میں اس گفتگو سے پوری طرح محظوظ ہو رہی تھی۔

''بس اللہ نے چاہا تو جلد ہی بابر بھائی کے ہاتھ پیلے کردیں گی خالہ۔''فوزیہ نے قہقہہ لگایا تو میری ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی۔

''ویسے تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔بابر بھائی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ تمہاری سہیلی کی کہیں منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی نا؟۔میں اس کی بات سن کر خوب ہنسی اور جب بتایا کہ تمہاری شادی تو کب کی ہوچکی اور تم دو پیارے پیارے بچوں کی ماں ہو تو بڑا حیران ہوا۔بیچارے کا منہ لٹک گیا۔'' وہ پھر سے دیوانوں کی طرح کی طرح ہنسنے لگی۔

''پھر؟''میں نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''پھر کیا! بولا۔دیکھنے میں تمہاری سہیلی کنواری دکھائی دیتی ہے۔''

یہ بات سن کر دل جھوم اٹھا۔

تعریف ہر عورت کی کمزوری ہوتی ہے اور اگر یہ تعریف کسی وجیہہ اور شاندار مرد کے لبوں سے ادا ہو تو عورت خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی ہے۔میں بھی اس وقت خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔وقتی طور پر یہ بات بھی فراموش کر چکی تھی کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہوں، کسی اور کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہے میرے لیے۔

اگلے دن فوزیہ کو ملنے کے بہانے بابر کو ملنے پہنچ گئی۔آج میں نے نہا کر نیا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ وہ بھی یقیناً مجھ سے ملنا چاہتا ہوگا، مجھے دیکھنا چاہتا ہوگا۔پھر سوچنے لگی کہ اگر وہ گھر نہ ہوا تو؟''

میرا خدشہ بے بنیاد نکلا۔وہ آج بھی کل کی طرح کمرے میں تنہا لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''السلام علیکم۔''میں نے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام''۔

"فوزیہ کہاں ہے؟"میں نے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔

"جانتا ہوں آپ فوزیہ سے ہی ملنے آئی ہیں۔گھبرائیں مت۔وہ کچن میں گئی ہے۔ایک کپ چائے کی فرمائش کی تھی مابدولت نے۔آپ بیٹھیں نا۔"اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔وہ خود بھی اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

میں اس کے اس قدر اصرار پر دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"جب فوزیہ نے بتایا کہ آپ شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہیں تو سن کر بڑی حیرانی ہوئی تھی۔"

"کیوں!اس میں حیرانی کی کیا بات ہے بھلا؟"مجھے اپنے چہرے پر اس کی نگاہوں کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔

"یقین کریں!آپ ابھی بھی ایک ان چھوئی دوشیزہ معلوم ہوتی ہیں۔آپ کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور بھولپن پایا جاتا ہے۔"وہ جذب کے عالم میں بول رہا تھا اور میں اس کی دھیمی پرکشش مردانہ آواز میں سحر زدہ سی ہو گئی تھی۔

زندگی میں پہلی بار کوئی مرد مجھے سراہ رہا تھا،میرے چہرے کی تعریف کر رہا تھا،میرے حسن کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا اور میرے لیے یہ سب بہت نیا اور انوکھا تھا۔اس سے پہلے کہ میں اس ساحر کی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو کر سدھ بدھ کھو بیٹھتی اوپر سے فوزیہ ٹرے میں تین کپ اٹھاء اندر آ گئی۔

"میں نے تمھیں اندر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔اسی لئے تمہارا کپ بھی تیار کر لیا تھا۔"اس نے مسکراتے ہوئے ایک کپ میری طرف بڑھایا۔

"میرے کزن نے تمہیں بور تو نہیں کیا نا؟وہ شرارت آنکھوں میں بھرے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہیں تو۔"میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔"بابر صاحب تو بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں۔"

"شکر ہے مس بانو!آپ کو میری باتیں اچھی لگیں ورنہ میں تو دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔"وہ شوخ لہجے میں بولا۔

میری حوصلہ افزائی پا کر وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

میں ایک گھنٹہ مزید وہاں ٹھری۔چائے پیتے ہوئے ہم تینوں میں گپ شپ ہوتی رہی اور اس گپ شپ کے دوران میری ساری جھجک بھی دور ہو گئی۔اب میں بابر کے ساتھ کھل کر باتیں کر رہی تھی اور اس کی بذلہ سنجی پر دل کھول کر ہنس بھی رہی تھی۔

رات کو سونے کے لیے لیٹی تو بچوں کو یاد کرنے کی بجائے اس کی باتیں ذہن میں دہرا کر زیر لب مسکرا رہی تھی اور پھر یہ میرا روز کا معمول بن گیا۔میرے دن کا زیادہ تر حصہ فوزیہ کے گھر گزرنے لگا۔

بابر کی رات کی شفٹ ہوتی تھی۔صبح کے سات بجے گھر آتا آٹھ بجے تک ناشتہ کر کے سو جاتا اور دوپہر کے ایک دو بجے تک جاگ جاتا۔اس وقت تک میں بھی پہنچ جاتی پھر تینوں مل کر خوب گپیں لگاتے۔

ان کے گھر میں فوزیہ کی امی کے علاوہ ہوتا ہی کون تھا۔ ابا صبح کے گئے رات گئے اپنے کام سے لوٹتے۔ وہ ایک کپڑے کی دکان پر سیل مین تھے۔

فوزیہ سے بڑا ایک بھائی تھا جو پیسے کما کر امیر ہونے کی خواہش دل میں دبائے بیرون ملک سدھار گیا تھا جبکہ فوزیہ کی امی اکثر ناسازی طبیعت کا شکار رہتے ہوئے دوسرے کمرے میں نیم غنودگی کے عالم میں پڑی رہتی تھی۔

ایسے میں ہم تینوں خوب موج مستی کرتے۔ کبھی پکوڑے بنا کر چائے کا لطف دوبالا کیا جاتا تو کبھی گلی کی نکڑ سے بابر جلیبیاں یا دہی بڑے اٹھا لاتا۔

بچوں کی یاد اب بھی بہت ستاتی مگر اس میں پہلے جیسی شدت نہ رہی۔ فوزیہ ہم دونوں کو جان بوجھ کی تنہائی مہیا کرتی۔ کسی نہ کسی بہانے سے ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل جاتی۔ ان پندرہ سولہ دنوں میں یہ بات آشکار ہو چکی تھی کہ بابر ایک مہذب اور نفیس شخصیت کا مالک تھا۔ چاہے جتنا بھی ہنسی مذاق کرتا مگر اپنی حد سے کبھی تجاوز نہ کرتا۔ اس کا شمار ان مردوں میں ہوتا تھا جو عورتوں کی عزت کرنا جانتے ہیں۔

اتنے عرصہ میں وہ میرے حالات جان چکا تھا اور میں کیوں میکے میں بیٹھی تھی اس وجہ سے بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس مختصر عرصہ میں میں ذہنی طور پہ اس کے بہت قریب آ چکی تھی۔ ایک قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اس کی ذات سے۔

اس کی کیفیت بھی شاید مجھ سے مختلف نہ تھی مگر دونوں اپنی اپنی مجبوریوں کے حصار میں مقید تھے۔ دونوں بخوبی جانتے تھے کہ ہمارا ملاپ ناممکن ہے۔ دونوں نے چپ کا قفل زبانوں پر لگا رکھا تھا۔

جوں جوں بابر کا جانے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تنہائی میسر آتے ہی اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"بانو! میں دس دن بعد یہاں سے چلا جاؤں گا واپس اپنے شہر۔ تم میرے بغیر رہ لوگی؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اس کے صبیح چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی نے مجھے تڑپا دیا۔ اس کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

"ہمارا ساتھ یہیں تک تھا بابر! میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گی۔ تم دنیا کے پہلے مرد ہو جس نے میرے دل کی دنیا فتح کر لی۔"

"میرے ساتھ شادی کر لو بانو! دنیا کی ہر خوشی تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔"

میں نے چونک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اس وقت سچائی اور محبت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہ ممکن نہیں ہے بابر!" میرے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی در آئی۔ میں اس سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ آئندہ تم سے ملنے کے لیے بھی نہیں آؤں گی۔ جب تک جھجک تھی۔ ملنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ آج

جھجھک ختم ہوگئی۔مزید ملاقاتیں تباہی کی اور لے جائیں گی۔‘‘

یہ کہہ کرمیں وہاں سے نکل آئی اوراس کے بعد بھی جی کڑا رکھا۔اسے ملنے کے لیے نہ گئی۔حالانکہ فوزیہ نے کئی مرتبہ اس کا پیغام دیا کہ وہ ایک نظر تمہیں دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔جانے سے پہلے ایک بار تمہیں ملنا چاہتا ہے۔میں نے صاف انکار کر دیا۔

وہ چلا گیا۔میں اپنے کمرے میں بیٹھی روتی رہی مگر اسے الوداع کرنے کے لیے نہ گئی۔جانتی تھی کہ اسے رخصت کرتے وقت خود پر قابو نہ رکھ سکوں گی۔

وہ چلا گیا۔فوزیہ نے اس کا سیل نمبر لا کر مجھے دیا۔میں کاغذ کا وہ پرزہ ہاتھ میں پکڑے فوزیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

’’تم تو جانتی ہو کہ میرے پاس سیل فون نہیں ہے۔‘‘میں نے حیرت سے فوزیہ کی طرف دیکھا۔

’’میں نے بھی بابر سے یہی کہا تھا مگر اس نے کہا کہ یہ نمبر بانو کو دے آؤ۔زندگی کے کسی موڑ پر بھی میری ضرورت پڑے گی تو مجھے پکار لے گی۔‘‘

میں نے کاغذ کا وہ پرزہ سنبھال لیا۔

اس سے اگلے دن ایک بہت بڑا سرپرائز میرا منتظر تھا۔ناصر دونوں بچوں کو ساتھ لیے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔میں صحن میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔دونوں بیٹے مجھے دیکھ کر دیوانہ وار میری طرف لپکے۔میں بھی سبزی چھوڑ کر بچوں سے لپٹ گئی۔ان کے منہ،سر چوم کر پیاسی مامتا کو سیراب کرنے لگی۔

پاس کھڑا ناصر بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔میری نظر اس پر پڑی تو ایک تلخی سی منہ میں گھل گئی۔میں نے اماں کو آواز دی۔

’’کیسی ہو بانو؟‘‘وہ شیریں لہجے میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

’’اچھی ہوں۔‘‘میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

اتنے میں اماں کمرے سے باہر آ گئی۔وہ نواسوں سے بڑی گرم جوشی سے ملی اور داماد کو بھی بڑی عزت سے بٹھایا۔

ابا کے گھر آنے تک اماں نے کسی قسم کا موضوع نہ چھیڑا۔ناصر اور بچوں کی چائے اور بسکٹوں سے تواضع کی گئی۔ابا نماز پڑھ کے گھر آئے تو وہ بھی ناصر سے پرتپاک انداز میں ملے۔

مجھے اماں اور ابا کے حسنِ سلوک پر سخت غصہ آ رہا تھا۔جس انسان نے ان کی پھول جیسی نرم و نازک اور خوبصورت بیٹی کو اتنی بیدردی سے جانوروں کی طرح پیٹا تھا،اس کے سامنے دونوں بچھے جا رہے تھے۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس وحشی درندے کے ہمراہ کبھی نہیں جاؤں گی۔اماں ابا دونوں اس کے سامنے بیٹھے تو اس نے حرفِ مدعا بیان کیا۔میں بھی بچوں کے ساتھ وہاں پاس ہی بیٹھی تھی۔

''چاچاجی! میں بانو کو لینے آیا ہوں۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں۔'' وہ ابا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''بیٹا! اس کا فیصلہ تو بانو ہی کر سکتی ہے۔ اگر وہ جانا چاہتی ہے تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔'' ابا نے گیند میری کورٹ میں پھینک کر خود کو بری الزمہ کرلیا۔

''چلو بانو! گھر چلیں۔'' اس نے امید بھری نظریں مجھ پر جمائیں۔

''کون سا گھر، کیسا گھر؟ میرا کوئی گھر نہیں۔'' میں پھٹ پڑی۔ ''جہاں میں اور میرے بچے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترسیں، جہاں اپنی جائز خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرنے پڑیں میں اسے گھر نہیں مانتی۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بچے بھی مجھے دیکھ کر رونے لگے۔

ناصر بہت شرمسار دکھائی دے رہا تھا اس وقت۔ اماں اور ابا بھی بہت رنجیدہ ہو گئے۔

''ناصر بیٹا! سب سے اچھا انسان وہ ہے جو اپنی فیملی کے لیے اچھا ہے۔ اگر تم سے تمہارے گھر والے خوش نہیں تو تم دنیا کے ناکام ترین انسان ہو۔'' ابا نے بڑے آسان سے الفاظ میں بڑی اہم بات سمجھا دی۔

''جی بزرگو! مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہو گیا ہے۔ آئندہ کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

اس نے پھر سے ملتجیانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔

''امی! اٹھیں گھر چلیں۔'' شیراز نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

میں بے چینی سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔

''اٹھو بانو گھر چلیں۔ اپنے گھر چلیں۔'' ناصر لجاجت سے بولا اور میں جس نے گھر نہ جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اولاد کی محبت کے سامنے لمحوں میں ڈھے سی گئی اور بچوں کی انگلی تھامے اپنے گھر واپس آ گئی۔ وہ گھر جہاں سے آدھی رات کو مار مار کے نکالی گئی تھی۔

☆......☆......☆

اور پھر واقعی سیٹھ ناصر کا رویہ حیرت انگیز حد تک بدل گیا۔ اب شام کو گھر آتے وقت اس کے ہاتھ میں جو پھل کا شاپر ہوتا وہ سیدھا لا کر میرے ہاتھ میں تھماتا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کرتا کہ سب سے پہلے کچھ پھل اماں کو دے کر آؤں۔

میں بھی اس کی ہدایات پر سختی سے عمل درآمد کرتے ہوئے سب سے پہلے پلیٹ میں پھل ڈال کر ساس کو دے کر آتی مگر ساس اپنی حکومت کے چھن جانے کا ذمہ دار مجھے گردانتے ہوئے مجھ سے کھنچی کھنچی سی رہتی۔

اب ناصر گھر کا خرچ بھی میرے ہاتھ پر رکھتا اور ہر ویک اینڈ پر مجھے اور بچوں کو بائیک پر بٹھا کر باہر آؤٹنگ کے لیے لے جاتا۔ گھومنے پھرنے کے علاوہ کھانا بھی باہر کھایا جاتا۔

میں ناصر کی اس کایا پلٹ سے بہت حیران تھی اور خوش بھی۔ یہ سب ایک خواب کی مانند لگتا تھا۔ بچے بھی اب بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔

ہاں ساس صاحبہ اکثر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہتی تھی۔ وہ ناصر کو بھی اکثر یہی نصیحت کرتی کہ جس حساب سے عیاشی کر رہے ہو۔ جلدی ہی کنگال ہو جاؤ گے۔ جس عورت کو خوش کرنے کی خاطر پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہو۔ یہ خوش ہونے والی نہیں ہے۔

میں اس کی باتیں سن کر دل مسوس کر رہ جاتی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ناصر کے اس قدر بدلنے اور میرا خیال رکھنے کے باوجود بھی میرے دل سے بابر کی یادیں نہ نکل سکیں۔

رات کو ناصر کے پہلو میں سوتی مگر دل بابر کی سہانی یادوں سے آباد ہونے لگتا۔ ناصر چھوتا تو آنکھیں بند کر کے تصور میں بابر کو بلا لیتی۔

اسی خوشگوار ماحول میں دو ماہ گزر گئے اور ان دو ماہ میں ایک بھی دن ایسا نہ گزرا تھا جب مجھے بابر کی یاد نہ آئی ہو۔ اس کی محبت میرے دل میں ایک پھانس کی مانند کھب چکی تھی۔

ایک دن رات کے وقت ناصر کا خوشگوار موڈ دیکھتے ہوئے میں نے موبائل فون کی فرمائش کر دی۔

میری فرمائش سن کر وہ حیران ہوا۔

”کیا کرو گی موبائل فون کا؟“

”اماں سے دل اداس ہو جاتا ہے، اس سے فون پہ بات کیا کروں گی۔“ میں نے بات بنائی۔

”ہمم!“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”کیا خالہ کے پاس موبائل فون ہے؟“

”اماں کے پاس تو نہیں ہے مگر بھابی کے پاس ہے نا۔ وہ اماں سے میری بات کروا دیا کرے گی۔“ میں نے ایک ادا سے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

”او کے! کل ہی اپنی پیاری بیگم کی فرمائش پوری کر دیں گے۔“

اسے مسکراتا دیکھ کر میں بھی مسکرانے لگی۔

☆......☆......☆

پھر اگلے دن ہی اس نے مجھے سیل فون لا دیا۔ اس وقت ابھی ٹچ سکرین والے سیل فون عام نہیں ہوئے تھے اور بہت مہنگے بھی تھے۔ یہ ایک چھوٹے سائز کا کیز والا سستا سا موبائل تھا۔ موبائل پا کر ایسا لگا جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔ اس میں سم بھی ناصر کے نام کی تھی۔

دوسرے دن بچے اسکول اور ناصر اپنی دکان پر چلا گیا تو میں نے اپنے کمرے میں جا کر الماری کے دراز سے بابر کا دیا ہوا کاغذ کا پرزہ نکالا اور لرزتے ہاتھوں سے اس کا نمبر ملانے لگی۔ دل کانپ رہا تھا اور گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔

آج ایک بار پھر میں چوری کا ارتکاب کرنے جا رہی تھی۔ پہلی چوری میں تو شوہر کی دولت ہتھیانے کی کوشش کی تھی مگر آج اس کی عزت کی دیوار میں نقب لگانے جا رہی تھی۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ میری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بابر نے اپنا نمبر بدل لیا ہو۔ یہ نمبر اب اس کے زیر استعمال نہ ہو۔

میں نے کال ڈسکنیکٹ کرنے کے لیے انگلی اٹھائی ہی تھی کہ دوسری طرف سے مردانہ آواز میں ''ہیلو'' کہا گیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بابر کی آواز میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ ہیلو ہیلو پکار رہا تھا اور میں فون کان سے لگائے اس کی دلکش آواز میں کھوئی ہوئی تھی۔ دل کہتا تھا کہ وہ گھنٹوں ہیلو ہیلو کہتا رہے اور میں چپ چاپ سنتی رہوں۔

''دیکھیے! آپ جو کوئی بھی ہیں۔ میری ایک بات کا یقین کر لیں۔ میں اتنا ذہین نہیں ہوں کہ خاموشی کی زبان سمجھ سکوں۔ اپنی بات کو میرے کانوں تک پہنچانے کے لیے آپ کو اپنی زبان کو بھی زحمت دینی پڑے گی۔'' بابر کی بات سن کر ساری گھبراہٹ اڑن چھو ہو گئی اور ہونٹ مسکرانے لگے۔

''السلام علیکم! کیسے ہو؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

میری آواز سن کر چند لمحوں کے لیے دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

''کون؟ بانو؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں! بانو بات کر رہی ہوں۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''کیسے ترس آ گیا آج اس دیوانے پر۔ اب تو آنکھیں بھی پتھرانے لگی تھیں تمہاری راہ دیکھتے ہوئے اور کان... کان کب سے ترس رہے تھے یہ مدھر آواز سننے کے لیے۔'' اس کی آواز میں چند لمحے پہلی والی شوخی غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ اداسی در آئی تھی۔

''اچھا تم سناؤ! شادی ہو گئی کیا۔'' میں جو اس کی بات سن کر دل گرفتہ سی ہو گئی تھی، بات کو بدلنے کی خاطر بولی۔

میری بات سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

''اماں تو لٹھ لے کر پیچھے پڑی ہیں مگر میرا ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''مگر کیوں؟ تم شادی سے انکاری کیوں ہو۔'' میں نے اپنے لہجے میں سنجیدگی بھرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم نہیں جانتی؟''

''نہیں۔'' میں نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

''ظالم انسان!'' وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔

اس کی باتوں سے دل کی دنیا زیروزبر ہونے لگی تھی۔

''اچھا! میں فون رکھ رہی ہوں۔''میں اس موضوع سے فرار چاہتی تھی۔

''مگر کیوں بانو؟''وہ لجاجت سے بولا۔

''بس... تمہارا حال پوچھنے کو دل چاہ رہا تھا، پوچھ لیا۔''

''آئندہ بھی فون کیا کروگی نا؟''وہ منت ریز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''شاید نہیں۔''مجھے اپنی آواز کھوکھلی سی محسوس ہوئی۔

''پلیز بانو! بس... کبھی کبھار... میں مزید کوئی فرمائش نہیں کیا کروں گا۔''

''اوکے! بس کبھی کبھار... زیادہ کی امید مت لگانا۔''میں نے احسان جتلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! مجھے منظور ہے... تمہاری آواز سن کر دل کو بہلا لیا کروں گا۔''اس کی آواز سے خوشی چھلک رہی تھی۔ میں نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ٹھیک اسی وقت دل اس سے بات کرنے کے لیے مچلنے لگا۔ کچھ دیر تک دل کو مختلف تاویلیں دے دے کر سمجھاتی رہی مگر دل نے کسی ایک تاویل کو بھی ماننے سے انکار کر دیا اور اگلے ہی لمحے میں فون پر اس سے بات کر رہی تھی۔

میری آواز سن کر وہ کھل اٹھا تھا۔

''مجھے یقین تھا تمہاری کال ضرور آئے گی۔ سچ پوچھو تو تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔''

''بس آج آخری بار بات کروں گی آج کے بعد فون پہ رابطہ نہیں کروں گی۔''میں کمزور سی آواز میں اس کی بات کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیوں خود کو اور مجھے دونوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہو بانو۔''وہ ایک جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔''میں اچھی طرح جانتا ہوں... تم میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''بالکل جھوٹ! یہ تین ماہ تمہارے بغیر گزارے ہیں۔''

''ہونہہ! بغیر گزارے ہیں۔ یوں کہو کہ رابطہ کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لیے تڑپ کر مجبوری کے تحت وقت کو ایک سزا کے طور پر کاٹا ہے۔''

اس کی بات نے مجھے لاجواب کر دیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کال کاٹ دی اور ہم دونوں کے درمیان تجدید تعلق پھر سے استوار ہو گیا۔ اس دوران ایک نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ بابر نے مجھے ٹیکسٹ میسج کرنے سکھا دیئے۔ اس میں دو فائدے

تھے۔نمبر، ایک اپنی سہولت سے جب دل چاہے جواب دے دو۔

نمبر دو، سارا سارا دن بات کرنے سے بھی کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ اس خاموش گفتگو سے دل کی بات بھی محبوب تک پہنچ جاتی تھی اور کسی دوسرے کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔

پہلے ساس کے ڈر سے کمرے میں چھپ کر دھیمی آواز میں بات کرتی تھی۔پھر بھی اس کے آنے کا دھڑ کا لگا رہتا تھا۔ٹیکسٹ میسجز نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔اب میں گھنٹوں بابر سے ٹیکسٹ کے ذریعے بات کرتی۔زندگی ایکدم سے حسین ترین لگنے لگی۔

میری ساس اکثر اپنی عینک کے دبیز عدسوں سے مجھے فون پر مصروف دیکھتی تو پوچھتی۔

''بہو! یہ سارا سارا دن موبائل پر کیا کرتی رہتی ہو؟''

''کچھ نہیں خالہ! گیم کھیلتی رہتی ہوں۔''میں نے جان چھڑانے کی خاطر کہہ دیا۔

''مگر تم کوئی بچی تھوڑی ہو جو یوں گیموں میں وقت برباد کرتی رہتی ہو۔''اس نے سخت لہجے میں بات کی تو میں ناگواری چہرے پر سجائے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسی شام ساس صاحبہ نے بیٹے کے سامنے بات چھیڑ دی کہ بہو سارا دن موبائل پر گیم کھیلتی ہے۔گھر کے کاموں کی طرف توجہ بالکل نہیں دیتی۔کبھی دودھ چولہے پر ابل جاتا ہے تو کبھی ہانڈی جل جاتی ہے۔

اماں کی بات سن کر ناصر چونک گیا اور میری طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ہر وقت تو گیمز نہیں کھیلتی بس کبھی کبھار جب فارغ ہوتی ہوں... تب۔''میں نے صفائی پیش کی۔اس وقت مجھے اپنی ساس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

''ہر چیز کا استعمال ایک مناسب حد تک فائدہ مند رہتا ہے۔زیادہ استعمال نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔''ناصر نے نصیحت آمیز لیکچر دیا تو میں متفکر ہو گئی۔

''امید ہے تم میری بات کو سمجھ گئی ہو گی۔''اس نے بطور خاص میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے دن بابر سے فون پہ بات کی تو اس کے سامنے بھی اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

''میرا خیال ہے ہمیں اب یہ رابطہ ختم کر دینا چاہیے کیونکہ میری ساس کو مجھ پر شک ہونے لگا ہے اور اس نے میرے شوہر کے کان بھی بھرنے شروع کر دیئے ہیں۔''

''تم رہ لو گی مجھ سے بات کیے بنا؟''اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''میں نے جواب دیا۔

''جھوٹ بولتی ہو! سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے جواب دیا تو میں تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''مگر اس پریم کہانی کا انجام کیا ہوگا بابر؟''

''محبت کرنے والے انجام کی پرواہ نہیں کرتے۔''وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''مگر مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے بابر۔''میری آواز مرتعش تھی۔

''پیار کیا تو ڈرنا کیا... جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔''وہ گنگنانے لگا تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''یہ ہوئی نا بات۔''وہ بھی خوش ہو گیا۔''بس یونہی ہنستی مسکراتی رہا کرو۔میری جان۔''

''اچھا یہ بتاؤ! رات کو پتی دیو کس وقت سو جاتا ہے؟''

''ہمم! گیارہ بجے تک۔مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میرا انتظار کرنا۔رات کو آؤں گا۔''اس نے سرگوشی کی تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر پھیلتی چلی گئی۔

''کیا مطلب؟ تم رات کو کیسے آؤ گے۔؟''میں ہکلائی تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''اوہو! میری بھولی بانو سچ میں تھوڑی آؤں گا۔چیٹ پر آیا کروں گا۔مزے دار سی چیٹنگ کیا کریں گے۔رات کو چیٹ کرنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔''اس کی باتیں سن کر ایک نشہ سا حواس پر طاری ہونے لگا تھا۔

''اگر ناصر جاگ گیا تو؟''

''نہیں جاگے گا۔ہم نے کون سا کال پر بات کرنی ہے۔ٹیکسٹ مسیج کریں گے۔فون سائیلنٹ پر لگا لینا۔کسی قسم کی کوئی آواز پیدا نہیں ہوگی۔''

''اوکے۔''میں نے حامی بھر لی کیونکہ میں خود بھی اس انوکھی دنیا کی سیر کرنا چاہتی تھی۔جہاں سنسنی تھی، لذت تھی، بے خودی تھی اور پھر اس تجربے نے مجھے ایک انوکھے جہان کی سیر کروائی۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔رات گیارہ سے بارہ بجے تک بابر سے چیٹنگ کرنے لگی۔ہماری باتیں تہذیب اور حیا کا دامن چھڑا کر کب کی فحش گوئی کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔

رات گئے جب اپنے بستر پر لیٹ کر بابر سے ہمکلام ہوتی تو اسے اپنی دھڑکنوں سے بھی قریب محسوس کرتی۔بعض اوقات ایسی باتوں سے جسم میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی۔دل کی دھڑکن بہت تیز ہو جاتی۔سانسیں بے اعتدال ہو جاتیں اور کبھی کبھار ہیجان اس

قدر بڑھ جاتا کہ جسم آگ کی بھٹی کی مانند دہکنے لگتا اور میں بیڈ پر لیٹی جل بن مچھلی کی طرح تڑپنے لگتی۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ اب میں رات کو ناصر کے سونے کا بے چینی سے انتظار کرتی۔ جونہی اس کی آنکھ لگتی، خراٹوں کی آواز سنتے ہی میں بابر کے ہمراہ اس جہان پر کیف کی سیر کرنے لگتی۔ جہاں صرف مدہوشی آمیز لذت تھی۔

مگر کب تک؟

ایک رات حسب معمول چیٹنگ میں مصروف تھی۔ جب اچانک ناصر نے میرے ہاتھ سے فون اچک لیا۔ میں چیٹنگ میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کے جاگنے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔

جب اس نے فون چھینا تو دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

میں نے اضطراری حالت میں موبائل اس سے واپس چھننا چاہا تو اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر جڑ دیا۔

''ہم! تو یہ گیم ہے جو تم سارا سارا دن موبائل پر کھیلتی رہتی ہو۔ اور اب نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ رات کو میرے پہلو میں سوتے ہوئے یہ گیم کھیلی جا رہی ہے۔ اور مجھے کچھ خبر ہی نہ ہو سکی۔ اماں بیچاری ٹھیک ہی کڑھتی رہتی تھی۔ تم واقعی اس قابل نہ تھی کہ تمہیں اس قدر مراعات مہیا کی جائیں یا تمہارے لاڈ اور نخرے اٹھائے جائیں۔''

اس کے بعد وہ میسج پڑھنے لگا۔ میرے پورے بدن سے جیسے کسی نے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا تھا۔ جسم کانپ رہا تھا۔ وہ میسج پڑھتا جا رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ سانولا چہرہ تمتما رہا تھا۔ میسج پڑھ کے اس نے میری طرف دیکھا تو مارے خوف کے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ وہ مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔

مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا۔ میرا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ سر پھٹ گیا۔ میری دردناک چیخوں سے بچے جاگ کر رونے لگے۔ وہ باپ سے گتھم گتھا ہو گئے۔

ناصر نے بچوں کو دھکا دے کر پیچھے پھینکا۔ لگتا تھا جیسے آج میری جان لیے بنا نہیں چھوڑے گا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبا رہا تھا اور میں اس کے بھاری جسم کے بوجھ تلے دبی کراہ رہی تھی۔

شیراز فٹافٹ دادی کو جگا کر ساتھ لایا۔ اس نے اس سانڈ کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور مجھے اس کے نیچے سے نکالا۔ میں گردن کو سہلانے لگی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

''اماں! تمہارا شک بالکل صحیح نکلا۔ یہ حرافہ فون پر اپنے کسی یار سے بات کیا کرتی تھی اور میں تمہاری باتوں کو جھٹلا کر اس کمینی پر اندھا اعتماد کرتا رہا۔'' وہ شعلہ بار نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ماں کو صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

''ارے بیٹا! میرا ماتھا تو اسی دن ٹھنکا تھا۔ جس دن تم نے یہ شیطانی کھلونا لا کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ وہ ہمارے محلے کی

بشیراں کی بیٹی بھی بھاگ گئی تھی ایک لڑکے کے ساتھ۔اور وجہ یہی نگوڑا موبائل ہی بنا تھا۔میں تو کہتی ہوں،عورت ذات کے پاس موبائل فون بالکل نہیں ہونا چاہیے۔''اس نے ایک طنزیہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔

''یہ باتیں چھوڑو اماں!اب یہ بتاؤ اس کا کیا کرنا ہے؟''ناصر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے۔چٹیا سے پکڑو اور طلاق دے کر گھر سے باہر نکالو اس چنڈال کو۔''وہ سفاکی سے بولی۔

میرا پورا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔سر والے زخم سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔دونوں بچے سہمے ہوئے میرے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ان کو دادی اور باپ کی باہمی مشاورت کے نتیجے میں ہونے والی گفتگو کی قطعی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔دونوں ہونق چہرے لیے دادی اور باپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''کمال کرتی ہو اماں!میں اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دوں اور یہ اپنے یار کے ساتھ نکاح کر کے ہنسی خوشی کی زندگی گزارنے لگے۔ایسا بالکل نہیں ہونے دوں گا۔''وہ اٹل لہجے میں بولا۔

''تو کیا کرے گا اس کا۔اس نے نہیں رہنا اب تیرے پاس۔بھاگ جائے گی۔اسی کے پاس جس سے فون پر بات کرتی ہے۔''

''کیسے بھاگے گی؟فون تو میں نے چھین لیا۔جب اس سے رابطہ ہی نہیں ہوگا تو بھاگے گی کیسے اور پھر میں اسے بھاگنے لائق چھوڑوں گا تو بھاگے گی نا۔''اس کے موٹے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''نا کیا کرے گا تو؟''اماں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔''میری مان تو اس کے باپ اور بھائی کو بلا اور ان کے حوالے کر دے اس حرافہ کو۔ہم سے اس کی نگرانی نہ ہو پائے گی۔''

ساس کی یہ بات سن کر میں سسکنے لگی۔دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''پلیز!میرے ابا اور بھائی کو مت بلائیے گا۔میرے بابا پہلے ہی دل کے مریض ہیں۔وہ یہ خبر سن کر زندہ نہ رہ پائے گا۔میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔جیسا آپ دونوں کہیں گے ویسا ہی کروں گی۔''میں ساس کے قدموں پر پڑی سسک رہی تھی۔

ناصر نے مجھے پاؤں کی ٹھوکر سے دور ہٹایا۔

''سوچ لو!جیسی زندگی میں دوں گا۔وہ تمہیں منظور نہیں ہوگی۔''

''مجھے تمہاری دی ہوئی ہر قسم کی زندگی منظور ہے۔بس میرے بوڑھے ماں باپ پر رحم کر دو۔وہ جیتے جی مر جائیں گے۔''میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

''ٹھیک ہے۔اماں کل سے گھر کا پورا انتظام تم چلاؤ گی۔ملازمہ آئے تو اسے چھٹی کروا دینا۔اس کے جو بھی واجبات رہتے ہیں وہ ادا کر دینا۔کل سے سارے گھر کا کام ہماری یہ خوبصورت اور آوارہ مزاج بیگم کرے گی۔کیوں بیگم؟''اس نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

میں نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں ہر کام کروں گی مگر مجھے میرے بچوں سے کبھی دور مت کرنا۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''چلو یہ ڈرامہ بازی بند کرو اور بچوں کو لے جاؤ۔ انہیں ان کے کمرے میں لے جا کر سلا دو۔ اور ہاں آج خود بھی انہی کے پاس سو جانا۔ یہاں سوئی تو ہو سکتا ہے مجھے خود پر کنٹرول نہ رہے۔ اور تم میرے ہاتھوں ضائع ہو جاؤ۔''

میں بچوں کے ہمراہ ان کے کمرے میں آ گئی۔ شیراز نے پایوڈین سے میرے ماتھے کا زخم صاف کیا اور ایک کپڑے سے پٹی باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل بھر آیا اور اسے ساتھ لپٹا کر پھر سے رونے لگی۔ پٹی سر پر باندھی اور دو گولیاں درد کش کی کھا کر لیٹ گئی۔

بچے تو جلد ہی سو گئے مگر میں ساری رات روتی رہی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ درد اتنا تھا کہ برداشت سے باہر تھا۔ جسمانی درد سے کہیں زیادہ تکلیف روح جھیل رہی تھی۔

☆......☆......☆

اب میری زندگی کا انتہائی ذلالت بھرا دور شروع ہو گیا۔ سارا سارا دن کولھو کا بیل بنی کاموں میں جتی رہتی۔ پھر کھانا تیار کر کے سب کو کھلاتی اور جب تھکن سے چور بدن آرام کا تقاضا کر رہا ہوتا تو ساس ٹانگیں دبانے کا حکم دے دیتی۔

اللہ اللہ کر کے اس سے جان چھوٹتی تو شوہر طلب کر لیتا۔ وہ ٹانگیں دبوانے کے ساتھ ساتھ اپنے منہ سے مغلظات کا چھڑکاؤ بھی کرتا رہتا۔

''آخر تمہاری کون سی ضرورت میں پوری نہیں کرتا تھا کہ تمہیں گھر سے باہر منہ مارنے کی ضرورت پڑ گئی؟''

میں خاموش رہتی تو آنکھیں کھول کر دھاڑتا۔

''تم نے سنا نہیں! کیا پوچھ رہا ہوں تم سے؟ کیا ہے اس کے پاس جو میرے پاس نہیں ہے۔ کیا میں نامرد ہوں؟''

میں جواب دینے کی بجائے آنسو بہانا شروع کر دیتی تو وہ ٹانگ کھینچ کر دے مارتا۔ میں لڑھک کر بیڈ سے نیچے جا گرتی تو حکم دیتا کہ کمرے کا دروازہ اور لائٹ دونوں بند کر کے میرے پاس آؤ۔ تمہیں اپنی مردانگی کا ثبوت دینا چاہتا ہوں۔

میں کراہتی ہوئی زمین سے اٹھتی اور اس کا ہر حکم بجا لاتی۔ صرف اس امید پر کہ کبھی تو اس کو مجھ پر ترس آئے گا اور میری سزا معاف کر دے گا مگر یہ آس، آس ہی رہی کبھی یقین میں نہ بدلی۔

ہر روز سورج طلوع ہوتا تو میں ایک امید کا چراغ دل میں جلائے مشقت میں جت جاتی۔ رات ہوتے ہوتے امید کا چراغ بھی میرے ساتھ ہی بجھنے لگتا۔

ایک رات ناصر کی ٹانگیں دبا رہی تھی جب اس نے بات شروع کر دی۔ وہ مجھے سلگانے کے لیے ہر روز ایسی ہی کوئی بات شروع کر دیتا تھا جسے سن کر میں اذیت اور تذلیل محسوس کروں۔

''یار کی یاد تو بہت آتی ہوگی؟ ہے نا؟''

میں چپ چاپ ٹانگیں دباتی رہی تو پھر بولا۔''اس نے اگلی صبح فون کیا تھا۔میں نے اس کی وہ مٹی پلید کی کہ اس کے چودہ طبق تو یقیناً روشن ہوگئے ہوں گے۔اگر کسی انسان کا بچہ ہوا تو آئندہ کبھی زندگی میں کسی کی بیوی پر بری نظر نہیں ڈالے گا۔ویسے ہے کون؟''وہ مجھ سے بابر کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

''میں نہیں جانتی۔''میں نے مختصر جواب دیا تو وہ آگ بگولہ ہوگیا۔

''بغیر جان پہچان کے ہی اس سے منہ کالا کرتی رہی ہو۔''وہ جتنا زہر زبان سے میرے کانوں میں انڈیل سکتا تھا انڈیل رہا تھا۔

''میں اس سے کبھی نہیں ملی تو پھر منہ کیسے کالا ہوگیا۔''میں نے ہمت کر کے جواب دے دیا۔وہ سرعت سے اٹھا،میرے بال ہاتھ میں جکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

''جو باتیں تم اس سے فون پر کرتی رہی ہو۔وہ سب میسج میں پڑھ چکا ہوں۔زنا کرتی رہی ہو اس کے ساتھ۔زنا کرنے کے لیے جسموں کا ایک دوسرے سے قریب ہونا ضروری نہیں۔باتوں سے بھی زنا ہوسکتا ہے۔''وہ چہرہ میرے چہرے کے پاس لا کر پھنکار رہا تھا اور میں درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔

''میرے بال چھوڑ دو۔مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے۔''میں سسکی تو اس نے ایک اور جھٹکا دے کر بال چھوڑ دیئے۔

اس ذلت اور اذیت بھری زندگی کا ایک ہفتہ ہی گذرا تھا کہ فوزیہ مجھ سے ملنے آئی۔فوزیہ کو دیکھ کر میری ساس کا موڈ خراب ہوگیا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔البتہ ہمارے پاس جم کر بیٹھی رہی کیونکہ ناصر کی ہدایت کے پیش نظر وہ میری کڑی نگرانی کرتی تھی۔ایک منٹ کے لیے بھی گھر کے بیرونی دروازے تک جانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

کوڑا کرکٹ بھی گھر سے باہر پھینکنے خود جاتی تھی اور آج فوزیہ کی آمد بھی اسے بری طرح کھل رہی تھی۔

''اور سناؤ فوزیہ!میری اماں اور ابا کیسے ہیں؟''میرے اداس لہجے کو وہ بھی فوراً بھانپ گئی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟برسوں کی مریضہ دکھائی دے رہی ہو۔تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں!میں ٹھیک ہوں۔''میں نے کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی اپنی ساس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔''اس نے مدھم آواز میں سرگوشی کی تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اپنے چہرے کے تاثرات نارمل رکھو... میں جانتی ہوں تمہاری ساس تمہاری نگرانی کررہی ہے۔''

میں نے ایک نظر ساس پر ڈالی اور پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''تم نے میرے ابا اور اماں کے متعلق تو کچھ بتایا ہی نہیں۔''یہ بات میں نے قدرے اونچی آواز میں کی۔

''چاچا اور چاچی دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔تم ان کی فکر مت کرو۔''اس نے بھی آواز بلند رکھ کے ہی جواب دیا۔

''فوزیہ تم رکو! میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' میں اٹھی تو وہ بھی میرے ساتھ ہی کچن میں چلی آئی۔

کچن میں آتے ہی اس نے تیزی سے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک ڈبہ بند موبائل فون نکالا اور اسے فٹ سے کچن کے ایک کیبنٹ میں چھپا دیا۔ میں اس کی پھرتی دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''یہ کیا تھا؟... فوزیہ۔'' میں نے جانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک نیا موبائل سیٹ تھا سوال کر دیا۔

''یہ موبائل فون ہے۔ بابر بھائی نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ اس میں سم اور بیلنس دونوں موجود ہیں۔ موقع دیکھ کر یہاں سے اٹھا لینا۔''

ابھی اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ اوپر سے ناصر کی ماں آ گئی۔

میں چائے والے برتن میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھانے لگی تو وہ بولی۔

''بہو! ایک کپ میرے لیے بھی بنا دینا۔''

''جی خالہ! ابھی بنائے دیتی ہوں۔'' اپنی آواز کی لرزش خود میں نے بھی محسوس کر لی۔

فوزیہ چائے پی کر تھوڑی دیر بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔ ساس صاحبہ دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں قیلولہ کی غرض سے چلی گئی۔ بچوں کے سکول سے آنے میں ابھی آدھا گھنٹہ پڑا تھا۔ میں کچن میں گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے کیبنٹ کا دروازہ کھولا اور سامنے پڑا وہ ننھا سا ڈبہ اٹھا لیا۔

اسے اپنے دوپٹے کے نیچے چھپا کر بیڈروم میں لے گئی۔ دروازہ اندر سے لاک کیا اور بابر کا نمبر ملانے لگی۔ جیسے ہی اس کی ''ہیلو'' کی آواز سنائی دی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں رونے لگی۔

''چپ ہو جاؤ میری جان! تمہاری خوبصورت آنکھوں سے نکلے ہوئے یہ آنسو سیدھے میرے دل پر گر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے کی گھمبیرتا نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ یعنی وہ بھی میری طرح جدائی کا عذاب سہہ رہا تھا۔

''ہمارا ساتھ یہیں تک تھا بابر... مجھے بھول جانا۔'' میں پھر سے سسکنے لگی۔

''یہ ناممکن ہے بانو! جیتے جی تو کبھی تمہیں بھول نہیں سکتا۔ ہاں مرنے کے بعد شاید بھول جاؤں۔'' وہ نہایت دلگرفتگی سے بات کر رہا تھا۔

''اچھا چھوڑو یہ باتیں! یہ بتاؤ تمہارے شوہر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے اب؟''

''کیا تم اندازہ نہیں لگا سکتے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''تمہیں کتنی بار روکا تھا کہ رات کو اس کی موجودگی میں بات کرنا انتہائی غیر مناسب ہے مگر تم نے میری ایک نہ مانی۔ تمہارا کیا بگڑا؟ جبکہ میری پوری زندگی برباد ہو گئی۔ جوتوں پر رکھ کے روٹی ملتی ہے دو وقت کی۔'' روتے روتے میری آواز رندھ گئی۔

''بانو... میں مانتا ہوں تمہارا مجرم ہوں میں۔ میری وجہ سے تمہیں یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں مگر میں تمہارے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا ہوں۔ چھوڑ کے آ جاؤ اس جہنم کو ہمیشہ کے لیے میرے پاس۔ کبھی کسی چیز کی تنگی نہیں آنے دوں گا۔ ہم اپنی ایک چھوٹی سی جنت بسائیں

گے بانو، جہاں ہم دونوں کے سوا تیسرا کوئی نہیں ہوگا۔''

''خدا کے لیے چپ ہو جاؤ... پہلے ہی میرا بہت نقصان کر چکے ہو۔ اب تمہاری باتوں میں کبھی نہیں آؤں گی۔'' میں زہرخند لہجے سے بولی۔

''ٹھیک ہے بانو! تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے مگر ایک بات یاد رکھنا اب تمام عمر نوکر بن کر بھی اپنے شوہر کی خدمت کروگی، اپنی کھال کی جوتیاں بنا کر بھی اس کے قدموں میں پہنا دوگی... تب بھی تمہیں تمہارا جائز مقام کبھی نہیں مل سکتا۔ اسی طرح تذلیل سہتے سہتے مرجاؤ گی مگر اپنی کھوئی ہوئی عزت کبھی بحال نہ کرسکوگی۔''

''مجھے اس مقام تک لانے والا کون ہے؟... تم ہو اور ہاں آئندہ کبھی مجھے فون مت کرنا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم یہ شیطانی کھلونا بھیجو گے اور میں اس سے بہل جاؤں گی۔'' بات کرتے کرتے میں ہانپنے لگی۔ سانس جیسے دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

''مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے بانو! تم نے مجھے بہت غلط سمجھا۔ خیر میں اب بھی یہی کہوں گا جب زندگی تم پر بہت تنگ کر دی جائے گی اور مارے گھٹن کے سانس لینا دوبھر ہو گیا تو مجھے پکار لینا... تمہارا یہ دیوانہ قیامت تک تمہاری راہ دیکھے گا۔ مجھے یقین ہے تم پلٹ کر میرے پاس ہی آؤ گی کیونکہ تمہیں سچا پیار صرف مجھ سے ہی مل سکتا ہے۔''

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی اور کال منقطع کر دی۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد میں نے دوبارہ بابر سے رابطہ نہ کیا۔ موبائل فون کو چھوٹے صندوق میں کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھپا دیا مگر اس کی کہی ہوئی باتیں ہر وقت دماغ میں گونجتی رہتیں۔ بابر کی ساری پیشین گوئیاں سچ ثابت ہو رہی تھیں۔

میں نے ناصر کا دل جیتنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر اس کے تحقیر آمیز رویے میں رتی برابر فرق نہ آیا۔ اس واقعہ کے بعد میں بچوں کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی سویا کرتی تھی کیونکہ مجھے ناصر سے اب خوف محسوس ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا ہتک آمیز سلوک شروع ہو جاتا۔ بات بے بات طنز کے تیر چلانا اور اکثر اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہاتھ اٹھانا اس کا شیوہ بن چکا تھا۔ میری ہمت اب میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی۔

رات کو حسب معمول اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ وہ آنکھیں موندے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں اس کو پرسکون دیکھ کر بات کرنے کے لیے پر تولنے لگی۔ ذہن میں الفاظ ترتیب دے کر منہ کھولا۔

''سنئے! میں آپ سے کچھ باتیں کہنا چاہتی ہوں۔''

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

ایک عرصہ کے بعد میں نے اس کے سامنے لب کشائی کی جرأت کی تھی ورنہ تو وہ حکم دیتا اور میں سر جھکائے بجا لاتی کیونکہ بے

وفائی کا ارتکاب کر کے میں اپنے ہر حق سے دستبردار ہو چکی تھی۔ چند لمحے وہ حیران کن نگاہوں سے میرا جائزہ لیتا رہا اور پھر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

''جی بیگم صاحبہ! ارشاد فرمائیں... میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' اس نے قہقہہ لگایا تو احساس ذلت سے کانوں کی لوئیں تپنے لگیں۔ مگر ہمت مجتمع کر کے بات شروع کی۔

''ناصر! میں مانتی ہوں مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی... مگر کیا مجھے معافی نہیں مل سکتی؟'' میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''غلطیاں آخر انسانوں سے ہی سرزد ہوتی ہیں خدا بھی تو اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے تو بندے بندوں کو کیوں معاف نہیں کر سکتے؟'' میری آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی۔

''ہمم۔'' اس نے پہلے تو لمبا سا ہنکارا بھرا پھر بولا۔

''تو ہماری پیاری بیگم کو آج اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہونے لگا اور وہ ہم سے معافی کی خواستگار ہے۔ ہے نا؟'' اس نے مجھ سے تائید چاہی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے رویے سے امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔

''دیکھو میری بہت ہی خوبصورت بیگم صاحبہ! میں بات کروں گا سیدھی اور کھری۔ تم جسے غلطی کہہ رہی ہو وہ غلطی نہیں گناہ ہے اور وہ بھی کبیرہ۔'' وہ سانس لینے کو رکا اور پھر سے شروع ہو گیا۔

''بیشک اللہ اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے کیونکہ اس کا دل بہت بڑا ہے مگر میرا ظرف اتنا بڑا نہیں ہے۔ سچ بتاؤں تو جب بھی تم پر نظر اٹھتی ہے تو بے حیائی والی ساری باتیں نگاہوں کے سامنے آ کر دھمال ڈالنے لگتی ہیں، مجھے چڑاتی ہیں، اکساتی ہیں کہ تو کیسا بے غیرت شوہر ہے۔ بیوی کو رنگے ہاتھوں ایک اجنبی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ کر بھی خاموش تماشائی بنا بیٹھا ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے پتھریلے چہرے پر سفاکی رقص کر رہی تھی۔

''اور ایک سچ اور بتاؤں تمہیں۔؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور میری ٹھوڑی کو چھو کر چہرہ تھوڑا اوپر اٹھایا۔

''یہ تو بہت اچھا کرتی ہے جو میرے کمرے میں میرے پاس نہیں سوتی۔ بچوں کی آغوش میں جا کر دبک جاتی ہے ورنہ کب کا تجھے قتل کر کے ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہو جاتا۔''

اس کی باتیں سن کر مارے خوف کے جھرجھری آ گئی۔ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مجھے کانپتا دیکھ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

''عورت ذات کا حوصلہ اتنا نہیں ہوتا تو پھر وہ کام اتنے بڑے بڑے کیسے کر گزرتی ہے۔ باعث حیرت ہے۔ چل جا لائٹ بند کر کے میرے پاس آ۔'' اس نے حکم جاری کیا تو میری گھگھی بندھ گئی۔

''آج نہیں۔'' میں گڑگڑائی۔

''کیوں؟ آج کیوں نہیں۔'' وہ دھاڑا۔

''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ مجھے ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں۔ چاہے تو چیک کر لے۔'' میں نے بازو اس کی طرف بڑھایا۔

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی کہ ڈر لگ رہا ہے مجھ سے۔'' وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

میں نظریں جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی اور پھر اس کو مجھ پر ترس آ گیا۔

''چل جا۔ اپنی پناہ گاہ میں جا کر آرام کر۔''

اس کی اجازت ملتے ہی میں نے وہاں سے جو دوڑ لگائی تو بچوں کے کمرے میں آ کر ہی دم لیا جواب میرا بھی کمرہ تھا۔

☆......☆......☆

پوری رات میں سو نہ سکی۔ ہر آہٹ پر یہ گمان گزرتا کہ ناصر آ گیا ہے میری جان لینے کے لیے۔ یہ ایک نیا عذاب تھا جو اس کم ظرف نے مجھ پر مسلط کر دیا اور یہ سزا ہر سزا پر حاوی تھی۔

ساری رات عجیب سے وسوسوں میں گھری رہی۔ کیا کروں کہاں جاؤں۔ اگر کسی دن ناصر نے سچ میں میری جان لے لی تو...

عورت کو قتل کرنا تو ویسے بھی بہت آسان ہے۔ غیرت کے کھاتے میں ڈال کر چند مہینوں میں قاتل رہا ہو جاتا ہے۔

تو کیا میں بھی...

نہیں نہیں۔ میں ایسی حرام موت نہیں مروں گی۔ تو کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔ یہ بات تو طے تھی کہ اس گھر میں میری جان کو خطرہ تھا۔ میری زندگی سیو نہیں تھی۔ ماں باپ کے گھر جاؤں تو انہیں کیا بتاؤں۔ اگر سچ بتایا تو وہاں بھی کوئی جائے پناہ نہیں ملنے والی۔ ہو سکتا ہے بھائی کی غیرت جوش مارے اور وہ بد چلن بہن کو گولی سے اڑا دے۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا۔ جان بچانے کا واحد راستہ ایک ہی بچا تھا۔ بابر کی پیشکش قبول کر لیتی مگر بچوں کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی۔ بے بسی کے احساس نے رونے پر مجبور کر دیا۔ پوری رات سوچتی رہی اور آنسوؤں سے تکیے کو بھگوتی رہی۔

صبح ہونے تک بالآخر ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئی۔ بندریا کے جب پاؤں جلتے ہیں تو وہ اپنے بچوں کے اوپر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی اپنی جان ہر چیز سے قیمتی تھی۔ اپنی اولاد سے بھی زیادہ۔ زندہ رہی تو اولاد تو مل ہی جائے گی اور اگر زندگی ہی نہ رہی تو اولاد کس کام کی۔ خود کو پر سکون اور مطمئن کرنے کے لیے لاکھوں تاویلیں دیتی رہی مگر پھر بھی دل میں ایک پھانس سی چبھ رہی تھی۔ اب مجھے کل کے دن کا انتظار تھا۔ دن چڑھتا اور میں مناسب موقع دیکھ کر بابر سے رابطہ کرتی۔

 

ناول ''تہی دامن'' ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 2

اگلے دن روزمرہ کے کام نپٹائے۔ بچے سکول چلے گئے۔ گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا تیار کرنے لگی۔ آج میں ہر کام بڑے مشینی انداز میں سرانجام دے رہی تھی۔ آخر ساس صاحبہ دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں پدھار گئیں اور میں بیرونی دروازہ اچھی طرح بند کر کے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ صندوق کھول کر کپڑے کھنگالنے لگی۔

فون ہاتھ میں آیا تو جان میں جان آئی مگر یہ کیا؟ فون ڈیڈ پڑا تھا۔ اس کی بیٹری چارج ہونے والی تھی۔ فوراً ڈبے سے چارجر نکالا۔ اسے پلگ میں لگا کر فون اس کے ساتھ کنیکٹ کر کے آن کیا۔ فون کے آن کرتے ہی بابر کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کر لی۔

''مجھے یقین تھا کہ تم مجھے فون ضرور کرو گی۔'' وہ وارفتگی سے بولا تو مجھے کچھ دن پہلے کی گئی تلخ کلامی پر ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ کتنا اچھا ہے بابر کچھ بھی کہہ لوں، برا نہیں مناتا۔

''تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

''کاش تمہیں اپنا دل چیر کے دکھا سکتا بانو! تم بتاؤ ایسا کیا کروں کہ تمہیں میری سچی محبت کا یقین آ جائے؟''

''شادی کرنا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''ہاں! اگر تم مان جاؤ اور میرا ساتھ دو تو ہم دونوں کی زندگی سنور جائے گی۔'' اس کے لہجے سے دبا دبا جوش جھلک رہا تھا۔

''مگر... میرے لئے بچوں کو چھوڑنا بہت مشکل ہے۔''

''دیکھو بانو! یہ مت سمجھنا کہ تمہارے بچے میرے لئے کوئی بوجھ ثابت ہوں گے مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ وہ صرف تمہارے بچے نہیں ہیں۔ وہ سیٹھ ناصر کی بھی اولاد ہیں اور کوئی بھی مرد اپنی اولاد سے دستبردار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بچوں کو حاصل کرنے کے لئے دنیا کے آخری کنارے تک جائے گا۔ اس لئے بچوں کا خیال دل سے نکال دو۔ جوان ہونے کے بعد تمہیں خود ہی آن ملیں گے۔''

اس کی باتیں سن کر میں چپ ہو گئی۔ جانتی تھی کہ اس کی ہر بات حقیقت پر مبنی ہے۔ ناصر کبھی اپنی اولاد سے دستبردار نہیں ہو گا۔

''تو کیا مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرے گا وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''کوشش تو کرے گا مگر سرسری سا۔ بلکہ دل میں شاید اللہ کا شکر ادا کرے کہ بلا سے جان چھوٹی کیونکہ اسے اب تم سے کوئی لگاؤ باقی نہیں رہا بلکہ تم اس کے لئے ایک بوجھ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔''

''مگر... یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہوگا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے اس قدر انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے۔ یہ فیصلہ کہیں ساری زندگی کا پچھتاوا نہ بن جائے بابر'' دل میں پکا ارادہ کرنے کے باوجود میں ہر پہلو سے گھس رہی تھی۔ اپنی تسلی کر رہی تھی۔

''میری زندگی میں کبھی یہ وقت نہیں آئے گا کہ تمہیں اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑے گا۔ ہاں میرے مرنے کے بعد تمہارے ساتھ کیا حالات پیش آئیں خ کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے! کب چلنا ہے، کہاں چلنا ہے؟ میں تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں مگر ایک وعدہ کرنا ہوگا مجھ سے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے تیزی سے پوچھا

''جب تک مجھ سے نکاح نہیں کرو گے۔ مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔''

''ایسا ہی ہوگا!'' وہ پر یقین لہجے میں بولا۔ ''مگر اس کے لئے پہلے کچھ اقدامات کرنے ہوں گے۔''

''کیسے اقدامات؟'' میں متفکر سی ہوگئی۔

''نکاح کرنے سے پہلے سیٹھ ناصر سے طلاق لینی پڑے گی۔''

''مگر وہ کیسے... میرا مطلب ہے کہ وہ کبھی اتنی آسانی سے طلاق نہیں دے گا۔'' دل میں چھپے خدشے سر اٹھانے لگے۔

''عدالت سے رجوع کرنا پڑے گا تمہیں۔ خلع کی درخواست دینی ہوگی۔ پریشان مت ہو میری جان میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔''

''مگر بابر! مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہیں ہے۔ رہنے دو۔ یہیں ٹھیک ہوں۔ کل کو بچے جوان ہوں گے تو میری بھی سنی جائے گی۔''

''پاگلوں جیسی باتیں مت کرو!'' وہ جھنجلا کر بولا۔ ''قدرت تمہیں اس جہنم سے نکالنے پر آمادہ ہے اور تم ہو کہ یہیں جل جل کر بھسم ہونے کا ارادہ رکھتی ہو۔ جب میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے تو پھر کیوں ڈر رہی ہو؟''

''اچھا بابر! پھر بات کریں گے۔ بیرونی دروازہ بج رہا ہے۔ لگتا ہے بچے سکول سے آگئے شاید۔ اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ... اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرنا بانو۔ مجھے تمہارے جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔''

فون بند کرنے کے بعد کتنی ہی دیر بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ کاش ناصر کا رویہ اس قدر ہتک آمیز نہ ہوتا اور نہ ہی مجھے اس حد تک جانے کی ضرورت پیش آتی۔ بچوں سے جدائی کا خیال آتے ہی آنکھیں جل تھل ہوگئیں۔

اتنے میں بچے سکول سے آگئے۔ انہیں کھانا کھلا کر کچھ دیر ان سے باتیں کرتی رہی۔ شیراز اب کافی سمجھداری کی باتیں کرنے لگا تھا جبکہ چھوٹا ارباز ابھی تک معصوم اور بھولا تھا۔ وہ توتلی زبان میں شیراز کی شکایتیں لگا رہا تھا۔ اس کے بھولپن اور معصومیت پر بہت پیار آیا مجھے۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر رونے لگی۔ پھر اس کے گال کو چوم کر دوسرا بازو وا کر کے شیراز کو بھی ساتھ لگا لیا۔

ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔اپنے جگر گوشوں کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔دونوں بچے پریشان ہو گئے۔شیراز اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھنے لگا۔

''کیا ہوا امی؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟''

''شیراز! وعدہ کرو! چھوٹے بھائی کا بہت خیال رکھا کرو گے۔''

''آپ پھر سے ناراض ہو کر نانی کے گھر جا رہی ہیں؟''اس کی آواز میں رچی اداسی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔میرا دل کٹنے لگا اور ہونٹ خاموش رہے تو وہ پھر پوچھنے لگا۔

''مت جائیں نا! ہمیں چھوڑ کر کہیں مت جائیں۔''وہ اپنی معصوم آواز میں التجا کر رہا تھا۔

''میرے بچو! میں مجبور ہو گئی ہوں۔زندگی کو مجھ پر تنگ کر دیا گیا ہے۔اب تو سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا میرے لئے۔''میں پھر سسکنے لگی۔

''مت روئیں امی! بس کچھ ہی وقت تو باقی رہ گیا ہے۔پھر ہم بڑے ہو جائیں گے اور ابو آپ کو کبھی تنگ نہیں کریں گے۔ہم جانتے ہیں ابو آپ کو مارتے پیٹتے ہیں۔''

''میں ایک بار بڑا ہو گیا تو ابو کی بہت پٹائی کروں گا۔''ننھے ارباز نے بھی اپنی توتلی زبان میں مجھے ڈھارس دینے کی کوشش کی۔

''اچھا اب تمہاری ٹیوشن کا ٹائم ہو گیا۔چلو شاباش اپنے اپنے بیگ پکڑو اور جاؤ۔''ان معصوموں کو ہراساں کرنے کے لئے خود کو من ہی من میں کوسنے لگی۔

بچے ٹیوشن چلے گئے تو ان کے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ذہن لامتناہی سوچوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔مسلسل سوچ اور ذہنی دباؤ سے لڑتے لڑتے جسم بخار کی آگ میں جلنے لگا۔بڑی بی نے کچھ دیر میرے باہر نکلنے کا انتظار کیا اور پھر کھانستے کھانستے میرے سر پر آن موجود ہوئی۔

''کیا بات ہے بہو! آج رات کا کھانا تیار نہیں کرنا کیا... کیسی بے فکری سے اٹوائی کھٹوائی لئے پڑی ہو۔''

''خالہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں ورنہ آپ جانتی ہیں کہ بلاوجہ چارپائیاں توڑنا میری عادت نہیں۔''میں نے ناگواری سے جواب دیا تو وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگی

''نہ میں پوچھوں! آخر کیا ہوا اس نگوڑی طبیعت کو اچھی بھلی تھی صبح۔''وہ ابھی تک میری طبیعت کے حوالے سے مشکوک کھڑی تھی۔

''یعنی آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں مکر کر رہی ہوں۔بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔''میرا لہجہ مزید تلخ ہو گیا تو بڑی بی کے لہجے میں از خود ہی نرمی پیدا ہو گئی۔

''ناراض کیوں ہوتی ہو بہو! میرا مطلب تو یہ تھا کہ آخر اچانک ہوا کیا ہے؟''

''بخار سے پورا بدن جل رہا ہے۔ چیک کر سکتی ہیں۔'' میں نے کراہتے ہوئے اپنا بازو واٹھا کر آگے کیا۔

''اچھا تم آرام کرو! میں ہی رات کے کھانے کا کچھ بندوبست کرتی ہوں۔'' اس نے بہانے سے میرا بازو چھو کر میری بات کی تصدیق کی اور باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

رات کو سیٹھ ناصر میری عیادت کرنے آن دھمکا۔ تھوڑی دیر کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

''کیا ہوا؟''

''بخار ہو گیا ہے۔'' میں نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

''کہیں جانے کا وقت تو نہیں آن پہنچا؟''

''کیا مطلب؟ کہاں جانے کا؟'' میں بری طرح چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔ میرے اس طرح چونکنے پر وہ استہزائیہ انداز میں قہقہے لگانے لگا۔

''جان کتنی پیاری ہے... میں نے جانے کا نام لیا تو کیسے بدک گئی۔''

اس کی وضاحت سن کر میری سانس بحال ہوئی۔

''ویسے یہ بخار کہیں میری کل رات والی باتوں کے ردعمل کے طور پر تو نہیں چڑھ گیا؟'' وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

اتنے میں اس کی جیب میں پڑا ہوا سیل فون گنگنانے لگا۔ اس نے فون جیب سے نکال کر اسکرین دیکھی تو چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہونے لگے۔

''تمہاری اماں کی کال آرہی ہے۔ یہ لو کر لو بات۔ اور ہاں! غیر ضروری باتوں کی تمہیں اجازت نہیں۔ سمجھ گئی ہو نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے فون پکڑایا تو میں نے یس کر کے کان سے لگا لیا۔

''اماں! تم کیسی ہو اماں؟ میرا دل بہت اداس ہے اماں۔ مجھے آکر مل جاؤ۔ میں نہیں آسکتی اماں... مجھے بہت تیز بخار ہے۔ کب؟ کل؟ اوکے اماں... میں تمہارا انتظار کروں گی۔ ابا کیسا ہے؟ ٹھیک ہے اماں۔ ابھی جا کر دوا لاتی ہوں۔ تم میری فکر مت کرو۔ میں جلدی ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ اوکے۔ اللہ حافظ اماں۔'' میں نے فون آف کر کے اس کی طرف بڑھایا تو وہ قہرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

''کیا ضرورت تھی بڑھیا کو بلانے کی... اب اس کی خاطر مدارتیں کرتی پھرو گی۔''

''اماں میرے گھر سے کچھ نہیں کھاتی... بلکہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لے کر آتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ بیٹیوں کے گھروں میں

خالی ہاتھ نہیں جایا جاتا۔'' میرے لہجے کی چبھن اسے ناگوار گزری۔

''چل بس! اب رہنے بھی دو... بڑی آئی حاتم طائی کے خاندان کی۔ دو گولی پیناڈول کی کھالو اتر جائے گا بخار۔''

وہ اول فول بکتا ہوا باہر نکل گیا اور میں پھر سے سر تکیے پر پٹخ کر قسمت کو کوسنے لگی۔

☆......☆......☆

اماں کے آنے تک طبیعت مزید بگڑ چکی تھی۔ وہ مجھے اس قدر ابتر حالت میں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا میری بچی! کب سے چڑھ رہا ہے یہ بخار؟ کیسے سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہو۔ نہ وہ رنگ اور نہ روپ... ایسا کیا ہو گیا جو تم اس حالت کو پہنچ گئی۔''

''کچھ نہیں اماں!'' میں ماں کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔

''چل اٹھ! تمہیں دوا لا کر دوں۔''

میں نے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر اماں نے ایک نہ سنی اور مجھے گلی میں کھلنے والے کلینک میں لے گئی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا، انجیکشن لگایا اور میڈیسن دے کر رخصت کر دیا۔

گھر واپس آ کر اماں نے پھر سے مجھے کریدنے کی کوشش کی۔

''سچ بتا بانو! کیا ناصر سے پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں اماں! ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

''تو پھر کیسی بات ہے؟ یہ چند دنوں میں تمہاری حالت مردوں سے بدتر کیسے ہوگئی۔'' اماں کھوجتی ہوئی نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔

مجھے اس کی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے الجھن ہونے لگی تو اس کے گلے میں دونوں بانہیں ڈال کر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے ساتھ لگا لیا۔

''اماں! میں بہت بری ہوں... ہمیشہ تمہیں پریشانیوں میں مبتلا رکھا... ہے نا؟''

''بری تو، تو ہے... مگر پھر بھی بہت پیاری لگتی ہے۔'' اماں نے مسکرا کر میری پیشانی پر پیار کیا۔

میری آنکھیں بھیگنے لگیں تو اس نمکین پانی کو حلق میں اتار لیا۔

''اماں آپ بیٹھیں! میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' میں اٹھنے لگی تو اماں نے بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا۔

''رہنے دے... میں بس تھوڑی دیر تک بیٹھوں گی۔ تمہارے ابا نے جلدی آنے کی تاکید کی تھی۔''

''ابا کیسے ہیں؟ مجھے یاد کرتے ہیں نا؟''

''ہاں! بہت یاد کرتے ہیں......رات کو سونے سے پہلے جب تک تجھے یاد نہ کریں، تیری باتیں نہ کرلیں تب تک نیند نہیں آتی انہیں۔''
اماں نے اپنی نگرانی میں مجھے دوا کھلائی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ کھلائے اور پھر چلی گئی۔ اماں کے جانے کے بعد تنہائی میسر آتے ہی میں نے موبائل نکالا اور بابر سے بات شروع کر دی۔

''کیا بات ہے؟ تم کچھ بیمار لگ رہی ہو؟'' دعا سلام کرتے ہی اس نے فوراً میری آواز سے جھلکتی نقاہت بھانپ لی۔

''ہاں! رات کو بخار ہو گیا تھا۔''

''تم اپنا خیال بالکل نہیں رکھ رہی بانو! جانتا ہوں اس وقت شدید ذہنی دباؤ برداشت کر رہی ہو۔'' وہ اداسی سے بولا۔

میں خاموش رہی تو اس نے پوچھا۔

''کون سی چیز تمہیں میرے پاس آنے سے روک رہی ہے؟ کیا اولاد کی محبت؟''

''میری زندگی ایک الجھن کی شکل اختیار کر گئی ہے بابر۔ میری سمجھ میں بالکل کچھ نہیں آ رہا۔'' میں روہانسی ہو کر بولی

''ٹھیک ہے بانو! میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا... تم وہی کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے۔ خوش رہو میری جان۔ ہمیشہ تمہیں دل کے نہاں خانوں میں بٹھا کے تمہاری پوجا کرتا رہوں گا۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔ اللہ حافظ۔'' اس نے کال منقطع کر دی اور میں بند فون ہاتھ میں لئے گم صم سی بیٹھی رہی۔ اچانک باہر والا دروازہ بجنے لگا تو ہوش میں آئی۔ بجلی کی سی سرعت سے موبائل کو صندوق میں کپڑوں کے نیچے چھپایا اور باہر کی طرف لپکی۔

☆......☆......☆

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر چائے کا کپ ٹرے میں رکھے ناصر کے کمرے میں داخل ہوئی تو کمرے کا اندرونی منظر دیکھ کر روح فنا ہونے لگی۔ وہ اپنی الماری کھول کر اس کے آگے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ابھی۔ وہ ریوالور کا چیمبر کھول کر اس میں گولیاں ڈالنے لگا۔ گولیاں ڈال کر اس نے چیمبر کو گھمایا اور تیزی سے گھوم کر پستول مجھ پر تان لیا۔

میں تھر تھر کانپنے لگی۔ چائے کا کپ ہاتھوں سے گر کر زمین بوس ہو گیا۔ وہ مجھے اچانک سامنے دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

''تم کب آئی کمرے میں؟''

پھر میری حالت کو دیکھتے ہوئے پستول والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

''میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر تم کیوں اتنا ڈر گئی؟'' وہ اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔ یوں جیسے میرے خوفزدہ ہونے پر لطف محسوس کر رہا ہو۔

''چلو یہ ٹوٹے ہوئے کپ کے ٹکڑے اٹھاؤ اور میرے لئے دوبارہ سے چائے بنا کر لاؤ۔'' اس نے کرخت لہجے میں آرڈر دیا۔

میں زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ٹکڑے سمیٹنے لگی۔ میں نے کن انکھیوں سے پھر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس پستول کو اب الماری میں رکھ رہا تھا۔

دس پندرہ منٹ میں، میں دوسرا کپ چائے کا تیار کر کے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اب بیڈ پر آنکھیں موندے آرام فرما تھا۔

''چائے۔'' میں نے آہستگی سے پکارا۔ میری آواز کی کپکپاہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر تک اپنی خونخوار آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا اور پھر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ مجھے اس وقت ناصر سے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چائے کا کپ اس کے حوالے کر کے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس نے کپ پکڑنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے وہ ننھی سی ٹرے اس کی طرف بڑھائی۔ میری آواز کی طرح میرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کی کپکپاہٹ کا بھی بغور جائزہ لیا۔

میں چائے پکڑا کر واپس جانے کے لئے پلٹی تو اس کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''کہاں جا رہی ہو؟ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو نا۔''

میں جیسے پتھر کی بن گئی۔ اس کے حکم سے روگردانی بھی نا قابل معافی تھی اور اس کے پاس بیٹھنا بھی سوہان روح تھا۔ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق اس کے سامنے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

''کیا بات ہے بانو؟ دن بدن مجھ سے دور کیوں ہوتی جا رہی ہو؟'' اس نے چائے کا گھونٹ بھرا اور استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

''میں بھلا کہاں تک بھاگ سکتی ہوں؟'' میں نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

''تو پھر آج آؤ گی نا؟''

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ گہری نظروں سے میرا ہی جائزہ لے رہا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''جانتے تو ہو! میری طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔ بخار نے مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ نقاہت بڑی محسوس کرتی ہوں۔''

''یہ سب بہانے ہیں مجھ سے دور رہنے کے، میری قربت سے بچنے کے۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی کہ اپنے یار کے سوا اب کوئی نظروں میں جچتا نہیں۔'' اس کے لہجے کی کاٹ نے میرا جگر چھلنی کر کے رکھ دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میری آواز میں اب کپکپاہٹ کے ساتھ نمی بھی گھل گئی۔

''ایک بات بتاؤ گی بانو! اگر کسی کو سوتے میں قتل کرنا ہو تو خنجر سے اس کی شہ رگ کاٹ دینی چاہیے یا پھر پستول کی ایک گولی کان

میں گھسیڑ دینی چاہیے؟ تم کیا کہتی ہو؟ کون سی موت زیادہ آسان رہے گی؟''

میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت جیسی سفاکی نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ میرا پورا وجود جیسے زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو مزید دہشت ناک بنا دیا۔ میں جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

''بانو! کیا تم مجھ سے خوفزدہ ہو رہی ہو؟ مت ڈرا کرو مجھ سے۔ تم تو میری جان ہو۔'' وہ ہنسا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی طرف چلنے لگی۔ دماغ جیسے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس وقت کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ بس ایک ہی بات ذہن میں چکرا رہی تھی کہ یہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچانی ہے۔ اس گھر میں رہی تو کسی بھی وقت سیٹھ ناصر کے پستول کی گولی کا نشانہ بن سکتی ہوں۔

☆......☆......☆

وہ پوری رات میں نے دہشت کے عالم میں جاگتے ہوئے گزار دی۔ دونوں بچے اپنے وقت پر سو گئے تھے مگر میری آنکھیں نیند سے آشنا نہ ہو سکیں۔ دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔ پھر بھی ساری رات نگاہیں دروازے پر جمی رہیں۔

ہر پل یہی لگتا کہ جیسے دروزاے کی دوسری طرف ناصر ہاتھ میں بھری ہوئی پستول لئے کھڑا ہے۔ یہ رات میرے لئے بہت طویل اور اذیت بھری تھی۔ اب تو ناصر کا مذموم مقصد کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ وہ یقیناً میری جان کے درپے تھا۔ صرف مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ مجھے اپنی جان خود ہی بچانا تھی اور جان بچانے کا واحد حل بابر کی پیش کش قبول کرنے کے سوا کوئی اور نظر نہ آ رہا تھا۔

میں نے وہ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ فجر کی اذانوں کی آواز سنائی دینے لگی تو جان میں جان آئی کیونکہ میری ساس بھی فجر کے وقت جاگنے کی عادی تھی۔ میں بھی ڈرتے ڈرتے اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ وضو کیا اور نماز فجر ادا کی۔ رو رو کے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنے لئے نیک اور باعزت موت کی خواہش کی۔

بچے اسکول چلے گئے۔ ناصر کا ناشتہ تیار کیا۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے بھی بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر میں بہت خوف محسوس کر رہی تھی۔ وہ چلا گیا تو قدرے سکون اور تحفظ کا احساس ہوا۔ اپنا اور اپنی ساس کا ناشتہ تیار کیا۔ ناشتہ کرتے ہی ساس نے اعلان کیا کہ محلے میں فوتگی ہو گئی ہے اور وہ وہاں جا رہی ہے۔ اب ویسے بھی اسے شاید مجھ پر اعتبار آتا جا رہا تھا۔ اس کی نگرانی میں قدرے نرمی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی میں نے بیرونی دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھائی اور اپنے کمرے میں گھس گئی۔ کپڑوں کی تہہ سے موبائل نکالا۔ بابر سے رابطہ کیا۔ اس کی جیسے ہی ہیلو کی آواز کان میں پڑی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے اس طرح روتا دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔

”کیا ہوا جان! کیوں اس طرح رو رہی ہو؟ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“

”بابر مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ ناصر مجھے قتل کر دے گا۔ ساری رات میں نے اپنی جان کے خوف سے جاگ کر گزاردی۔ یہ خوف میری جان لے لے گا۔ پلیز، مجھے بچالو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔“ میں ہچکیاں لیتے ہوئے وقفے وقفے سے بولتی چلی گئی۔

”فکر نہ کرو بانو... میرے جیتے جی کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”مجھے تمہاری کھوکھلی تسلیاں نہیں چاہئیں بابر۔ پلیز مجھے یہاں سے لے جاؤ جلدی۔ ابھی اسی وقت۔“

”اوکے! میں آ رہا ہوں۔ فون بند مت ہونے دینا۔ بار بار رابطہ کروں گا۔ اب کچھ ضروری ہدایات تمہیں دوں گا۔ پوری توجہ سے سننا۔“

پھر دس پندرہ منٹ تک اس نے مجھے گھر سے فرار ہونے اور اس کے بعد والے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے کچھ اہم باتیں گوش گزار کیں۔

”اپنے تین چار سوٹ اور کچھ ضروری چیزیں ایک چھوٹے بیگ میں ڈال کر رکھ لو۔ آج رات ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ اوکے؟“

”ٹھیک ہے! میں تیار رہوں گی۔ اب میرے لئے اس گھر میں ایک ایک پل گزارنا محال ہے۔“ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر میرے وجود میں اس وقت ایک سنسنی سی پھیل گئی۔

ساس کی گھر سے غیر موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے بیگ میں روزمرہ پہننے والے کپڑوں کے چند جوڑے بیگ میں ڈالے اور بیگ بیڈ کے نیچے چھپا دیا۔ گھر کے کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک بے کلی سی چھائی ہوئی تھی طبیعت پر۔

تھوڑی دیر بعد ساس آ گئی۔ وہ آرام کرنے کی خاطر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آج فون میرے پاس تھا۔ میں نے وائبریشن پہ لگا کر اسے اپنے گریبان میں ڈال رکھا تھا۔ دو بجے تک بچے گھر آ گئے۔ آج ان کا والہانہ استقبال کیا تو وہ قدرے حیران ہوئے اور کھانا وغیرہ کھلا کر جب انہیں ٹیوشن جانے سے روکا تو مزید حیران ہوئے۔

”امی! آپ ہمیں ٹیوشن جانے سے کیوں روک رہی ہیں؟“ شیراز نے استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

”بس! آج میرا دل چاہتا ہے کہ تم باقی کا پورا دن میرے ساتھ گزارو۔ میں جی بھر کے تم دونوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میری آواز بھرا گئی۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اپنے کندھے سے سکول بیگ اتار کر رکھ دیا جبکہ ارباز چھٹی کا سن کر بہت خوش ہوا۔ میں بچوں کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ جب عین دل کے اوپر رکھا ہوا وہ ننھا سا موبائل تھرتھرایا۔

میں اچھل پڑی مگر بچوں کے سامنے اسے نکالنا مناسب نہ سمجھا۔ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر فون نکالا۔ دیکھا تو بابر کا میسج آیا ہوا تھا۔ اوپن کر کے پڑھنے لگی۔

''میں تمہارے شہر پہنچ چکا ہوں۔کسی کو مجھ پر شک نہ ہو اس لئے فوزیہ کے ہاں نہیں گیا۔ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔رات کو ایک بجے نکلنا ہے تیار رہنا۔''

میسج پڑھ کے دل کی دھڑکنیں پھر سے بے ترتیب ہونے لگیں۔جواب ٹائپ کرنے لگی۔

''اوکے۔میں تیار رہوں گی۔'' یہ جوابی میسج سینڈ کر کے میں واپس کمرے میں آ گئی جہاں دونوں بھائی میرا انتظار کر رہے تھے۔ہم تینوں پھر سے باتوں میں مشغول ہو گئے۔بچے آج میری رفاقت میں بہت خوش تھے۔وہ معصوم اس بات سے قطعا بے خبر تھے کہ ان کی اپنی ماں کے ساتھ بتانے والی یہ آخری گھڑیاں ہیں۔اس کے بعد ماں کی شکل دیکھنے کے لئے ترس جائیں گے۔

میرے دل میں رہ رہ کر ہول سے اٹھ رہے تھے۔یہ پھول جیسے چہرے نجانے کبھی دوبارہ تا زندگی نظر بھی آئیں گے کہ نہیں۔میں بظاہر ان کے ساتھ ہنس کھیل رہی تھی مگر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''شیراز!آج رات کو کھانے میں کیا بناؤں؟''

''جو دل چاہے بنالیں امی!آپ تو جانتی ہیں۔میں ہر چیز کھالیتا ہوں۔کبھی کسی بات کے لئے ضد نہیں کرتا۔''اس نے معصومیت سے جواب دیا تو میرا دل بھر آیا۔اس کا منہ چوم کر اسے ساتھ لگا لیا۔

''میرا بیبا بچہ!''

''امی!میں بھی بیبا بچہ ہوں۔''ارباز کے لہجے سے جیلسی کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

''ہاں میری جان!تم بھی بہت پیے بچے ہو۔''میں نے اس بھی اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''امی!ایک بات کہوں؟''شیراز نے مجھ سے اجازت چاہی۔

''ہاں ہاں کہو...میں سن رہی ہوں۔''میں نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی!آپ ہمیشہ ایسی ہی رہا کریں۔ہنستی،مسکراتی ہوئی۔ہم سے پیار کرنے والی۔جب آپ اداس ہوتی ہیں تو ہم بھی اداس ہو جاتے ہیں۔''

اس کی بات سن کر دل پھٹنے والا ہو گیا۔

''اچھا تم دونوں تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ۔میں رات کے کھانے کی تیاری کر لوں۔''

''کھانے میں کیا بناؤں؟تم لوگوں نے بتایا نہیں؟''

''چکن بریانی۔''دونوں نے بیک آواز میں جواب دیا تو میں مسکرانے لگی۔

''اوکے!مجھے اسی جواب کی امید تھی۔''

میں کچن میں چلی آئی۔فریج کھولا،چکن کا ایک شاپر نکالا اور چاول ٹرے میں ڈال کر چننے لگی۔

ناصر ہر ہفتے بعد گوشت وغیرہ اور دوسرا سودہ سلف لا دیتا تھا۔ بریانی تیار کرتے ہوئے بھی ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔چاولوں کو دم پر لگا کر ساس کے کمرے میں جھانکا۔وہ مغرب کی نماز ادا کر رہی تھی۔

اچانک دماغ میں یہ خیال آیا کہ جب بڑھیا کو کل میری گمشدگی کی اطلاع ملے گی تو اس کا کیا ردعمل ہوگا۔یقیناً مجھے کوسنے دے گی،بیٹے کے کان بھرے گی،میرے اگلے پچھلوں کو گالیوں سے نوازا جائے گا۔

میں نے سر جھٹکا اور بچوں کے کمرے میں آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔دونوں بھائی سو رہے تھے۔کتنی بے فکری اور آسودگی سی چھائی ہوئی تھی ان کے چہروں پر۔میں کتنی ہی دیر ان کے پاکیزہ مکھڑوں پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔پھر یاد آیا کہ چاولوں کا دم زیادہ طویل ہو جائے تو وہ جل بھی سکتے ہیں۔تیز تیز قدموں سے کچن کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

ناصر دکان سے آیا تو کھانا لگا دیا گیا۔آج اس کا موڈ بھی بریانی دیکھ کر خوشگوار ہو گیا تھا بلکہ اس نے کھانے کی تعریف بھی کی جو کہ ایک انوکھی بات تھی۔کھانے کے بعد برتن سمیٹنے لگی تو ناصر نے حکم دیا کہ میری چائے لے کر آؤ۔

وہ اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلا گیا اور میں نے برتن سمیٹ کر اس کے لئے چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔چائے تیار ہوگئی تو کپ میں انڈیل کر اس کے حضور حاضر ہوگئی۔اس نے کپ میرے ہاتھ سے لیا اور مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا آرڈر دیا۔میں خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''ناراض ہو مجھ سے بانو؟''اس کا لہجہ بھی آج خلاف معمول نرمی لئے ہوئے تھا۔

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ رقصاں تھی مگر آج اس مسکراہٹ میں طنز کی آمیزش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اسی وقت سینے میں ہونے والی تھرتھراہٹ نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔اپنی عقل کو کوسنے لگی۔اس کمرے میں آنے سے پہلے موبائل کو کسی محفوظ جگہ پر چھپا کر آنا چاہیے تھا۔اب بری طرح پچھتا رہی تھی۔اگر ناصر دست درازی کی کوشش کرتا تو یہ موبائل فون اس سے چھپ نہیں سکتا تھا۔یہ واہمے ایک پل میں خطرناک حقیقت کا روپ دھار سکتے تھے۔میری جان لبوں پر آ گئی اور فون کی مدھم سی غوں غوں ابھی تک جاری وساری تھی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وائبریشن کی یہ ہلکی ہلکی آواز ناصر کے کانوں تک بھی پہنچ رہی ہے۔مارے خوف کے دل جیسے بند ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔اضطراری حالت میں کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں۔میری طبیعت ٹھیک نہیں۔جانا چاہتی ہوں۔'' میری آواز جیسے کسی اندھے کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

بہرحال ایک بات کی تسلی ہوگئی تھی کہ یہ آواز ناصر کے کانوں کی دسترس سے دور تھی۔وہ بالکل نارمل لہجے میں بات کر رہا تھا۔اس اطمینان کے بعد میں نے خود کو کافی حد تک نارمل کرلیا اور ویسے بھی اب وہ منحوس غوں غوں کی آواز بھی بند ہو چکی تھی۔یقیناً بابر مجھے کال کر رہا تھا۔میرے ریسیو نہ کرنے کی وجہ سے کال آنا بند ہو چکی تھی۔

''صرف پانچ منٹ بیٹھ جاؤ۔'' ناصر نے درخواست گزار لہجے میں کہا تو میں پھر سے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔اب کی بار میں نے فاصلہ پہلے کی نسبت زیادہ رکھا تھا۔

میں اس کا بدلہ ہوا رویہ دیکھ کر الجھن محسوس کر رہی تھی۔میری خاموشی کو وہ میری ناراضگی ہی سمجھ رہا تھا۔پھر بولا۔

''ایک دن تم نے معافی کی بات کی تھی...یاد ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔

''میں تجھے معاف کرتا ہوں بانو۔اب تو بھی مجھے معاف کر دے۔اپنے کمرے میں واپس آجا۔میرا دل نہیں لگتا تمہارے بنا۔اکیلا ساری ساری رات اتنے بڑے بیڈ پر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔'' بات مکمل کر کے اس نے استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔میں جو اس کی باتیں سن کر ورطہ حیرت میں گم تھی۔اس کے اس طرح دیکھنے پر بوکھلا گئی۔

''کل سے آجاؤں گی۔'' کوئی اور جواب نہ بن پڑا تو فٹ سے یہ جواب دے دیا۔

''مگر آج سے کیوں نہیں؟'' وہ لجاجت سے بولا تو میرے ذہن میں اندیشوں کے ناگ سر اٹھانے لگے۔کہیں آج رات ہی اس نے مجھے قتل کرنے کا پروگرام تو نہیں بنا لیا۔پھر گولیوں سے بھرا ہوا ریوالور نظر کے سامنے آگیا۔

اچانک اس کے بدلے ہوئے رویے نے میرے شک پر یقین کی مہر ثبت کر دی۔

''نہیں!کل سے یہاں سویا کروں گی۔'' میں نے قطعی لہجے میں جواب دیا تو وہ آسانی سے مان گیا۔

''ٹھیک ہے مگر کل کوئی عذر نہیں سنوں گا۔'' وہ مسکرایا تو اس کی مسکراہٹ میں چھپی عیاری جان کر مجھے جھرجھری آگئی۔

''ہاں!کل کوئی عذر تراشنے کی نوبت نہیں آئے گی۔'' میں نے اٹل لہجے میں جواب دیا تو وہ خوش ہو گیا۔میں اٹھ کر باہر آگئی تو اس نے آواز دے کر روکنے کی کوشش نہ کی۔

☆......☆......☆

بچوں کے کمرے میں آئی تو وہ دونوں کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔دوپہر کو سونے کی وجہ سے وہ بڑے فریش دکھائی دے رہے

تھے۔انہیں کھیل میں مشغول دیکھ کر میں نے موبائل باہر نکالا اور بابر کو میسج کرنے لگی۔

''کیا بات کہنی ہے؟ جو بھی کہنا ہے۔میسج کے ذریعے کہہ سکتے ہو۔کال پر بات نہیں کرسکتی ابھی گھر میں سب جاگ رہے ہیں۔''

میں نے اسے یہ میسج سینڈ کیا اور پھر سے بچوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔اگلے ہی لمحے اس کی جانب سے ریپلائی آگیا۔

''میں ٹھیک دو بجے گاڑی لے کر تمہارے دروازے کے سامنے آؤں گا۔ریڈی رہنا۔''

''اوکے''۔میں نے جواب لکھا اور سوچوں میں کھوگئی۔

تقریباً دس بجے تک بچے سوگئے۔میں نے کمرے کا دروازہ حسب معمول لاک کیا اور ان کے پاس بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔یہ دوسری رات تھی مجھے مسلسل جاگتے ہوئے۔نیند سے آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں مگر آج کی رات میں سو نہیں سکتی تھی۔اسی طرح نیند سے جھومتے ہوئے رات کے پونے دو بج گئے۔میں اٹھی۔بیڈ کے نیچے سے اپنے کپڑوں والا بیگ باہر کھینچا اور خود واش روم میں گھس گئی۔

چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار کر نیند کو دور بھگایا۔باہر آکر موبائل اٹھا کر دیکھا تو بابر کی کال آرہی تھی۔میں نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا کر دھیمی آواز میں ''ہیلو'' کہا۔

''میں تمہاری گلی میں گاڑی لے کر آچکا ہوں۔باہر آجاؤ۔''

''اوکے۔ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر فون بند کر کے پھر سے گلے میں ڈال لیا۔نیچے جھک کر بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔جاتے جاتے سوئے ہوئے بچوں پر نظر پڑی تو چلتے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لئے۔واپس بچوں کے پاس آئی۔بیگ زمین پر رکھا۔ان کے پاس کھڑی چند لمحوں تک انہیں دیکھتی رہی۔پھر جھک کر دونوں کی پیشانیاں چومنے لگی۔آنکھوں سے بہنے والے آنسوان کے چہروں کو بھگونے لگے۔

وہ سوتے میں کسمسانے لگے تو پیچھے ہوگئی۔اس ڈر سے کہ کہیں جاگ نہ جائیں۔دل کڑا کر کے اٹھی، بیگ اٹھایا اور کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر نکل گئی۔باہر نکلتے ہی نظر غیر ارادی طور پر ناصر کے کمرے کے بند دروازے کی طرف اٹھی۔خوف کی ایک لہر ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرگئی۔

میں تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ایک کواڑ کھول کر باہر گلی میں جھانکا تو ایک سفید گاڑی دروازے سے تھوڑا ہٹ کر کھڑی تھی۔مجھے دیکھ کر بابر گاڑی سے باہر نکل آیا۔اسے پہچان کر مجھے تسلی ہوگئی۔میں مکمل طور پر باہر نکل آئی۔پیچھے سے دروازہ بھیڑ دیا اور گاڑی کی طرف چلنے لگی۔

بابر نے میرے لئے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔میں عقبی نشست پر بیٹھ گئی تو وہ گھوم کر دوسری سائیڈ سے آیا اور میرے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا کوئی دوست بیٹھا تھا۔ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آگئی اور تیزی سے گلی عبور کرنے لگی۔

میں حسرت بھری نگاہوں سے اپنے گھر کو پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھتی رہی۔آنکھیں پھر سے چھلک اٹھیں۔

☆......☆......☆

رات کے چار بجے تک ہم اس گاڑی والے کے ہمراہ اس کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔یہ لاہور شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔بعد میں بابر کی زبانی معلوم ہوا کہ فیصل نامی یہ نوجوان ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔اس کا باپ ایک سیاستدان ہے اور کافی اثر ورسوخ رکھنے والے لوگ ہیں۔

فیصل اس مل کا اونر بھی تھا جہاں بابر کام کرتا تھا۔ایک باس کی اپنے ملازم کے لیے اتنی تگ ودو اور بھاگ دوڑ نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

یہ ایک فارم ہاؤس ٹائپ ڈیرہ تھا۔جہاں دو کمرے اور ایک چھوٹا کچن بنائے گئے تھے۔فیصل کی گاڑی دیکھتے ہی چوکیدار نے بیرونی بڑا سا گیٹ کھول دیا اور فیصل کو سیلوٹ بھی کیا۔گاڑی سے اترے تو فیصل کی معیت میں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔

''آپ لوگ آرام کریں۔میں کھانے کے لئے کچھ بھجواتا ہوں۔''اس نے مخاطب ہم دونوں کو کیا تھا مگر مرکز نگاہ صرف بابر تھا۔میں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ اس نے ایک بار بھی مجھ پر ارادی طور پر نظر نہیں ڈالی تھی اور ویسے بھی میں نے اپنے جسم اور آدھے چہرے کو ایک بڑی کالی چادر میں چھپا رکھا تھا۔

وہ باہر چلا گیا تو میں کھڑی کھڑی کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ایک بڑا ڈبل بیڈ،ایک تین سیٹ صوفہ،صوفے کے آگے خوبصورت گلاس ٹیبل اور ایک کونے میں نفیس چوبی ڈریسنگ ٹیبل اور فرش پر بچھا ہوا دبیز قالین جس میں پاؤں دھنسائے ہم کھڑے تھے۔

جہاں کمرے کی آرائش اور قیمتی چیزوں نے مرعوب کیا۔وہیں ایک ایسی چیز پر نظر پڑی جسے دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔یہ دیوار میں بنا ہوا شیشے کا ایک شوکیس تھا جس میں نوع انواع واقسام کی ولایتی شراب کی دیدہ زیب بوتلیں بڑی ترتیب سے سجا کر رکھی ہوئی تھیں۔

اوپر والے دو ریکس بوتلوں سے سجے ہوئے تھے۔جبکہ نیچے والا تیسرا ریک شیشے کے خوبصورت گلاسوں سے سجا ہوا تھا۔اتنے قیمتی اور خوشنما گلاس میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔بابر مجھے اور میرے ارتکاز کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''اگر اس کمرے کی ہر چیز کا آپ نے باریک بینی سے جائزہ لے لیا ہو تو اب بیٹھ جائیں۔''اس نے ہاتھ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔۔

میں چونک کر اس کو دیکھنے لگی۔وہ محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔میں جھینپ گئی اور صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔میرے جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا ہوا؟''وہ میری اس حرکت پر حیران ہوا۔

میں خاموش رہی تو بولا۔

"پریشان ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔اسی وقت دراوزے پر ہلکی آواز میں دستک ہوئی تو بابر نے جا کر پتا کیا۔وہی چوکیدار کھانے کی ٹرے اٹھائے کھڑا تھا۔بابر نے ٹرے اس کے ہاتھ سے لی اور دروازہ بند کر دیا۔اس نے ٹرے ٹیبل پر لا کر رکھ دی۔مٹن کڑاہی اور تندوری روٹیوں کے ساتھ سلاد اور رائتہ بھی تھا۔

"رات کے اس پہر کھانا؟"میں یہ پر تکلف اور بے وقت کا طعام دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

"یہ سارا اہتمام اس چوکیدار نے سر شام ہی کر لیا ہوگا۔فیصل نے یقیناً فون پر اسے یہ ہدایات دی ہوں گی۔"

"مگر کھانا تو ایکدم گرم ہے۔دیکھو سالن سے دھواں اٹھ رہا ہے۔"میری بات سن کر وہ مسکرانے لگا اور بولا۔

"کھانا ابھی ابھی مائیکرو ویو اوون میں گرم کیا گیا ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"میں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہ کھانا گرم کرنے کے لئے بجلی کی ایک مشین ہوتی ہے۔"

"اوہ۔"میرے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔

"تم کھانا کھاؤ... کھانا کھانے کے بعد آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل بھی ترتیب دینا ہے۔"

اس کی بات سن کر میں پھر سے اداس ہو گئی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔تم کھا لو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔میں جانتا ہوں کہ پچھلے دو دن سے تم جس اذیت ناک صورت حال سے گزر رہی ہو۔کھانا تمہارے حلق سے نیچے کم ہی اترا ہوگا۔اس لئے دھیان سے کھاؤ۔اگر زیادہ نہیں تو کم ہی کھا لو۔پلیز میری خاطر۔"اس کے پیار بھرے اصرار پر چند نوالے زہر مار کئے۔کھانے سے فارغ ہو کر اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اٹھانا چاہا۔

"آؤ!بیڈ پر چلتے ہیں۔اب تھوڑی دیر آرام کریں گے۔"

اس کی پیشکش سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔

"تمہیں یاد ہے نا کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"ہاں بابا!اچھی طرح یاد ہے۔تم نے کہا تھا کہ نکاح سے پہلے تمہارے قریب نہیں جاؤں گا۔اس وعدے کی پوری پاسداری کروں گا بلکہ تم سے کئے ہوئے ہر وعدے کی پاسداری کروں گا۔"

اس کی باتوں سے دل قدرے مطمئن ہو گیا اور اٹھ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔ وہ دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا۔

''دیکھو بانو! اب جو بھی باتیں تمہیں بتاؤں گا۔ انہیں دھیان سے سننا۔''

اس کی سنجیدگی دیکھ کر میں بھی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''صبح ہم لاہور جائیں گے۔ وہاں تمہیں دارالامان میں چھوڑیں گے۔ پھر خلع کے لئے عدالت سے رجوع کیا جائے گا۔ اب عورت کے لئے خلع لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایک دو پیشیوں میں ہی عدالت عورت کے حق میں فیصلہ سنا دیتی ہے۔''

''مگر میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ عدالت میں خلع کی درخواست وغیرہ دائر کرنا پیشیوں پر جانا۔'' اس کی باتوں سے میں متفکر ہو گئی۔

''میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سارے انتظامات کرنے میری ذمہ داری ٹھہری۔ ان سب کاموں کے لئے ایک قابل وکیل بھی ہائر کرنا پڑے گا۔''

''تم یہ سب کیسے کرو گے۔ یقیناً پیسے کی بھی ضرورت پڑے گی اور میں تو بالکل تہی دست ہوں۔ میرے پاس تو چند سو روپوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

میری بات سن کر وہ ہنسنے لگا۔

''میرے ہوتے ہوئے تم ایسی باتیں کیوں سوچ رہی ہو؟ تم اب میری ذمہ داری ہو بانو۔ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ تمہیں اس درندے کی قید سے رہائی دلا کر ایک باعزت اور پرسکون زندگی کی سوغات دے سکوں۔''

اس کی باتوں سے روح کی تھکن جیسے فضا میں تحلیل سی ہو رہی تھی۔

''بس ایک بات کا خیال رکھنا۔ تمہیں، تمہارے لواحقین میں سے کوئی بھی لینے آئے تو کسی پر اعتبار کر کے ساتھ جانے کی حماقت مت کر بیٹھنا۔ تمہارا واپس جانا یوں سمجھ لو جیسے جان بوجھ کر خود کو موت کے حوالے کرنا ہے۔ جاتے ہی تمہاری جان لے لی جائے گی۔ رتی برابر رحم نہیں کیا جائے گا اور تمہارے قتل کو کسی بھی حادثے کا رنگ دے دیا جائے گا۔''

اس نے کچھ اس انداز سے حقائق کا نقشہ کھینچا کہ مجھے جھرجھری آ گئی۔

''نہیں بابر! اب تمہارے سوا کسی پر اعتبار نہیں کروں گی۔ یوں سمجھ لو کہ اپنے پیچھے ساری کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔'' میری آواز رندھ گئی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''بلکہ تم میرے علاوہ کسی سے بھی نہیں ملو گی۔ اگر کوئی اصرار کرے تب بھی نہیں۔ سمجھ گئی نا؟'' اس نے تائید طلب نگاہ سے میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بابر! اگر تم برا محسوس نہ کرو تو ایک بات کہوں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے اجازت چاہی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں... جو بھی کہنا چاہتی ہو، بلا جھجک کہو۔''

''تم پلیز صوفے پر جا کر لیٹ جاؤ۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے کمر سیدھی کرنا چاہتی ہوں۔'' میری بات سن کر وہ خفت زدہ انداز میں مسکرانے لگا۔

''اوہ! میں معافی چاہتا ہوں بانو۔ یہ بات مجھے تم سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ اوکے۔ تم اب آرام کرو۔ میں بھی کچھ دیر تک سستا لیتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر صوفے پر جا کر لیٹ گیا اور میں نے بھی لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ سامنے والی دیوار پر لگا کلاک صبح کے چھ بجا رہا تھا۔ سونے کا وقت تو نہیں رہا تھا۔ بس دو گھڑی سستانا ہی مقصد تھا مگر لیٹتے ہی دو راتوں کے جگراتے نے اپنا اثر دکھا دیا۔

ایسی گہری نیند آئی کہ آنکھ کھلی تو سامنے والا کلاک اب صبح کے نو بجا رہا تھا۔ بابر سامنے صوفے پر بیٹھا کسی پرانے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے جاگتا دیکھ کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''گڈ مارننگ میڈم!'' اس نے مسکراتے ہوئے صبح کا سلام کیا تو میں نے بھی جواب میں ایک مسکراہٹ اچھالتے ہوئے ''شکریہ'' کہہ دیا۔ اس کا موڈ مزید خوشگوار ہو گیا

''یہ ہوئی نا بات... بس ایسے ہی مسکراتی رہا کرو میری جان۔ اٹھو! واش روم میں جاؤ اور فریش ہو جاؤ۔'' اس نے کمرے میں موجود ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جو یقیناً اٹیچڈ باتھ روم تھا۔

میں بیڈ سے نیچے اتری، جوتا پہنا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

واش روم سے باہر آئی تو بابر کے آگے رکھی ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات پڑے ہوئے تھے۔ ناشتے پر نظر پڑتے ہی ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ بچوں نے کچھ کھایا ہو گا کہ نہیں۔ اب تک تو سب گھر والے جاگ چکے ہوں گے اور مجھے ڈھونڈنے کی کوششیں بھی جاری ہو گئی ہوں گی۔ سب سے پہلے اماں کو فون کر کے میرا پوچھا گیا ہو گا۔

اماں کے لاعلمی کے اظہار کے بعد غم و غصے کی ایک تند و تیز لہر دوڑ گئی ہو گی دونوں گھرانوں میں۔ پھر اماں، ابا اور بھائی کے چہرے آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھنے لگی کہ ان سب کے چہروں پر مردنی سی چھائی ہوئی ہے۔ اماں دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کر رہی ہیں۔ بھابی انہیں ایسا کرنے سے روک رہی ہیں اور ساتھ ہی زبان سے نشتر زنی بھی جاری ہے۔ بھائی اپنے ایک ہاتھ کا مکا بنائے دوسرے ہاتھ پر مار رہے ہیں اور ساتھ ہی کچھ ایسے کلمات ان کے منہ سے نکل رہے ہیں۔

''مل جائے ایک بار، زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ناک کٹ گئی۔ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے ہم۔ سر جھکا گئی ہمیشہ کے

لئے ہمارا۔"

اور بھابی لقمہ دیتے ہوئے کچھ اس طرح کا جواب دیں گی۔

"اسے قتل کر کے خود پھانسی کے تختے پر چڑھنا ہے کیا۔ اپنے بچوں کو یتیم کرو گے اب؟"

اور ابا۔ ابا کہیں کسی چارپائی پر ڈھے سا گیا ہوگا۔ اس کے دل پر قیامت گزر رہی ہوگی یہ خبر سن کر مگر لب...... لب خاموشی سے لرز رہے ہوں گے۔

وہیں کھڑے کھڑے ایک فلم سی پردہ سکرین پر چلنا شروع ہوگئی تھی۔

"کیا ہوا؟ رک کیوں گئی؟ جلدی آؤ۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" بابر کی آواز سن کر ہوش میں آئی اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

ناشتے میں ہاف فرائی انڈے اور ساتھ بریڈ کے سینکے ہوئے سلائسز تھے۔ میں نے چند لقمے زہر مار کئے اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا ہوا؟ کھاؤ نا۔" بابر نے اصرار کیا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز مجھے مجبور مت کرو بابر۔"

میری بات سن کر وہ چپ ہوگیا۔ اس کے بعد خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہی چوکیدار دروازے پر آیا برتن لینے کے لئے۔ بابر نے ناشتے والے برتنوں والی ٹرے اس کے حوالے کی اور فیصل کے متعلق پوچھا۔

"صاحب ناشتہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دس پندرہ منٹ تک نکلتے ہیں۔"

"اوکے۔ کرم دین، تم ہمیں دو کپ چائے کے بنا کر لا دو... اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو؟" بابر نے اس چوکیدار سے چائے کی فرمائش کر دی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے بھی چائے کی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی۔

"زحمت کیسی صاحب! ابھی بنا کر لاتا ہوں۔ آپ نہ بھی کہتے تو فیصل صاحب نے پہلے ہی تاکید کی تھی کہ ناشتے کے فوراً بعد چائے پلانے کی۔"

چوکیدار کے جانے کے بعد وہ پھر سے میرے پاس آ بیٹھا۔ مجھے افسردہ دیکھ کر اس نے مجھے مخاطب کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ جیب سے موبائل فون نکال کر اس پر مصروف ہوگیا۔ اسی دوران کرم دین چائے لے کر آ گیا

چائے پیتے ہوئے بھی خاموشی کا دورانیہ برقرار رہا۔

ابھی آخری چند گھونٹ باقی تھے۔ جب فیصل اندر آیا۔ اگرچہ اس نے اندر آنے سے پہلے ہلکی سی دستک دی تھی دروازے پر مگر میں اتنی جلدی چہرہ چادر میں نہیں چھپا سکی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی اچانک پہلی نظر مجھ پر ہی پڑی کیونکہ میں اس وقت دروازے کے عین سامنے رکھے صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی جبکہ بابر قدرے اوٹ میں رکھے ہوئے بیڈ پر براجمان تھا۔

فیصل کی اچانک پڑنے والی نگاہ نے اسے چونکا دیا۔ چند لمحے غیر ارادی طور پر اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی رہیں۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور وہ بابر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا خیال ہے؟ چلیں؟''

''ہاں بالکل! کافی وقت ہو گیا ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' بابر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں جو فیصل کے اچانک اندر آنے پر بوکھلا گئی تھی۔ اب چہرے کو اپنی کالی چادر سے چھپا چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ فیصل ایک بارعب اور شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ سفید لٹھے کی کلف شدہ شلوار قمیص پر بلیک ویس کوٹ نے اس کی پرسنائلٹی کو مزید جاذب نظر بنا دیا تھا۔

''بابر! تم ذرا پانچ منٹ کے لئے باہر آؤ۔ ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ بابر بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ ان دونوں کی بے جوڑ دوستی مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ کہاں چودھری فیصل، ایک معروف سیاستدان کا بیٹا اور کہاں بابر، ایک ٹیکسٹائل مل کا معمولی سا سپروائزر۔ چند منٹ بعد بابر اندر آیا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرا کپڑوں والا بیگ اٹھا لیا اور میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے باہر آ گئی۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس نے بیگ رکھا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں عقبی سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ بابر فیصل کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دس ساڑھے دس بجے تک ہم اس فارم ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے۔ اب گاڑی کا رخ لاہور شہر کی جانب تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے ہم اس عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ جس کے ماتھے پر ''دارالنسا'' لکھا ہوا تھا۔

میں سمجھی شاید یہی دارالامان ہے مگر بعد میں پتا چلا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ ایک ویمن ہوسٹل تھا۔ جو بے سہارا اور گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو پناہ دینے کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ یہ ساری معلومات مجھے بعد میں پتا چلیں۔ اس وقت تو میں اسے دارالامان سمجھتے ہوئے بابر اور فیصل کے ہمراہ عمارت میں داخل ہوئی۔

فیصل آگے آگے چل رہا تھا جبکہ میں اور بابر اس کے پیچھے اس کے قدموں پر اپنے قدم رکھتے جا رہے تھے۔ فیصل کی چال باوقار اور پرتمکنت تھی۔ وہ پورے اعتماد سے عمارت میں داخل ہوا تھا۔ بغیر کسی روک ٹوک کے۔ راہ میں نظر آنے والے کئی ملازمین ٹائپ لوگوں نے اسے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سلام بھی پیش کیا تھا۔ یوں جیسے وہ اس ادارے کا روح رواں اور مالک ہو۔

داخلی دروازے سے تھوڑا اندر گئے تو ایک راہداری میں مڑ گئے۔ اس راہداری کے سرے پر ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں ایک وسیع عریض میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر ایک چالیس پینتالیس سالہ خوبصورت اور باوقار سی عورت بیٹھی اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور گرمجوشی سے ہمیں ویلکم کیا۔

''آیئے چھوٹے چودھری صاحب! آج یہاں کا راستہ کیسے بھول گئے؟'' وہ مسکراتے ہوئے فیصل کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بڑی دل آویز اور زندگی سے بھرپور تھی۔

وہ انتہائی متناسب جسم اور دلکش نقوش رکھنے والے پرکشش چہرے کی مالک تھی۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں اس کی میز کے اس پار نرم کرسیوں پر دھنس گئے۔ اب وہ متجسس نگاہوں سے ہم تینوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میڈم فرح! کیسی ہیں آپ؟'' فیصل نے خوش مزاجی سے اس ڈیسینٹ سی خاتون کا احوال پوچھا۔

''بس... دعائیں ہیں آپ کی چودھری صاحب۔'' اس نے بھی جواب بڑی لگاوٹ سے دیا۔ ''جی کیسے یاد کیا آج اس ناچیز کو؟'' یہ سوال بھی اس نے ایک خاص ادا سے پوچھا۔

''یہ میرا دوست ہے بابر اور یہ ان کی لورہیں مہربانو۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک طلاق کا معاملہ نمٹ نہیں جاتا، یہ یہیں رہیں گی اور عدت کی مدت بھی یہیں پوری کریں گی۔''

''اوہ! تو یہ پہلے سے شادی شدہ ہیں۔'' اب وہ میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں میڈم فرح! یہ میریڈ ہیں مگر بہت جلد اس زنجیر سے آزاد کروا دیں گے ہم۔ بس انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔''

''آپ فکر نہ کریں چھوٹے چودھری صاحب! انہیں یہاں پر کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' میڈم فرح نے خوش دلی سے جواب دیا۔

بابر نے اٹھ کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے باہر کوریڈور میں آگئی۔

''گھبرانا مت! یہاں تم ہر طرح سے سیو ہو۔ دارالامان سے بھی زیادہ۔''

''تو کیا یہ دارالامان نہیں ہے؟'' اس کی بات سن کر میں بڑی حیران ہوئی۔

''نہیں! یہ ویمن ہوسٹل ہے۔ اسے بھی دارالامان ہی سمجھو۔ یہ چند مخیّر حضرات کی مالی امداد کے بل پر چل رہا ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی ہے۔ یعنی بے سہارا اور بے گھر عورتوں کی کفالت کرنا اور انہیں چھت مہیا کرنا۔''

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار والے تین نوٹ میری طرف بڑھائے۔

''یہ تھوڑے پیسے رکھ لو۔ کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

میں نے لینے سے انکار کر دیا مگر پھر اس کے پرزور اصرار پر رکھنے پڑے۔

''میں اب ایک ہفتہ یہیں رکوں گا۔ فیصل کے پاس۔ کل کسی وکیل کا بندوبست کریں گے۔ جو تمہارے شوہر کو خلع کا نوٹس بھیجے گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

''گھبرانا نہیں۔میرے ساتھ جب چاہے فون پر بات کرسکتی ہو۔او کے؟''

میں نے پھر سر کو اوپر نیچے جنبش دی تو اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا

☆......☆......☆

جب ہم دونوں واپس آفس میں آئے تو فیصل اور میڈم فرح کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ہمیں دیکھ کر خاموش ہو گئے۔بابر نے چلنے کا اشارہ کیا تو فیصل نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔فرح سے الوداعی کلمات کا تبادلہ کیا اور دونوں آفس سے باہر نکل گئے۔ان کے جانے کے بعد میں پھر سے میڈم فرح کے سامنے ایک کرسی پر براجمان ہو چکی تھی اور اب وہ میری ہی طرف متوجہ تھی۔

''اس وقت میرے سوا یہاں کوئی دوسرا موجود نہیں۔اس لئے تم چاہو تو اپنے چہرے کو اس گھٹن سے آزاد کرسکتی ہو۔''

اس کا اشارہ یقیناً میرے نقاب کی طرف تھا۔جس سے میں نے چہرے کا بڑا حصہ چھپا رکھا تھا۔میں نے چہرے سے چادر ہٹا دی تو وہ ستائش بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہمم! کافی خوبصورت ہو۔شوہر کو چھوڑ کر عاشق کے ساتھ بھاگ آئی ہو۔کیوں؟ کیا اس نے تمہارے حسن کی قدر نہیں کی؟''

اس کے اس بیباک انداز پر میں حیران رہ گئی۔

''بچے کتنے ہیں؟''اس نے میرے سنبھلنے سے پہلے دوسرا سوال کر دیا۔

''دو۔''میں نے مختصر جواب دیا

''گھر کیوں چھوڑا؟''وہ باقاعدہ کسی وکیل کی طرح جرح کر رہی تھی اور میں اس کی اس کڑی تنقید سے جز بز ہو رہی تھی۔

''شوہر جابر تھا،سختی کرتا تھا۔''میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''کیوں سختی کرتا تھا؟''اس کے اس سوال پر میں نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگی اور قدرے نرمی سے پھر اپنا سوال دہرایا۔میرے خاموش رہنے پر بولی۔

''دیکھو لڑکی! کوئی بھی شوہر بلاوجہ اپنی بیوی پر سختی نہیں کرتا۔یقیناً اس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ضرور ہوتی ہے۔''اس نے اپنی بات مکمل کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ہلکا ہلکا دائیں بائیں جھولنے لگی۔نگاہیں ابھی تک میرے چہرے پر جمی تھیں۔انداز ایسا تھا جیسا کہ وہ میرا جواب میرے منہ سے سننے کی منتظر ہو۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔میرا شوہر پہلے مجھ پر سختی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی پابندی عائد کرتا تھا۔یہ تو...''میں رک گئی کیونکہ اپنی بات کو جاری رکھنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

''جب تم نے اپنے عاشق کے ساتھ رابطہ بڑھایا تو تمہارے شوہر کو تمہارے اس ناجائز تعلق کا پتا چل گیا اور اس کا رویہ تم سے

بدل گیا۔اس نے تم پر پابندیاں عائد کر دیں۔کیوں ایسا ہی ہوا تھا نا؟''اس نے تصدیق طلب نگاہ سے میری طرف دیکھا۔میں جو اس کی فراست پر حیران رہ گئی تھی ،فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ تم پر کیوں پابندیاں لگاتا تھا؟ کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تم نے؟''

میں نے ہونقوں کی طرح اپنا سر نفی میں ہلایا تو وہ آگے کی طرف جھکی ،اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکائیں اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی

''اس لئے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا تھا۔تمہیں کھونے سے ڈرتا تھا۔''اس کی یہ بات سن کر میرا دل گھبرانے لگا۔

''میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔آپ مجھے مزید ہراساں کر رہی ہیں۔''میں نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''جانتی ہوں ،میری باتیں اس وقت تمہیں بہت ناگوار لگ رہی ہیں۔یہ کم بخت عشق چیز ہی ایسی ہے۔عقل و شعور جیسی ہر شے کو سلب کر لیتا ہے۔''

وہ اپنی کرسی سے اٹھ گئی۔

''چلو آؤ میرے ساتھ !تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔''

وہ باہر کی طرف چلنے لگی اور میں بھی اس کے پیچھے بیگ اٹھائے چلنے لگی۔

☆......☆......☆

کچھ راہداریوں سے گزر کر ہم ایک کمرے کے سامنے آن رکیں۔یہاں بہت سے کمرے تھے۔ہر کمرے کے دروازے پر اس کا نمبر آویزاں تھا۔اس کمرے کے دروازے کی پیشانی پر پر بھی سات کا ہندسہ چپکا ہوا تھا۔

میڈم نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔دروازہ کھلا تو سامنے بیڈ پر لیٹی ایک لڑکی سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ہمیں دیکھ کر اس نے سگریٹ پاس پڑے ہوئے ایش ٹرے میں مسل دی اور الرٹ ہو کر بیٹھ گئی۔

''نوشی !یہ تمہاری نئی روم میٹ ''مہر بانو'' ہے۔یہ یہاں صرف چند ماہ ہی رہے گی۔امید ہے تم لوگوں کا آپس میں اچھا وقت گزرے گا۔''

''شیور میڈم۔''اس نے خوش دلی سے میڈم کو جواب دیا۔

''روزی کہاں ہے؟''میڈم نے پوچھا

''واش روم میں۔''نوشی نے واش روم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''اچھا بانو! تم آرام کرو۔کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہنا۔آخر تم چودھری فیصل کی خصوصی مہمان ہو۔'' آخری فقرہ بولتے ہوئے میڈم کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔

''جی ضرور۔'' میں نے سوکھے ہونٹوں کو زبان پھیر کر تر کیا۔

میڈم چلی گئی تو میں نے سکون بھری گہری سانس خارج کی۔ بیگ زمین پر رکھا اور کمرے کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔درمیانے سائز کے اس کمرے میں قطار میں ترتیب سے تین سنگل بیڈ رکھے ہوئے تھے۔ ہر بیڈ کے ساتھ ایک سائیڈ ٹیبل موجود تھی۔جس کے درازوں میں سونے والی اپنی ذاتی استعمال کی چیزیں وغیرہ رکھ سکتی تھیں۔

میں کونے والے بیڈ کی طرف بڑھی اور اس پر بیٹھ گئی۔نوشی میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی مگر میں اس کی طرف دیکھنے سے حتی الامکان کترا رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ مجھ سے بے تکلف ہو اور میڈم کی طرح تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ کر دے۔

میں بیڈ کے کرائن سے ٹیک لگائے ٹانگیں اوپر کر کے نیم دراز ہو گئی۔ اتنے میں روزی صاحبہ بھی واش روم سے برآمد ہو گئی۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو ایک لحظے کے لئے ٹھٹک گئی۔ پھر اشاروں سے نوشی کو میرے متعلق پوچھنے لگی۔نوشی نے اشاروں میں جواب دینے کی بجائے با آواز بلند کہا کہ

''ہماری نئی روم میٹ ہیں۔مہربانو۔''

روزی نے میرے قریب آ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔تھوڑی دیر میں ہی ان کے دوستانہ رویے نے میری جھجک کافی حد تک ختم کر دی تھی۔

نوشی نے روزی سے کہا۔

''بھئی ہماری نئی روم میٹ آئی ہیں۔ان کے کھانے کے لئے کچھ منگواؤ۔''

''نہیں رہنے دیں۔کسی تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر روزی باہر نکل گئی۔

''تکلف تو تم کر رہی ہو یار۔یہ کھانا پینا تو چلتا رہتا ہے۔'' اس نے ایک آنکھ میچ کر قہقہہ لگایا تو میں جھینپ گئی۔

''ویسے ہو تم بہت خوبصورت... اگر میں مرد ہوتی تو پہلی ہی نظر میں لٹو ہو چکی ہوتی تم پر۔''

وہ پھر سے ہنسنے لگی اور میں بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔تھوڑی دیر بعد ہی ہوسٹل کی آیا ان کا مطلوبہ سامان دے گئی۔اس میں دہی بڑے،سموسے اور کوک شامل تھی۔

کھانے کے دوران بھی ہم تینوں میں ہلکی پھلکی بات چیت جاری رہی۔مختصر سا تعارف آپس میں ہو چکا تھا۔کھانے سے فارغ ہو کر میں نے فوزیہ کا نمبر ملایا۔بیل جا رہی تھی۔آخر اس نے کال اٹینڈ کی۔

''ہیلو فوزیہ۔'' میں دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

''کہاں ہو تم بانو؟'' وہ پرجوش لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''فوزیہ! تم میرا نام مت لو۔ اور یہ بتاؤ تمہارے پاس اس وقت کون ہے؟''

''او کے۔ اب دوبارہ تمہیں، تمہارے نام سے مخاطب نہیں کروں گی۔ اور گھر میں اس وقت میں بالکل اکیلی ہوں۔ اماں تمہاری اماں کے پاس بیٹھی رہتی ہیں۔ ان کا بہت برا حال ہے۔ رو رو کے بیمار پڑ چکی ہیں۔''

''اور ابا؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''چاچا کی حالت تو ان سے بھی زیادہ نازک ہے۔ وہ تو رو دھو کے دل ہلکا کر لیتی ہیں مگر وہ بیچارے تو بالکل چپ ہو گئے ہیں۔ گم صم سے لیٹے رہتے ہیں۔ تمہیں ہاہ لگ جائے گی ان دونوں کی۔ تم اس حد تک چلی جاؤ گی بانو۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں تو اس وقت کو پچھتا رہی ہوں جب تمہیں فون دے کر آئی تھی۔ نہ تمہیں فون دیتی اور نہ تم اس حد تک جاتی۔'' وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہی تھی۔

''فوزیہ! تم نہیں جانتی۔ میرا جینا دوبھر کر دیا تھا اس کم ظرف انسان نے۔'' میں اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر روہانسی ہو گئی۔

''اپنے بچوں کا خیال بھی نہ کیا تم نے کہ تمہارے بغیر کیسے رہیں گے وہ؟ ماں کے نام پر کلنک کا دھبہ بن چکی ہو تم۔''

''او کے فوزیہ۔ تمہاری یہ نفرت بھی سر آنکھوں پر۔'' میں فون بند کر کے رونے لگی۔

وہ دونوں دور بیٹھی اداس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ نوشی اٹھ کر میرے پاس آئی۔ میرے سامنے بیٹھ کر بولی۔

''دیکھو بانو! جب عورت اپنے گھر کی دہلیز پھلانگتی ہے تو پیچھے کبھی مڑ کر نہ دیکھنے کے لئے۔ تم سب کو جیتے جی مار کر گھر سے نکلی ہو۔ اب وہ تمہارے لئے مر چکے ہیں اور تم ان کے لئے مر چکی ہو۔ واپسی کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھو گی تو خود کو اذیت میں مبتلا کرتی رہو گی۔ بھول جاؤ ان کو، جن کو چھوڑ آئی ہو۔ بس اب آگے کی طرف دیکھو۔ ابھی قسمت تمہیں آگے کیا کیا دکھاتی ہے۔ اس کے لئے خود کو تیار رکھو۔ اور مضبوط بھی۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے پلکوں کی جنبش سے اپنی باتوں کا یقین دلایا۔ میں نے آنسو پونچھے اور ٹانگیں سمیٹ کر اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

شام تک طبیعت کافی بہل چکی تھی اور شاید دل کو یہ بات سمجھانے میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکی تھی کہ پل کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا ہے۔ اب رونے دھونے اور سوگ منانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ سوائے خرابی صحت کے۔

رات کو بابر کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ بڑے قابل وکیل کا بندوبست کر لیا ہے۔ ایک دو دن تک ناصر کو نوٹس پہنچ جائے گا۔ اس نے یہ تاکید بھی کی کہ کسی کو بھول کر بھی اس ہوسٹل کا ایڈریس مت دینا۔ میں نے فوزیہ سے ہونے والی گفتگو کا ذکر گول کر دیا اور اس کی باتوں

پر ہوں ہاں کرتی رہی۔

''یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے نا؟''

''نہیں۔''میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''گڈ! بس خوش رہا کرو۔ اداس مت ہوا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ ساری اداسیاں بھول جاؤ گی۔''

میں خاموش رہی تو اس نے چند باتیں اور کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

اگلا ایک ماہ بہت ہنگامی صورت میں گزرا۔ فیصل نے ایک بہت قابل وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جس نے اپنی قابلیت کا لوہا منواتے ہوئے ایک مہینے کے اندر میری ناصر سے گلوخلاصی کروادی۔

دو تین عدالتی نوٹس بھجوائے جانے کے باوجود ناصر عدالت میں حاضر نہ ہوا تو عدالت نے میرے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ اب میں آزاد تھی۔ میرے پاؤں میں کوئی بیڑی نہ تھی مگر نہیں۔ ابھی ایک دیوار حائل تھی ہم دونوں کے بیچ اور وہ تھی عدت کی دیوار۔

ابھی مجھے ساڑھے تین ماہ مزید یہاں گزارنے تھے۔ بابر اپنے علاقے میں واپس چلا گیا تھا۔ وہ لاہور کے مضافات میں رہتا تھا۔ وہ فیصل کی ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا تھا۔ اس کی فیصل سے دوستی کام کے دوران ہی پروان چڑھی تھی۔ فیصل روایتی چودھریوں کے بر عکس اپنے مل ورکرز کے ساتھ بڑا دوستانہ رویہ رکھتا تھا۔ وہ ایڈونچر پسند طبیعت کا مالک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن میں گھر سے فرار ہوئی تھی۔ اس دن وہ خود گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بابر کے ہمراہ ہماری گلی میں آیا تھا اور اس کے بعد بھی نہ صرف اپنے فارم ہاؤس پر پناہ دی تھی بلکہ بعد میں بھی ہمارے ساتھ رہا تھا اور بابر کی ہر طرح سے قانونی اور مالی معاونت کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر فیصل اتنی بھرپور مدد نہ کرتا تو اتنی آسانی سے یہ سب نہ ہو پاتا۔

بابر واپس چلا گیا تھا مگر ہر ہفتے ملنے کے لئے آتا اور فون پر ہر روز ہم شام کو بات کرتے۔ اب مجھے اپنی عدت کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔

فوزیہ سے بھی وقتاً فوقتاً بات ہو جایا کرتی تھی۔ وہاں کے حالات بھی قدرے معمول پر آنا شروع ہو گئے تھے۔ بچوں کے متعلق وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر تھی کیونکہ ناصر نے بچوں سے ملنے سے منع کر دیا تھا اس کے ننھیال والوں کو۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا اور میری عدت کے دن کم ہوتے چلے گئے۔ یہاں ہوسٹل میں رہتے ہوئے بہت سی باتوں کا پتا چلا۔ مثلاً یہاں لڑکیوں سے جسم فروشی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ اس بات کا فیصلہ میڈم فرح کرتی تھی کہ آج کون سی لڑکی کس پارٹی کے پاس جائے گی۔ سر شام ہی لڑکیاں نہا دھو کر سج سنور جاتیں اور پھر مطلوبہ پارٹی اپنی گاڑی ڈرائیور کے ہمراہ بھیج کر مال منگوا لیتی۔

یہ جیتی جاگتی خوبصورت لڑکیاں مال کی صورت سپلائی کی جاتیں۔ یہ ایک مکروہ رخ تھا اس ہوسٹل کا مگر ساتھ ہی ایک مثبت پہلو بھی سامنے آیا تھا۔ یہاں کسی کے ساتھ زور زبردستی نہیں کی جاتی تھی۔ جو بھی یہ کام کر رہی تھیں اپنی مرضی سے کر رہی تھیں۔

یہاں ایسی لڑکیوں کی بھی کثیر تعداد موجود تھی۔ جو اس دھندے میں ملوث نہیں تھیں۔ وہ دفاتر یا دوسرے اداروں میں باعزت نوکری کر کے اپنے گھر والوں کو پیسے بھیج رہی تھیں۔ میری روم میٹس میں نوشی یہ دھندہ کر رہی تھی کیونکہ حق حلال کی تنخواہ میں اس کا اور اس کے گھر والوں کا گزارہ ناممکن تھا۔

سوڈیڑھ سو کے تو وہ ہر روز سگریٹ پھونک دیتی تھی جبکہ روزی میری طرح گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی تھی۔ محبوب نے چار دن برت کے چھوڑ دیا تو مال غنیمت بن کر لٹنے کی بجائے یہاں آ کر پناہ لی۔ وہ بڑی من موجی اور موڈی لڑکی تھی۔ ہر مہینے دو مہینے بعد جاب بدلتی۔ مردوں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتی۔ ایک وقت میں کئی کئی بوائے فرینڈز رکھتی۔ جس کی جیب خالی ہو جاتی اسے دھتکار دیتی اور پھر سے کوئی نیا شکار ڈھونڈ لیتی۔ اس کے بے پناہ حسن کے سامنے یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہ تھا۔

مجھے تو لگتا کہ وہ اپنے محبوب کی بے وفائی کا بدلہ دوسرے مردوں سے لیتی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ حسن کی اس پونجی کو وہ جس بیدردی سے لٹا رہی ہے، جلدی ہی عمر کی تجوری سے یہ دولت ختم ہو جائے گی۔ تب کیا کرے گی۔ ایک سسکتا ہوا اذیت ناک بڑھاپا اس پر چڑھ دوڑے گا جس سے فرار پانا ناممکن ہوگا۔

☆......☆......☆

آج بھی کمرے میں بیٹھی اپنے بچوں کو یاد کر رہی تھی۔ نجانے کس حال میں ہوں گے۔ اب تو رو دھو کر معصوموں نے صبر بھی کر لیا ہوگا۔ کل فوزیہ سے التجا کی تھی کہ پلیز میرے بچوں کو ان کے اسکول جا کر مل کے آئے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ دونوں کیسے ہیں، کس حال میں ہیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی فوزیہ کا نمبر ملانے لگی۔

''ہیلو فوزیہ! کیسی ہو؟ بچوں سے ملنے گئی تھی؟'' میں نے بیتابی سے پوچھا۔

''ہاں۔ گئی تھی۔ ٹھیک ہیں دونوں۔'' وہ بجھی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا کہتے تھے؟ مجھے یاد کرتے ہیں نا؟''

''نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ہماری امی فوت ہو چکی ہیں۔'' فوزیہ کی آواز بھرا گئی۔

''کیا؟'' میرے سینے میں جیسے چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے بچے میرے بارے میں ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' میرے لہجے میں نمی گھلنے لگی۔

''ان کی دادی اور باپ نے انہیں یہی سکھایا ہے اور میرے خیال میں یہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ مرے ہوؤں پر صبر آ جاتا

ہے جبکہ زندہ لوگ ہر وقت انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھتے ہیں۔ مرنے والوں کے واپس آنے کا انتظار تو نہیں ہوتا نا۔''

فوزیہ کی باتیں میرے جگر کو چھلنی کر رہی تھیں۔ میں فون بند کر کے بھی کتنی ہی دیر تک روتی رہی۔

☆......☆......☆

میں ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی جب آیا نے اطلاع دی کہ آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ یقیناً بابر ملنے آیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کون ملنے آسکتا تھا بھلا؟ میں آیا کے پیچھے چلتے ہوئے آفس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ باہر رک گئی اور میں سیدھی اندر چلی گئی۔ اندر میڈم فرح کے سامنے اس وقت فیصل بیٹھا کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ میں اندر آئی تو دونوں میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں فیصل کو اچانک سامنے دیکھ کر سٹپٹا گئی۔ فوراً چادر کے پلو سے چہرے کو ڈھانپا اور نظریں نیچی کیئے اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہیں؟'' اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

''یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا آپ سے ملتا چلوں۔ آپ کی خیریت ہی دریافت کرتا چلوں۔''

''آپ کو یہاں مجھ سے ملنے نہیں آنا چاہیے تھا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''کیوں؟'' اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''میں عدت میں ہوں۔ کسی بھی غیر محرم سے میرا ملنا جلنا مناسب نہیں ہے۔'' میرا لہجہ پرسکون تھا۔

''اوہ! سوری... اس بات کا بالکل بھی خیال نہیں رہا۔ معافی چاہتا ہوں۔ اوکے۔ میں چلتا ہوں۔'' وہ شاید اپنی خفت مٹانے کی خاطر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد میڈم فرح نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''بھئی مان گئی تمہیں۔ کیسا لا جواب کر دیا چھوٹے چودھری کو تم نے۔'' اس کا لہجہ شاباشی دیتا ہوا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے میڈم! میرا مقصد چودھری صاحب کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ بس مجھے اچھا نہیں لگا کہ وہ بابر کی غیر موجودگی میں مجھ سے ملنے چلے آئے۔ اتنی سی حوصلہ شکنی تو بنتی تھی ورنہ تو میں ان کی دل سے عزت کرتی ہوں۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔'' میرے لہجے سے فیصل کے لئے تشکر چھلک رہا تھا۔

''ہمم! اب آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟'' میڈم نے حسب عادت کرسی پر جھولتے ہوئے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے۔ عدت پوری ہوتے ہی بابر سے نکاح کروں گی۔''

''بانو! کیا تمہیں یقین ہے کہ بابر زندگی بھر تمہارا ساتھ نبھائے گا۔ کبھی بیچ راہ میں نہیں چھوڑے گا؟'' وہ اب کھوجتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے میڈم! بابر کبھی مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔"

میری بات سن کر وہ مسکرانے لگی۔

"مجھے بھی کبھی کسی نے ایسی ہی وفا کا یقین دلایا تھا اور میں بھی تمہاری طرح اس کی ہر بات پر ایسے ہی یقین لے آیا کرتی تھی آنکھیں بند کر کے۔ جیسا کہ تم۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو تکنے لگی۔

"پھر کیا ہوا میڈم؟" میں اس کی بات سن کر افسردہ سی ہوگئی۔

"پھر کیا؟ پہلے وہ میری دلالی کرتا رہا اور اب میں دوسری عورتوں کے جسموں کی دلالی کرتی ہوں۔" وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔

"مت کیا کریں یہ مکروہ کام۔ کیا آپ کو گھن محسوس نہیں ہوتی۔"

"تو کیا کروں؟ جو اس ہوسٹل کو چلانے کے لئے خطیر رقم ڈونیٹ کرتے ہیں، انہیں راضی رکھنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ اور پھر یہاں کون سا زور زبردستی کی جاتی ہے۔ ہر کوئی اپنی خوشی سے اس سسٹم کا حصہ بنا ہوا ہے۔ لڑکیوں کو باقاعدہ بھاری رقوم کے بدلے خریدا جاتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے اپنے قدموں پر چل کر جاتی ہیں۔"

"میڈم! ایک بات پوچھوں؟ فیصل بھی ان مخیّر حضرات میں شامل ہے جو اس ہوسٹل کو وظیفہ دیتے ہیں؟"

"تمہیں میرے اب تک کے رویے سے یہ بات سمجھ جانی چاہیے تھی۔ اس کا باپ تو سب سے زیادہ حصہ ڈالتا ہے اور اسی حساب سے اپنا حصہ وصول بھی کرتا ہے۔"

"اور فیصل؟" دل کی بات لبوں تک آ گئی۔

"سچ پوچھو تو اب فیصل اپنے باپ کی گدی سنبھال چکا ہے۔ بڑے چودھری کو تو شوگر نے اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ دیمک کے طرح چاٹ گئی ان کی مردانگی اور جوانی کو مگر ابھی تک اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ جب بھی عیاشی کی طلب محسوس ہوتی ہے، ایک دو لڑکیوں کو لے جاتے ہیں اپنے ساتھ فارم ہاؤس پر۔ اور کچھ نہیں تو ساری ساری رات ٹانگیں ہی دبواتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر میڈم نے قہقہہ لگایا تو میں بھی مسکرانے لگی اور پھر آنکھوں کے سامنے فارم ہاؤس کے کمرے کے دیوار گیر شوکیس میں رکھی ہوئی رنگ برنگی ولایتی شراب کی بوتلیں لہرانے لگیں۔

"میڈم! کبھی آپ بھی بڑے چودھری کے ساتھ فارم ہاؤس پر گئی ہیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے یہ سوال بھی پوچھ لیا۔

وہ شرارت آنکھوں میں بھر کے میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟ آج ہر معاملے سے پردہ ہٹانے پر کمربستہ دکھائی دے رہی ہو۔"

"بتائیں نا۔" میں نے بچوں کی طرح ضد کی۔

''ہاں بابا، متعدد مرتبہ جا چکی ہوں۔مگر یہ کافی پرانی بات ہے۔اب تو نہ میں جوان رہی اور نہ ہی چودھری جوانمرد۔''

''خیر اب ایسی بات بھی نہیں۔آپ ابھی تک جوان اور پر کشش دکھائی دیتی ہیں۔'' میں نے دل سے تعریف کی جو یقیناً میڈم کو بہت اچھی لگی تھی۔یہ بات اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں تھی۔اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کافی دیر سے میڈم فرح کا دماغ کھا رہی ہوں۔میں جانے کے لئے کھڑی ہوگئی۔

''اوکے میڈم! چلتی ہوں۔''

''ہاں میری جان! جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ایک بات کہوں بانو؟''

''جی میڈم! بلا جھجک کہہ دیں۔آپ مجھ سے ہر قسم کی بات کر سکتی ہیں۔'' میں نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''بانو! میرا دل کہتا ہے کہ تمہیں بھی میری طرح دھوکہ ہی ملے گا۔اور تم بھی واپس اسی ہوسٹل میں آؤ گی۔اللہ کرے میرا یہ اندازہ کبھی سچ ثابت نہ ہو۔'' آخری فقرہ اس نے یقیناً میرا دل رکھنے کے لئے ادا کیا تھا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا میڈم! یہ فقط آپ کا وہم ہے۔'' میں پورے یقین سے بولی۔

''اللہ کرے یہ میرا وہم ہی ہو۔'' میڈم نے گویا مجھے دعا دی اور میں میڈم کے آفس سے باہر آ گئی۔طویل راہداری میں چلتے ہوئے میڈم کی قیاس آرائیاں میرے دماغ میں گونج رہی تھیں۔

☆......☆......☆

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جس کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔میری عدت پوری ہونے کے دوسرے ہی دن بابر، فیصل کو ساتھ لئے اس کی گاڑی میں آن پہنچا۔مجھے اس نے ایک دن پہلے ہی انفارم کر دیا تھا۔اس لئے میں صبح سے ہی تیار بیٹھی اس کی منتظر تھی۔میڈم نے مجھے گلے لگا کر ڈھیر ساری دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیا۔

وہاں سے نکلتے ہی ہمارا رخ عدالت کی طرف تھا۔وہاں پہنچے۔کورٹ میرج کی۔فیصل نے گواہ بننے کا فرض بھی ادا کیا۔ایک گواہ کا بندوبست وہاں سے ہی کر لیا گیا۔شام کے چار بج رہے تھے جب فیصل نے اپنی گاڑی میں ہمیں بابر کے گھر کے دوازے کے آگے ڈراپ کیا۔

میں نے سارا دن اپنے چہرے اور جسم کو چادر سے چھپائے رکھا۔گاڑی سے اترتے ہوئے دل کی عجیب سی حالت تھی۔بابر نے فیصل کو گھر کے اندر آنے کی دعوت دی مگر اس نے مسکرا کر ٹال دی اور بولا کہ میں اب فیکٹری جاؤں گا۔تب مجھے یاد آیا کہ فیکٹری یہاں سے قریب ہی ہے۔

''چودھری صاحب! سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے ان احسانوں کا بدلہ کیسے چکا پاؤں گا۔'' بابر نے نیچے جھک کر فیصل کو مخاطب کیا۔

''کوئی احسان نہیں کیا میں نے۔ دو محبت کرنے والوں کو ملا دیا بس۔''

''پھر بھی اندر تو آئیں نا۔ ایک کپ چائے کا ہو جائے۔'' بابر نے بھرپور اصرار کیا مگر اس نے ٹال دیا۔

''نہیں یار! آج نہیں آج تم بھی اوپری دل سے کہہ رہے ہو۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے شرارت آمیز قہقہہ لگایا۔

''جلدی ہی آؤں گا۔ بھابی کے ہاتھ کی چائے پینے۔ اللہ حافظ۔'' اس نے گاڑی آگے بڑھائی تو ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ میرا دل انجانے اندیشوں سے لرز رہا تھا۔ پتا نہیں بابر کی ماں میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ بابر نے اسے کن لفظوں میں میرا تعارف کروایا ہوگا۔

بابر نے دروازے پر دستک دی تو میں اضطراری حالت میں اس بند دروازے کو گھورنے لگی جس کے پیچھے یقیناً ایک چڑچڑی اور دبنگ سی بڑھیا موجود تھی جس نے دروازہ کھولتے ہی منہ سے آگ برسانا شروع کر دینی تھی۔

دروازہ کھلا تو میں اپنے سامنے ایک کم عمر اور خوش شکل نوجوان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا اور ایک طرف ہو کر ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ ہم اندر آئے تو ایک اور لڑکا ایک کمرے سے مسکراتا ہوا برآمد ہوا۔

''شادی مبارک ہو بابر بھائی۔'' اس نے گرمجوشی سے آگے بڑھ کر بابر سے مصافحہ کیا۔

''خیر مبارک۔'' بابر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''کام ہو گیا؟'' بابر نے پوچھا۔

''جی بابر بھائی! آپ بیشک اندر جا کر چیک کر لیں۔ تسلی ہونے کے بعد پیسے ادا کیجئے گا۔ ذ ذ

''نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔'' بابر نے جیب سے والٹ نکالا۔ انہیں ادائیگی کی تو وہ سلام کرتے ہوئے گھر رخصت ہو گئے۔

میں حیران نظروں سے کھڑی یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ ان کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں اور پھر ابھی تک اپنی نئی ساس کے درشن نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات بھی ذہن میں کھٹک رہی تھی۔

ان دونوں لڑکوں کے جانے کے بعد بابر نے بیرونی دروازے کو مقفل کیا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ مجھے حیران کھڑی دیکھ کر مسکرایا۔ آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور ایک کمرے کی طرف چلنے لگا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو تازہ گلابوں کی بھینی بھینی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے بیڈ پر لگی تازہ گلاب کے پھولوں سے تیار کردہ اس مسہری کو دیکھ رہی تھی جس کی مسحور کن خوشبو سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ اب بات میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ لڑکے اس کمرے میں کیا کر رہے تھے اور بابر نے انہیں کس بات کی ادائیگی کی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' بابر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کچھ نہیں! یہ سب کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔ اس وقت خیالوں

میں ناصر کے ساتھ بتائی ہوئی سہاگ رات لہرانے لگی۔کاغذی پھول پھڑ پھڑانے لگے۔ناصر نے میرے مقابل آ کر اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی کو چھو کر چہرہ اوپر اٹھایا۔

''کیا اچھی نہیں لگی؟''اس نے خمار آلود لہجے میں سرگوشی کی۔میں نے نظریں اٹھائیں اس کا چہرہ وفورِ جذبات سے دمک رہا تھا۔

''ابھی ایک سرپرائز اور ہے۔''اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ایک ڈبہ اٹھایا اور میری طرف بڑھایا۔

''اس میں کیا ہے؟''میں ہونق نظروں سے اس ڈبے کو دیکھ رہی تھی۔

''اس میں تمہارا عروسی جوڑا ہے۔جلدی سے زیب تن کر کے دکھاؤ مجھے۔دلہن کے روپ میں دیکھنے کی حسرت کب سے دل میں دبائے بیٹھا ہوں۔''وہ شوخ لہجے میں بولا۔

''مگر بابر! مت بھولو کہ یہ میری پہلی شادی نہیں ہے۔''میں نے احتجاج کیا۔

''بانو! تم بھی بھول رہی ہو یہ بات کہ یہ میری پہلی شادی ہے۔میرے دل میں بڑے ارمان ہیں۔اور تم ان ارمانوں پر اوس نہیں گرا سکتی۔''وہ شوخ نظروں سے مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''مگر...''

''کوئی اگر مگر نہیں سنوں گا۔شرافت سے کپڑے بدلو... ورنہ۔''وہ فقرہ ادھورہ چھوڑ کر شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔میں ڈبہ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر کھوجتی ہوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

''کیا ہوا؟''وہ میری اضطراری حالت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''میں کپڑے کہاں تبدیل کروں؟''میں نے بیچارگی سے پوچھا تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

''یہیں بدل لو... یہاں کیا مسئلہ ہے؟''اس نے بڑی معصومیت سے مشورہ دیا۔

''یہاں؟ تمہارے سامنے؟''میں نے تیزی سے پوچھا۔

''تو اس میں کیا حرج ہے؟ تم میری بیوی ہو اب۔ہمارا باقاعدہ نکاح ہو چکا ہے۔''اس نے دلیل دی۔

''کچھ بھی ہو... میں تمہارے سامنے لباس چینج نہیں کروں گی۔''میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا تو وہ بولا۔

''اوکے مائی ڈئیر۔میں کچھ دیر کے لئے باہر صحن میں جا رہا ہوں۔تم لباس چینج کر لو۔اور ہاں وہاں ڈریسنگ ٹیبل پر تھوڑا آرٹیفیشل زیور اور میک اپ کا سامان بھی پڑا ہوا ہے۔میں چاہتا ہوں جب میں دوبارہ اندر آؤں تو مجھے میری دلہن بالکل تیار ملے۔تمہارا یہ روپ ہمیشہ کے لئے نظروں میں جذب کر کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں محفوظ کر کے رکھ لوں گا۔''

''اوکے، بس بس۔یہ ڈائیلاگ بازی بند کریں اور باہر تشریف لے جائیں۔''میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے دروازے سے

باہر دھکیل کر دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

☆......☆......☆

پندرہ بیس منٹ بعد میں سرخ عروسی کامدار جوڑا زیب تن کیئے سنگھار شیشے کے سامنے بیٹھی اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ بلاشبہ اس نفیس اور قیمتی جوڑے زیورات اور میک اپ نے میرے حسن اور رعنائی کو دوآتشہ کر دیا تھا مگر میرا چہرہ اس الوہی نور اور خوشی سے عاری تھا جو ایک نئی نویلی دلہن کے چہرے کا خاصا ہوا کرتا ہے۔ اس کی جگہ ایک عجیب سے حزن و ملال نے بسیرا کیا ہوا تھا۔

ہر عورت زندگی میں ایک مرتبہ دلہن بنتی ہے جبکہ میں دوسری مرتبہ دلہن بنی اپنے دوسرے دلہے کا انتظار کر رہی تھی۔ میری آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو چھلکے اور میک اپ کی دبیز تہہ سے پھسلتے ہوئے گود میں رکھے ہوئے ہاتھوں پر گرنے لگے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''جاؤ، جا کر دروازہ کھولو۔ تمہارا دوسرا دلہا تمہارے قرب سے لطف اندوز ہونے کے لئے بے چین ہے۔'' آئینے میں بیٹھی لہن نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

''ایک مرد کو چھوڑ کر دوسرے مرد کا پہلو گرمانا یہ شریف عورتوں کا وصف نہیں۔''

''بکواس بند کرو۔ میں ایک شریف اور باحیا عورت ہوں۔'' میں نے اس آئینے والی کو ڈپٹ دیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار آواز میں قہقہے لگانے لگی۔

''اگر اتنی ہی عزت دار اور شریف ہوتی تو شوہر کو دھوکہ دے کر یار کے ساتھ رات کے اندھیرے میں گھر سے چوروں کی طرح فرار نہ ہوتی۔'' اس کے ہذیانی قہقہوں میں شدت پیدا ہوتی گئی۔

میں اپنے ہاتھ دونوں کانوں پر رکھ کے کراہی۔

''خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔''

اسی اثنا میں دروازے پر پھر سے دستک ہوئی۔ میں نے آنسو پونچھے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

☆......☆......☆

صبح آنکھ کھلی تو سامنے لگا دیوار گیر کلاک صبح کے نو بجا رہا تھا۔ چند منٹ پھولوں کی لڑیوں کو جھولتے ہوئے دیکھتی رہی پھر گردن موڑ کر پاس سوئے ہوئے بابر کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک بے سدھ سویا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پرسکون اور آسودہ تھا۔

مجھے بیتی ہوئی رات کی باتیں یاد آنے لگیں۔ بابر کی وارفتگیاں اور مدہوشیاں۔ اس کا پیار کرنے کا انداز سب کچھ ہی تو بہت نیا اور انوکھا تھا۔ اس کا ہر وار بڑا اقاتلانہ اور لذت انگیز تھا۔ ایسی لذت جس سے پہلے کبھی روشناس نہ ہوئی تھی۔ کیف و نشاط کے وہ لمحات ذہن میں

تازہ ہوئے تو وجود پر پھر سے سرور آور کیفیت طاری ہونے لگی۔

میں نے خود کو کنٹرول کیا اور کپڑے درست کر کے بیڈ سے نیچے اتر گئی۔ واش روم جو کمرے سے منسلک تھا۔ اس کا رخ کیا۔ نہا کر باہر نکلی تو وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ میں قد آدم آئینے کے سامنے رکھے سٹول پر بیٹھ کر ہیئر برش سے اپنے لمبے گھنے بال سلجھانے لگی۔

بال سلجھاتے سلجھاتے نظر آئینے کے اس پار پڑی تو دیکھا کہ بابر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے دلچسپ نگاہ سے میری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔ آئینے میں نظریں چار ہوئیں تو اس نے بڑے لوفرانہ اسٹائل میں ایک ہوائی بوسہ میری طرف اچھالا۔ میں جھینپ کر مسکرانے لگی۔ پھر سے نظریں اٹھا کر شیشے میں دیکھا تو وہ مجھے انگلی کے اشارے سے پاس بلا رہا تھا۔

میں نے ایک ادا سے گردن نفی میں پھیری تو وہ مسکرانے لگا۔

''بانو! میری جان... تمہارا شوہر تمہیں پاس بلا رہا ہے اور تم انکار کر رہی ہو۔ جانتی ہو نا۔ شوہر کی کسی بات کو ماننے سے انکار کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔'' اس کے لہجے سے شرارت چھلک رہی تھی۔

''نہیں آؤں گی۔''

''ہونہہ۔ ضدی بچی! آؤ نا۔'' اس نے ضد کی تو میں اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔

''اور پاس آؤ نا۔'' وہ مخمور لہجے میں بولا تو میں نے بالکل اس کے قریب ہو کر سر کو جھکا کر گیلے بال اس کے چہرے پر بکھرا دیئے۔

''آہا۔ عورت کے گیلے بال مجھے ہمیشہ سے بہت پسند رہے ہیں۔'' وہ بالوں کو چومنے لگا۔ میں پیچھے ہٹ گئی۔

''اٹھ کر غسل وغیرہ کر واور میرے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ آخر کوئی نویلی دلہن ہوں۔'' میں اٹھلا کر بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

''جو حکم جناب کا۔''

☆......☆......☆

''تمہاری امی کہاں ہیں؟ کل سے تین مرتبہ یہ سوال کر چکی ہوں مگر بات کو گول کر جاتے ہو۔'' ناشتہ کرتے ہوئے پھر سے یہ سوال نوک زبان پر آ گیا۔

بابر بازار سے حلوہ پوری لے آیا تھا اور چائے میں نے گھر میں ہی بنالی تھی۔

''اماں، خالہ کے گھر گئی ہیں۔ بلکہ یوں سمجھو کہ زبردستی بھیجا ہے انہیں۔ میں یہ چند دن تمہارے ساتھ بالکل تنہائی میں گزارنا چاہتا تھا۔''

''کیا اماں کو ہماری شادی کے متعلق بتایا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ان کو بتا کر مرنا تھا میں نے؟'' وہ ہنسنے لگا۔

''کیا بہت سخت مزاج کی ہیں؟'' میں فکر مند ہو گئی۔ نوالہ منہ میں پھونسنے لگا۔

''تو اور کیا! ایکدم کڑک اور سپاہیانہ مزاج کی مالک ہیں۔ اور پھر میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ کئی ارمان دل میں دبائے بیٹھی ہوں گی۔'' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

مگر میں فکروں میں گھری یہی سوچ رہی تھی کہ ہر بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہی مجھے کیوں ملتا ہے۔ بیوہ ماں اکلوتے بیٹے کا سایہ بن کر زندگی گزارتی ہیں۔ نہ خود جیتی ہیں اور نہ بیٹے کو ڈھنگ سے جینے دیتی ہیں۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' بابر مجھے فکرمند دیکھ کر قدرے سنجیدہ ہو گیا۔

''کچھ نہیں۔'' میں بے دلی سے مسکرائی۔ ''سوچ رہی ہوں اگر وہ ہماری شادی سے لاعلم ہیں تو گھر واپس آتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔''

''دیکھا جائے گا جو ہوگا۔ پہلے سے سوچ سوچ کر کیوں ہلکان ہوتے رہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''مگر مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے بابر... نجانے کیا ہنگامہ کھڑا کر دیں۔''

''کرنے دو۔ کتنی دیر تک ناراض رہیں گی۔ آخر ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ انہیں ماننا ہی پڑے گا۔''

اس کی دلیلوں کے سامنے میں نے خاموشی اختیار کر لی مگر دل میں کئی اندیشے سر اٹھانے لگے۔

☆......☆......☆

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بڑی بی نے گھر میں داخل ہوتے ہی پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔

میں اس وقت صحن میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی جب بیرونی دروازے کو کھٹکھٹایا گیا۔ بابر کسی کام سے باہر گیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر دروازہ کھول دیا کہ یقیناً بابر ہی ہوگا مگر دروازہ کھولتے ہی ایک صحت منداور بھاری بھرکم بزرگ خاتون کو سامنے کھڑا دیکھا تو فوراً سمجھ گئی کہ بابر کی اماں حضور واپس تشریف لے آئی ہیں۔

بڑی بی واقعی بڑی دبنگ شخصیت کی مالک تھیں۔ سر کے مہندی رنگے لال بال چہرے کی سرخ و سفید رنگت سے خوب میل کھا رہے تھے اور بڑی بڑی آنکھوں سے جاہ وحشمت ٹپک رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' اس نے موٹی آنکھوں سے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔

''مم میں...'' میں ہکلانے لگی۔

''میں، میں کیا لگا رکھی ہے......سیدھی طرح میری بات کا جواب دو۔'' اب وہ صحن میں کھڑی کٹی ہوئی سبزی کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''میں پوچھتی ہوں، کب سے ہو یہاں؟ اور کس حیثیت سے رہ رہی ہو؟''

''اماں! یہ تمہاری بہو ہے۔'' یہ فقرہ اماں کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند پڑا۔ اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔

بابر پرسکون انداز میں ہاتھ باندھے کھڑا ہم دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کیا مذاق کر رہے ہو تم؟ یہ میری بہو کیسے ہو سکتی ہے؟'' اماں نے بے یقینی سے بابر کی طرف دیکھا۔

بابر آگے بڑھ کر اماں کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''اماں! پلیز حوصلے سے میری بات سنیں۔ میں نے اس سے کورٹ میرج کر کے اسے اپنی بیوی بنایا ہے۔ یہ اب آپ کی بہو ہے۔ یقین کریں... بانو بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ کو کبھی اس سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس نے اپنی طرف سے اماں کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔

اماں کچھ دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑی اس کی باتوں پر غور کرتی رہی مگر اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر ہذیانی انداز میں چیخنے چلانے لگی۔ وہ اونچی آواز میں مجھے گالیوں اور کوسنوں سے نوازنے لگی۔ اس کی نظر میں میرا جرم اس کے بیٹے سے کہیں زیادہ سنگین تھا کیونکہ میں عورت تھی اور وہ مرد۔ اور میں اسے ورغلا کر اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر اس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اس کو اس کی ماں کی نافرمانی پر مجبور کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر تک چیخنے چلانے کے بعد بڑھیا چارپائی پر گر کر ہانپنے لگی۔ اس کی دیو سائز جسامت لرز رہی تھی۔ بابر بھاگ کر گیا اور کچن سے پانی کا گلاس لا کر ماں کے منہ سے لگا دیا جبکہ میں پاس سر جھکائے بیٹھی روتی رہی۔ بابر کی ماں کے خنجر نما جملوں کی کاٹ نے جسم وروح پر گہرے چرکے لگائے تھے۔

پانی پی کر اماں اب گہرے گہرے سانس لے رہی تھی پھر اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور بولی۔

''کون ہے یہ؟ کہاں سے بھگا کر لائے ہو اسے؟'' اب کی بار اس کا لہجہ قدرے شانت تھا۔

''اماں! یہ بانو ہے۔۔ تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ میری بیوی اور تمہاری بہو ہے اور بہت اچھی لڑکی ہے۔ تمہاری بہت خدمت کرے گی۔ اس بات کو چھوڑو کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔'' بابر نے لجاجت سے بات مکمل کی اور ماں کا بازو دبانے لگا۔

اماں نے اس کی تقریر کے جواب میں خاموشی اختیار کی اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''اماں دل کی بری نہیں ہے۔ بس زبان کی ذرا کڑوی ہے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔'' بابر نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑے تو میں روتے روتے مسکرا دی اور اس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔

''گڈ گرل... یہ ہوئی نا بات۔ بانو! تم سچ میں بہت اچھی ہو۔ سیٹھ ناصر بہت بدبخت تھا۔ جس نے تمہاری قدر نہ کی۔''

اس کی بات سن کر میں پھر سے ملول ہو گئی۔

''اچھا تم کھانا بناؤ میں ذرا اماں کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ اس وقت بہت آزردہ ہے۔ میری شادی کو لے کر نجانے کیا کیا سپنے سجا

رکھے تھے آنکھوں میں۔ میں نے اس کے سارے خواب چکنا چور کر دیئے۔''

وہ جاتے جاتے رکا اور بولا۔

''ایک بات ذہن میں رکھنا بانو! اماں کو یہ مت بتانا کہ تم شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہو ورنہ ہتھے سے اکھڑ جائیں گی اور تمہیں کبھی قبول نہیں کریں گی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ اماں کے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا تیار ہو گیا تو میں نے اس کمرے میں جھانکا جہاں بابر ماں کے پاس بیٹھا اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔

''کھانا تیار ہو گیا۔'' میں نے اطلاع دی۔

''چلو اماں اٹھیں، کھانا تیار ہو گیا۔'' بابر نے لہجے میں بڑی محبت سمو کر ماں کو مخاطب کیا۔

''مجھے بھوک نہیں۔'' اماں نے منہ بسور کر جواب دیا۔

''جتنی بھوک ہے، اتنا کھا لیں۔ اٹھیں شاباش۔'' اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

''کہا نا... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ کھانے کا من نہیں ہو رہا۔ تم دونوں کھا لو۔'' اماں کا لہجہ اس بار خاصا درشتی لئے ہوئے تھا۔

''بانو! تم ایسا کرو۔ کھانا یہیں لے آؤ۔ آج ہم اماں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔''

میں نے کھانے کی ٹرے سجائی اور جھجکتے ہوئے اماں کے پاس بیڈ پر جا رکھی۔ کھانا دیکھ کر اماں سکڑ سمٹ کر تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں نے کھانا کھانا شروع کیا۔ بابر نے پہلا نوالہ بنا کر اماں کی طرف بڑھایا۔ اماں نے نفی میں سر پھیرا مگر بابر کے اصرار کے سامنے جلدی ہی ہار مان لی۔ اب وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئی۔ اس کا نارمل رویہ دیکھ کر میرے سر سے گویا کوئی بوجھ سا اتر گیا تھا۔

کھانا کھا چکنے تک اماں کا رویہ کافی حد تک معتدل ہو چکا تھا۔ میں نے برتن اٹھاتے ہوئے پہلی بار براہ راست اماں کو مخاطب کیا۔

''اماں! آپ کے لئے چائے بنا لاؤں؟''

اماں جواب دینے کی بجائے منہ دوسری طرف کر کے دیوار کو تکنے لگی۔

''ہاں ہاں بنا لاؤ! اماں عادی ہیں رات کے کھانے کے بعد چائے پینے کی۔'' بابر نے اماں کی خاموشی کو اس کی رضامندی ہی جانا اور مجھے حکم صادر کر دیا۔

میں چائے بنا لائی۔ چائے بھی اماں کی سنگت میں بیٹھ کر پی اور پھر اماں سے اجازت طلب کر کے اپنے کمرے کی راہ لی۔ آتے ہی اپنے بیڈ پر گر سی گئی۔ جسمانی تھکاوٹ اور ذہنی کھچاؤ نے ادھ موا سا کر دیا تھا۔

''شکر ہے... اماں کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا ورنہ میں تو سوچ رہا تھا گھر آتے ہی پتا نہیں کون سا بم پھوڑیں گی۔''

بابر میرے بالوں کی لٹوں سے کھیلنے لگا۔

''مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی آسانی سے مفاہمت کا راستہ اختیار کر لیں گی۔ان کی خاموشی کو ان کی رضا مندی مت سمجھو۔''

''مگر مجھے ایسا نہیں لگتا۔ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔سوائے مفاہمت کے ان کے پاس دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے۔''اس نے کھینچ کر مجھے اپنے ساتھ لگانا چاہا۔

''آج نہیں بابر!''میں نے اس کی پیش قدمی کو روکنے کی خاطر پہلو بدل لیا۔

''مگر کیوں؟''اس نے پیچھے سے کان کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''میں کسمسائی۔

''کیا ہوا طبیعت کو؟ کہو تو ٹانگیں دبا دوں؟''اس نے پھر سے خمار بھری سرگوشی کی۔

''نہیں... آرام کروں گی تو صبح تک بھلی چنگی ہو جاؤں گی۔''

''پکا نا؟''اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھرکنے لگی۔

''ہاں نا... پکا۔''میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا تو وہ پیچھے ہو کر لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن بابر اپنے کام پر فیکٹری چلا گیا کیونکہ اس کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔اس کی غیر موجودگی میں بڑی بی کو بھی کھل کر تفتیش کرنے کا موقع مل گیا۔

اس نے مجھے پاس بٹھا لیا۔

''کون ہو تم۔کہاں سے آئی ہو؟''بڑھیا کڑے تیوروں سے مجھے گھور رہی تھی۔اس کی کڑی تفتیش سے میں نروس ہونے لگی۔

''میرا نام... مہر بانو ہے۔شیخوپورہ سے آئی ہوں۔''میں نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''ہوووں! بابر کو کیسے پھنسایا تھا؟''

اس کے اس سوال پر میں گڑبڑا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرا مطلب ہے۔یہ تمہیں کہاں ملا تھا؟ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ یہ بھی شیخوپورہ کام کے سلسلے میں ایک مہینہ رہ کر آیا ہے۔''

''بس جی ایک مارکیٹ میں مل گئے تھے۔''میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''مارکیٹ میں ملا اور تم نے پھانس لیا؟ کافی چلتا پرزہ دکھائی دیتی ہو۔''بڑی بی کی نگاہیں مجھے اپنے جسم میں پیوست ہوتی دکھائی

دے رہی تھیں اور اس کا انداز گفتگو بھی انتہائی عامیانہ اور تضحیک آمیز تھا۔

میں اس کی باتوں سے بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو گھر کے کام کاج کرلوں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ طنزیہ ہوگیا اور اس کی اجازت کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی اور گھر کے کاموں میں مشغول ہوگئی۔

اس کے بعد سارا دن نہ اس نے مجھے بلایا اور نہ ہی میں نے غیر ضروری بات کی۔ پچھلے پہر فوزیہ کا فون آگیا۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں لیٹی آرام کررہی تھی۔ حال احوال پوچھنے کے بعد فوزیہ نے اپنی خالہ یعنی میری نئی ساس کی بابت پوچھا۔ اس کے رویے کے متعلق پوچھا۔

میں نے صاف بتادیا کہ بڑی بی مجھ سے خار کھائے بیٹھی ہے۔ انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کیئے ہوئے ہے۔

''ویسے سچ پوچھو تو مجھے خالہ کے ساتھ بڑی ہمدردی محسوس ہورہی ہے۔ بیچاری ایک ہفتہ ہماری گھر رہی ہیں اور اس ایک ہفتے میں ان کی گفتگو کا مرکز ومحور صرف بابر کی شادی اور اس کی ہونے والی بیوی ہی رہی۔''

''اچھا جی!'' مجھے اس کی باتوں سے بے زاری سی محسوس ہونے لگی۔ ''تمہاری خالہ ہے ظاہر ہے تمہاری ساری ہمدردیاں تو اسی کے ساتھ ہوں گی نا۔ میرے ساتھ تھوڑی ہوں گی۔'' میں نے جل کر جواب دیا تو کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''ناراض کیوں ہوتی ہے میری بنو؟ اگر سوچا جائے تو خالہ کے خوابوں کو چکنا چور کرنے میں میرا کردار سب سے اہم رہا ہے۔ اگر خالہ کو بھنک بھی مل گئی نا میری کارکردگی کی تو زندہ نہیں چھوڑیں گی مجھے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' اس کی وضاحت نے میرا دل مطمئن کردیا۔ ''اچھا یہ بتا! میرے بچے کیسے ہیں؟''

''دیکھ بانو! تو اب اپنے بچوں کو بھول جا... تیرے حق میں یہی بہتر ہے اور ویسے بھی میں ان سے رابطہ کیسے کرسکتی ہوں؟'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس کی بات سن کر میرا دل بجھ سا گیا۔ چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کال بند کردی۔

☆......☆......☆

شام کو بابر کے آنے تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ نہا کر اس کا پسندیدہ سوٹ زیب تن کرکے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تو وہ نظروں سے پیتا ہوا اندر اپنے کمرے تک مجھے بازو کے گھیرے میں ساتھ لئے آیا۔

''آج تو مجھے قتل کرنے کا پورا پروگرام بنائے بیٹھی ہو۔'' تنہائی ملتے ہی اس نے اپنی دیوانگی کا عملی مظاہرہ کرڈالا۔ میں نے اسے دھکا دے کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔

''کیا کرتے ہو؟.... چھوڑو مجھے۔''میں گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔

''کیا خیال ہے؟... آج کھانا باہر نہ کھانے چلیں؟''اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اماں سے اجازت لے لو پہلے۔اگر انہوں نے اجازت دے دی تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔''میرے لہجے میں موجود چبھن اسے بھی دکھائی دے گئی۔

''طنز کر رہی ہو؟''وہ مسکرایا۔

''نہیں،مشورہ دے رہی ہوں۔''

''اچھا جی!چلو تو پھر آج بغیر اجازت کے ہی چلتے ہیں۔''

''سوچ لو!''میں شرارت سے مسکرائی۔

''سوچ لیا۔''اس کا لہجہ پراعتماد تھا۔

مگر بابر کیا عتماد کی دھجیاں تو اس وقت بکھریں جب ہم دونوں نے تیار ہو کر اماں کو باہر جانے کی اطلاع دی۔اماں تو گویا آپے سے باہر ہو گئی۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں باہر کھانا کھانے جا رہے ہو؟''اس نے بے یقینی سے بیٹے سے استفسار کیا۔

''جی اماں!یقیناً میری بات کا یہی مطلب ہے۔''بابر نے جواب دیا۔

''اور جو کھانا گھر میں پکا ہے۔وہ کون کھائے گا؟''

''آپ کھا لیں نا... جو باقی بچا وہ کل کھا لیں گے۔''بابر جان چھڑانا چاہتا تھا مگر بڑی بی جان چھوڑنے کے موڈ میں ہرگز نہ تھی۔

''یعنی تم دونوں باہر کھانا کھاؤ اور میں گھر میں پکی تمہاری بیوی کے ہاتھوں کی یہ بدمزہ سبزی کھاؤں؟واہ بیٹا ہو تو ایسا...ایک ہی ہفتے میں خون کا رنگ بدل گیا۔ہائے مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ میرے ساتھ اب ایسا ہی سلوک ہوا کرے گا۔''اماں دہائیاں دینے لگی تو ہم دونوں گھبرا گئے۔

''اماں!مت کھائیں آپ بھی سبزی۔آتے ہوئے تمہارے لئے بھی کھانا پیک کروا لاؤں گا۔''بابر کا لہجہ اب قدرے جھنجھلایا ہوا تھا۔

یہ بات سن کر بھی اماں کی آہ و فغاں میں کوئی خاص کمی واقع نہ ہوئی تو بابر نے مجھے بازو سے پکڑا اور اماں کے کمرے سے باہر آ گیا۔صحن میں کھڑی بائیک کو اسٹارٹ کیا اور اماں کو بلند آواز سے پکارا۔

''ہم جا رہے ہیں اماں!ہمارے آنے تک سو مت جانا۔''

ہم گھر سے باہر آ گئے۔آج بابر کے پیچھے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بائیک پر بیٹھی تو دل سرشاری کے عالم میں انوکھی تال پر

دھڑک رہا تھا۔دنیا بہت حسین دکھائی دے رہی تھی۔

ایک مشہور ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔اماں کے لئے کھانا پیک کروایا۔راستے میں آئس کریم کھاتے ہوئے گھر آئے۔اماں کے کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ اماں سوچکی ہیں۔بابر نے انہیں نرمی سے جگایا اور کھانا ان کے آگے رکھ دیا۔

''نہیں کھاؤں گی۔اٹھاؤ اسے۔جلدی۔'' اماں نے کرخت لہجے میں کھانے کو دھتکارا اور کروٹ بدل لی۔

اب کھانے کی جانب اس کی پشت تھی۔بابر نے کھانے والا شاپر اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔میں نے وہ سیخ کباب اور نان ایک پلیٹ میں ڈال کر فریج میں رکھ دیئے۔

☆......☆......☆

وقت کسی زخمی سانپ کی طرح سست روی سے رینگتا رہا۔چار پانچ ماہ گزر گئے مگر بڑی بی نے مجھے دل سے ابھی تک قبول نہ کیا تھا۔اس کا رویہ بدستور مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہتا۔وقت بے وقت بے سرے باجے کی طرح بجنے لگتی۔

ایک دن فوزیہ کا فون آیا تو اس کے آگے میں پھسل پڑی۔

''یار! کتنی کھڑوس ہے تمہاری خالہ! نہ خود چین سے رہتی ہے اور نہ مجھے سکون سے رہنے دیتی ہے۔''

''ایسی ہی ہیں ہماری خالہ!'' اس نے قہقہہ لگایا۔''اور پھر خود کو ان کی جگہ پر رکھ کے سوچو ذرا... اکلوتے بیٹے کو تم نے ہتھیا لیا۔کیا کیا خواب دیکھے تھے خالہ نے بابر کی شادی کو لے کر۔''

''یعنی تمہیں مجھ سے زیادہ ہمدردی اپنی خالہ سے محسوس ہو رہی ہے اور میری زندگی جو اجیرن کر رکھی ہے انہوں نے۔اس کا کیا؟'' میں جل کر بولی تو فوزیہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''ویسے ایک بات ہے بانو! ساسوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو تمہاری قسمت واقعی بڑی خراب ہے۔''

''اللہ کرے تمہیں بھی کوئی ایسی ہی ساس ملے۔پھر تم سے پوچھوں گی کہ سناؤ بنو!''

''توبہ ہے بانو! تم تو کسی سوتن کی طرح طعنے دینے لگی۔'' اس کا لہجہ شکوہ آمیز ہو گیا۔

''دیکھا خود پر بات آئی تو کیسے کلیجہ جلنے لگا؟ ویسے دل پر مت لو۔مذاق کر رہی ہوں۔اللہ نہ کرے جو تمہیں کوئی سخت گیر قسم کی ساس ملے۔'' میں نے فوزیہ کا موڈ خوشگوار کرنے کی خاطر اپنی آواز میں کھنک پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''اور شوہر؟'' فوزیہ نے اترا کر پوچھا۔

''شوہر تو مل چکا۔اب دعاؤں سے تھوڑی بدل جائے گا۔چلو پھر بھی یہی کہتی ہوں۔شوہر بھی بہت اچھا اور خیال رکھنے والا ملے۔بالکل بابر جیسا۔'' میں نے صدق دل سے دعا دی۔

''شکریہ بانو! آئی ایم پرائڈ آف یو۔اللہ کرے یونہی ہنستی مسکراتی رہو۔ویسے ریاض کی عادات واطوار بابر سے کافی ملتی جلتی ہیں۔''اس کے لہجے سے ریاض کے لئے بے پناہ محبت چھلک رہی تھی۔تھوڑی دیر مزید باتیں کرنے کے بعد میں نے کال ڈراپ کر دی۔سچ تو یہ ہے کہ فوزیہ سے بات کر کے من ہلکا ہو جاتا تھا۔

☆......☆......☆

کچھ عرصہ مزید گزرا تو ساس نے ایک نیا راگ الاپنا شروع کر دیا۔دن رات اٹھتے بیٹھتے پوتے کی فرمائش۔اس کی یہ ڈیمانڈ میرے سر پر خطرے کی تلوار بن کر لٹکنے لگی۔اب تو وہ بیٹے کے سامنے بھی وقت بے وقت یہی رٹ شروع کر دیتی۔

''بس مرنے سے پہلے اللہ پوتے کا منہ دکھا دے۔اور کچھ نہیں مانگوں گی رب سے۔''

''ضرور دکھائے گا رب... بس دل چھوٹا مت کیا کرو اماں۔''وہ ہنس کر جواب دیتا تو میں مزید خوفزدہ ہو جاتی۔

''کیسے دل چھوٹا نہ کروں۔خیر سے تمہاری شادی کو سال ہونے کو آرہا ہے۔ابھی تک امید کی کوئی کرن تک دکھائی نہیں دے رہی۔''

ان دونوں کی باتیں مجھے ہراساں کر رہی تھیں۔اس لئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔الماری کھول کر تصویروں کا البم نکالا اور اپنے بچوں کی تصویریں نکال کر دیکھنے لگی۔جو گھر سے نکلتے وقت اپنے کپڑوں میں چھپا کر رکھ لیں تھیں۔

تصویریں دیکھتے ہوئے کب آنکھوں سے آنسو نکل کر البم پر پھسلنے لگے،خبر ہی نہ ہوئی۔اچانک کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو بری طرح چونک گئی۔جھٹ سے البم بند کیا اور سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

بابر کھڑا مسکرا تھا۔اسے دیکھ کر جان میں جان آئی اور اپنے آنسو پونچھنے لگی۔وہ پاس بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

''کیا بچوں کی بہت یاد آرہی ہے؟''اس کا لہجہ ہمدردی سے لبریز تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سے رونے لگی۔وہ میرا سر اپنے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔

''رو کیوں رہی ہو میری جان؟ اللہ سے دعا کیا کرو۔وہ تمہاری جھولی پھر سے اولاد جیسی دولت سے بھر دے گا۔''

''پلیز بابر اپنی ماں سے کہو،ہر وقت ایسی باتیں مت کیا کرے۔''

''تو اس میں برا کیا ہے ڈیئر؟ ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اولاد کو گود میں کھلائے اور اگر اولاد اکلوتی ہو تو یہ خواہش مزید شدت اختیار کر جاتی ہے۔''بابر کی پیار بھری وضاحت نے مجھے مزید پریشان کر دیا۔

''ایک بات پوچھوں بابر؟''میں نے اس کے کندھے سے سر ٹکائے ٹکائے پوچھا۔

ضرور پوچھو میری جان۔''اس نے میری پیشانی پر پیار کیا۔

اگر اللہ نے مجھے مزید اولاد نہ دی تو......کیا کرو گے؟ کیا مجھے چھوڑ دو گے؟''

''ایسی باتیں منہ سے مت نکالو۔ اللہ ضرور تمہاری گود پھر سے ہری کرے گا۔ مایوسی کفر ہے۔''

''پھر بھی... اگر اولاد نہ ہوئی تو؟''

کیسی باتیں کر رہی ہو بانو؟... مت بھولو تم دو بچوں کو جنم دے چکی ہو۔ یعنی تم بانجھ نہیں ہو... تو پھر ایسی مایوسی بھری باتیں کیوں؟''

''فرض کرو بابر!'' میں اب سیدھی ہو کر اس کی آنکھوں میں فیصلہ کن انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''پھر بھی تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''وعدہ؟'' میں نے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''کبھی کبھی بالکل بچوں کی طرح ری ایکٹ کرتی ہو۔''

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا۔

''وعدہ... پکا وعدہ۔''

اس کے وعدہ کرنے سے دل کو تسلی ہو گئی مگر جانتی تھی کہ یہ تسلی اور اطمینان وقتی ہے۔

☆......☆......☆

اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ساس صاحبہ نے مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جا کر چیک اپ کروانے کی ضد پکڑ لی۔ میں نے کچھ دن ٹال مٹول سے کام چلایا اور ایک دن بابر کے سامنے پھٹ پڑی۔

''بابر! تمہاری اماں مجھے گائناکالوجسٹ کے پاس لے کر جانا چاہتی ہیں۔''

''تو کیا ہوا جان؟ تم اتنا کیوں گھبرا رہی ہو؟ چلی جاؤ۔'' اس نے پیار سے میرا گال تھپتھپایا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو بابر؟'' میں جھنجھلا گئی۔ ''تم تو جانتے ہو اندر کی بات۔ ڈاکٹر میرا فزیکلی چیک اپ کرے گی۔''

''تو کیا ہوا؟ کروا لینا۔'' وہ شرارت سے ہنسا۔ ''گھبرا تو ایسے رہی ہو جیسے تم کوئی ان چھوئی کنواری لڑکی ہو۔''

''بابر! اس وقت واقعی تمہاری عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔'' میں سلگ کر بولی تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''مگر کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''تم اپنی ماں کے سامنے مجھے کنواری لڑکی کے طور پہ پیش کر چکے ہو۔ لیڈی ڈاکٹر نے جب یہ انکشاف کیا کہ میں بچوں کی ماں ہوں تو سوچو... ان کا ردعمل کیا ہو گا پھر؟''

میں نے اپنی بات مکمل کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ میری بات سن کر اب وہ بھی فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔

''ارے ہاں! اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔''

اس کا متفکر چہرہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان محسوس ہوا۔ سوچنے لگی کہ بلا سر سے ٹل گئی مگر یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی۔

اگلے دن جب بابر اپنے کام پر چلا گیا۔ اور میں بھی گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی تو اماں نے مجھے حکم دیا۔

''فوراً تیار ہو جاؤ......ڈاکٹرنی کے پاس جانا ہے۔''

میں اس وقت کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ اس اچانک افتاد سے گھبرا گئی۔ ہاتھ سے پلیٹ پھسل گئی۔ میں نے بیچارگی سے پاس کھڑی ساس کی طرف دیکھا جو دونوں پہلوؤں پر ہاتھ ٹکائے، تھانیدارنی بنی کھڑی، خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

''مم...... میں نے بابر سے بات کی تھی اس موضوع پر...... وہ کہتا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں منمنائی۔

''مجھے بابر کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ پھنکاری۔ ''کافی دنوں سے تم میری بات پر کان نہیں دھر رہی۔ آج تمہیں زبردستی لیکر جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں تم کیسے نہیں جاتی میرے ساتھ۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہی تھی۔

''اچھا... میں ذرا بابر کو فون کر کے اجازت لے لوں۔'' مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو یہ بہانہ آگے کر دیا۔

''بابر تم سے ناراض نہیں ہوگا......اس بات کی گارنٹی میں اٹھاتی ہوں۔ تم برتن چھوڑو اور چادر اوڑھو۔''

''اچھا! بس یہ تھوڑے سے برتن رہ گئے ہیں، انہیں دھو لوں۔''

''نہیں! رہنے دو......یہیں ہاتھ روک دو۔ باقی کام واپس آ کے کر لینا۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی تو میں نے نل بند کر کے اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھنے لگی۔

دس پندرہ منٹ کے اندر اندر میں لباس چینج کر کے، ساس کے ساتھ رکشے میں بیٹھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

لیڈی ڈاکٹر ایک خوش شکل اور خوش مزاج، ادھیڑ عمر کی خاتون تھی۔ اپنا چھوٹا سا پرائیویٹ کلینک کھولے بیٹھی تھی۔ ریسیپشن ہال میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کیا۔ باری آنے پر اندر ڈاکٹر کے پاس دونوں اکٹھی ہی گئیں۔ اس نے پرتپاک انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ ہم دونوں ڈاکٹر کے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ چکیں تو وہ استفہامیہ انداز میں ہماری طرف دیکھنے لگی۔

''ڈاکٹرنی جی! یہ میری بہو ہے۔'' میری ساس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔

"جی جی فرمایئے...... بہو تو بہت خوبصورت ہے آپ کی۔ ماشااللہ" وہ میری طرف توصیف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

مگر میں آنے والے لمحوں کا سوچ سوچ کر بری طرح ہراساں ہورہی تھی۔ ڈاکٹر کی ستائش بھی میرے اعصابی کھچاؤ کو کم نہ کرسکی۔

"مسئلہ یہ ہے ڈاکٹرنی جی...... شادی کو سال ہونے کو آرہا ہے۔ مگر ابھی تک اس کے ماں بننے کے دور دور تک کوئی چانس نہیں ہیں۔"

"اچھا" ڈاکٹر نے ہنکارا ابھرا۔ "مگر ایک سال کوئی ایسی زیادہ مدت بھی نہیں کہ انسان پریشان ہوکر امید کا دامن چھوڑنے لگے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں ڈاکٹرنی جی! مگر میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور اولاد نہیں۔ جلد سے جلد دادی بننا چاہتی ہوں۔"

"ہمم! اللہ بہتر کرے گا۔" ڈاکٹر نے مجھے پردے کے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں لرزتے قدموں سے پردے کے اس پار آگئی۔ جہاں ایک سنگل بیڈ کے ساتھ جدید ترین الٹرا ساؤنڈ مشین پڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اس بیڈ پر لیٹنے کا اشارہ کیا۔

میں خاموشی سے لیٹ گئی۔ دل جیسے سو کی اسپیڈ سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے میرا چیک اپ کیا اور نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں پھر سے ساس کے پہلو میں آبیٹھی۔ ڈاکٹر بھی اپنی نشست سنبھال چکی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف گہری نظروں سے دیکھتی رہی، پھر پوچھا۔

"کتنے بچے پیدا کرچکی ہو؟" اس کے لہجے کی سنگینی اور سنجیدگی کسی ہتھوڑے کی طرح ضرب لگا رہی تھی۔

میری ساس ڈاکٹر کے اس غیر متوقع سوال پر بوکھلا کر بول اٹھی۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں ڈاکٹرنی جی؟ میری بہو کے ہاں ابھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ نہ کچا نہ پکا۔"

"آپ تھوڑی دیر تک خاموشی اختیار کریں گی خالہ؟ جس سے جو جو سوال پوچھوں گی، وہی مجھے جواب دے گی۔"

"میری بات کا جواب دو بانو! کتنے بچے پیدا کرچکی ہو؟"

"دو۔" میں نے تھوک نگل کر بمشکل جواب دیا تو میری ساس اچھل کر میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے میں نے اچانک کسی ڈراؤنی چڑیل کا روپ دھار لیا ہو۔

"ہمم!" ڈاکٹر نے ہنکارا ابھرا۔

"مگر... وہ میرے پہلے شوہر سے تھے۔ اس شوہر سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ابھی۔" میں نے کمزور سی آواز میں اپنا دفاع کرنا چاہا۔

ڈاکٹر کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"ہمیں شوہروں کی تعداد سے کیا لینا دینا۔ ایک چھوڑ، دس شوہر کرو۔ مگر بچوں کی تعداد اور پیدائش وغیرہ ایک ڈاکٹر سے چھپانا چہ مانی دارد؟"

اس کی باتیں تھیں کہ پگھلا ہوا سیسہ۔

"چلو چھوڑو یہ باتیں! یہ بتاؤ بچے بند کروانے والا آپریشن کب کروایا تھا؟" ڈاکٹر کی طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی تھی۔

اور میں... میرے جسم سے تو اچانک جیسے کسی نے جان کھینچ لی ہو۔ میری ساس ادھ کھلے منہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی میری طرف اور کبھی ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کوشش کے باوجود میرے حلق سے آواز نہ نکلی تو ڈاکٹر نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

''بانو! میری بات کا جواب دو۔ فیملی پلاننگ کا آپریشن کب کروایا تھا۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ کافی عرصہ پہلے کا کروا چکی ہو۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' اس نے استفہامیہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں اس وقت کوئی بھی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔ صرف سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

''ڈاکٹرنی جی! آپ کی باتوں آخر مطلب کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔'' اماں کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''دیکھو خالہ! میں تمہیں صاف لفظوں میں بتاتی ہوں۔ بات کو زیادہ گھماؤں گی نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ یہ لڑکی جو تمہاری بہو ہے، اسے تم اپنے ہاتھوں سے بیاہ کرلائی تھی؟''

''نہیں... میرا بیٹا اسے بھگا کرلایا ہے۔'' اماں نے شرمسار لہجے میں جواب دیا۔

''ہمم... اب ساری بات سمجھ گئی میں۔ دیکھو خالہ تمہارے بیٹے نے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ یہ لڑکی کنواری نہیں تھی۔ شادی شدہ تھی اور کئی بچوں کی ماں بھی تھی۔ کتنے بچے تھے تمہارے؟'' ڈاکٹر مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''دو۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''صرف دو بچوں کی پیدائش کے بعد تم نے مزید بچوں کی آمد روک دی۔ کیوں؟'' ڈاکٹر نہ جانے کیوں بال کی کھال اتارنے پر بضد تھی۔

''کیونکہ... میرا پہلا شوہر بچوں کے اخراجات ٹھیک طریقے سے پورے نہیں کرتا تھا۔'' میں نے جواب دے کر بے چینی سے پہلو بدلا۔

میں اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ میرے سامنے آگے درپیش آنے والے حالات کسی مگرمچھ کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے اور ان سے کیسے نبرد آزما ہونا تھا کچھ معلوم نہ تھا۔

اچانک میری ساس نے واویلا مچانا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے میری کمر پر ایک زوردار دوہتڑ مارا۔

''کلموہی، فراڈن، دھوکے باز... میرے معصوم بچے کو اپنے حسن کے جال میں پھنسالیا۔ چل اٹھ گھر چل۔ دیکھ میں تیرے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ بانجھ کہیں کی۔'' وہ مغلظات بکتی جارہی تھی اور مجھے پیٹتی جارہی تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپے چپ چاپ اس کے آگے بیٹھی مار کھا رہی تھی۔

ڈاکٹر اچانک اس افتاد سے گھبرا گئی۔

''خالہ جی اسٹاپ... پلیز رک جائیں۔'' وہ چلائی۔

اس نے گھنٹی بجا کر باہر بیٹھی چپراسن کو اندر بلالیا۔ وہ چپراسن اب اماں کو مجھ سے دور ہٹانے کی کوشش میں اس سے گتھم گتھا ہوگئی۔ ذرا سی دیر میں ڈاکٹر کا کلینک مچھلی منڈی بن گیا۔ دو عورتیں مزید اندر آئیں اور ان سب نے مل کر اماں کے پہاڑ جیسے جسم کو قابو کیا۔ اتنی دیر تک میری اچھی خاصی درگت بن چکی تھی اماں کے ہاتھوں۔

اماں کو تین عورتوں نے اپنی بانہوں کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ کسی خونخوار بھینسے کی طرح ان عورتوں کے نرغے میں دور کھڑی مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔ پہاڑ جیسا وجود، اس قدر مشقت پر ہانپ رہا تھا۔

میری حالت بھی مار کھانے سے کافی مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔ عبایہ کے ساتھ سر پر لپیٹا ہوا حجاب کھل کر میرے پیروں میں پڑا تھا۔ سر کے بال بکھر کر چہرے پر آگرے تھے۔ اماں کے ہتھوڑا مار کہ ہاتھوں کی ضربات سے چہرہ، سر اور کندھے سلگ رہے تھے۔ منہ میں نمک کا ذائقہ محسوس ہوا تو پتا چلا کہ نچلا ہونٹ پھٹ چکا ہے اور اس میں سے خون رس رہا ہے۔

ڈاکٹر اپنی سیٹ سے اٹھ کر اماں کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔

''بڑا افسوس ہوا خالہ! تمہارا اپنی بہو کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک دیکھ کر۔''

''ڈاکٹرنی جی! خود کو میری جگہ پہ رکھ کے سوچیں، کیا اس کا جرم اس قابل ہے کہ اسے معاف کیا جائے۔'' اماں میری طرف دیکھ کر پھنکاری۔

''خالہ! تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھ رہی کہ تمہارا بیٹا بھی اس کے ساتھ برابر کا قصوروار ہے۔ مارنا ہے تو دونوں کو مارو...... مگر گھر جا کر۔ یہاں میرے کلینک میں ہراس پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے رکھائی سے یہ بات کر کے گویا ہمیں باہر نکل جانے کا اشارہ دیا۔

میں نے نیچے جھک کر اپنا حجاب اٹھایا۔ بال سمیٹے اور حجاب کو سر پہ اچھی طرح لپیٹ لیا۔ کلینک سے باہر نکلیں تو اماں نے وہاں کھڑے ایک رکشے والے کو ہاتھ سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

☆......☆......☆

گھر پہنچنے تک اماں نے کوئی بات نہ کی مگر میں جانتی تھی کہ اماں کا وجود جوار بھاٹے کی طرح ابلنے کو تیار کھڑا ہے۔ گھر پہنچتے ہی اس نے مجھے بالوں سے پکڑ لیا۔

''چھوڑ دے اماں! بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' میں کراہی۔

''میری تکلیف کا اندازہ کر کمینی، دل تو چاہ رہا ہے تجھے جان سے مار دوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا اور مجھے دھکا دے کر پاس پڑی ہوئی چارپائی پر گرا دیا۔

''موبائل نکال اور ملا اپنے خصم کا نمبر۔ اسے فوراً گھر آنے کے لیے کہہ۔'' اس نے درشت لہجے میں مجھے حکم دیا اور میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بیگ سے موبائل نکالا اور بابر کا نمبر ملانے لگی۔

☆......☆......☆

بابر کے آنے تک میں اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑی سسکتی رہی۔ وہ فون پر میری روتی اور کانپتی آواز سن کر سمجھ گیا تھا کہ گھر میں خیریت نہیں ہے۔ میں نے فوراً گھر آنے کو کہا تو اس نے بنا کوئی سوال جواب کیے پندرہ منٹ میں آنے کا کہہ دیا اور اب وہ ٹھیک بیس منٹ بعد میرے پاس بیٹھا میرا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں اٹھ بیٹھی اور اس کے ساتھ لپٹ کر زاروقطار رونے لگی۔

''کیا ہوا جان؟ اماں نے کچھ کہہ دیا؟'' وہ نرمی سے میری پیٹھ سہلانے لگا۔

''ہاں! اماں نے ہی کہا ہے۔'' اماں کی کڑک دار آواز کان میں پڑی تو میں سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پاس آ گئی اور سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''سچ سچ بتا بابر! تجھے معلوم تھا نا کہ یہ کلموہی شادی شدہ ہے اور دو بچوں کی ماں ہے؟'' وہ کڑے تیوروں سے بیٹے سے تفتیش کرنے لگی۔

''ہاں اماں! میں یہ سب جانتا تھا۔'' اس نے سر جھکائے آہستگی سے جواب دیا۔ ''مگر اماں بانو بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا تھا۔ مجبور ہو کر اس نے گھر سے قدم نکالا تھا۔''

''ہونہہ... اچھی لڑکی۔ اتنی اچھی ہوتی تو یوں بچوں کو چھوڑ کے یار کے ساتھ نہ بھاگتی۔ مائیں تو اپنی اولاد پر جان تک نچھاور کر دیتی ہیں۔ یہ کیسی ماں ہے جس نے اپنا سکھ اور سکون دیکھا۔ بچوں کا کچھ نہ سوچا۔''

اماں کی باتیں میرے کلیجے کو چھلنی کر رہی تھیں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی اگر میں اچھی ماں ہوتی تو کبھی یوں بچوں کو چھوڑ کر گھر کی دہلیز پار نہ کرتی۔ میں گھٹنوں میں سر دیئے ہچکیاں لینے لگی۔

''اماں جو ہونا تھا ہو چکا۔ مٹی ڈال دیں پچھلی سب باتوں پر۔'' بابر کی کھسیائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ڈال دوں گی مٹی... اگر تو مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرے تو؟'' اماں کے لہجے کی سرد مہری نے مجھے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''کیسا وعدہ اماں؟'' بابر بھی چونک کر اماں کی طرف دیکھنے لگا۔

''دوسری شادی کرے گا۔ اور جہاں میں کہوں گی وہیں کرے گا۔'' اماں کا لہجہ اٹل تھا۔

''مگر کیوں اماں؟ بانو میں کیا کمی ہے آخر؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''بانو کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ یہ کمی کم ہے کیا۔''اماں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا

''کیوں ماں نہیں بن سکتی۔؟ پہلے دو دفعہ بن چکی ہے تو پھر تیسری بار کیوں نہیں؟''اب کی بار بابر کا لہجہ جھنجھلاہٹ لیے ہوئے تھا۔

''اس لیے کہ دو بچوں کی پیدائش کے بعد مہارانی نے بچے بند کروا دیئے تھے۔اب یہ دوبارہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔''اماں کا لہجہ بدستور پرسکون تھا۔

''کیا......؟''بابر کے سر پر گویا کوئی بم پھٹ گیا۔''کیا کہہ رہی ہو اماں؟''

''مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنی لاڈلی بیوی سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہو۔میں کیوں جھوٹ بولوں گی تم سے۔ یہ تو آج اس ڈاکٹرنی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ ورنہ نجانے کب تک ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہتی یہ حرافہ۔''اماں کی زبان زہر اگل رہی تھی اور میں پتھر کا مجسمہ بنی سب کچھ سن رہی تھی۔

یہ بات سن کر بابر بھی گم سم ہو گیا تھا اور اس کی خاموشی سے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔اماں جانے کے لئے کھڑی ہوئی اور پھر سے اپنا فرمان دہرایا۔

''ایک ماہ کے اندر اندر تمہاری دوسری شادی کروں گی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔تم بھی نہیں۔''

اماں کمرے سے باہر چلی گئی تو بابر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ مجھے اس وقت بابر سے انتہائی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

بابر! مجھے معاف کر دو بابر۔ میں نے اتنی بڑی بات تم سے چھپائی۔''میں پھر سے رونے لگی۔اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں شام تک بیٹھی اپنی قسمت کو روتی رہی۔

☆......☆......☆

رات کو گھر میں کھانا نہیں پکا اور نہ ہی کسی نے کھایا۔ بابر ابھی تک گھر سے باہر تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ رو رو کر میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ بابر کی غیر حاضری سے دل میں کئی اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ حالانکہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ بابر ایک ٹھنڈے مزاج کا نوجوان ہے۔کوئی ایسی ویسی حرکت کی امید نہیں تھی اس سے۔ مگر وہ اتنی رات گئے تک کبھی گھر سے باہر نہیں رہا تھا اور وہ بھی بتائے بغیر تو کبھی نہیں۔

میں کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آئی تو پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔صحن کی لائٹ جلائی۔ کچن میں جھانکا تو وہاں بھی ویرانی کا راج تھا۔

چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ واپس کمرے کی طرف جانے لگی تو ساس کے کمرے کی طرف نظر اٹھی۔ دروازہ بند تھا مگر دروازے کی نچلی درز سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

میں کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی پھر قدم ادھر اٹھنے لگے۔ دوازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر جھانکا تو اماں بیڈ پر آلتی پالتی مارے ہاتھ میں تسبیح کے دانے گرا رہی تھی۔

''اماں! بابر کہاں گئے ہیں؟ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''مجھ سے کیا پوچھتی ہے؟ اپنے دل سے پوچھ۔ ہائے میرے بچے کا دل ٹوٹ گیا۔ پتا نہیں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا سڑکوں پر۔'' اماں نے باقاعدہ بین شروع کر دیئے تو میرا دل مزید ہولنے لگا۔

خاموشی سے دروازہ بھیڑ کے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ موبائل اٹھایا اور اس کا نمبر ملانے لگی۔ بیل جا رہی تھی۔ مگر اس نے کال ریسیو نہ کی۔ دو تین دفعہ ٹرائی کرنے کے بعد بیدلی سے فون ایک طرف اچھال دیا۔ پھر سے آنسو بہانے لگی۔ اب رات کے دس بج رہے تھے۔ بھوک پیاس سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں مگر بابر کی گمشدگی ہر احساس پر بھاری تھی۔

اچانک ذہن میں ایک خیال آیا تو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر اس میں پڑی ایک چھوٹی ڈائری نکالی۔ اس پر بابر کے دوستوں کے کونٹیکٹ نمبرز درج تھے۔ فیصل کا نمبر تلاش کر کے ملایا۔ تیسری چوتھی بیل پر اس نے کال پک کر لی۔

''ہیلو'' اس کی بھاری مردانہ آواز اسپیکر سے ابھری۔

''ہیلو فیصل صاحب! میں بانو بات کر رہی ہوں۔''

''جی جی بھابی! فرمایئے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔ گھر میں سب خیریت ہے نا۔ بابر تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے۔

''جی بھائی صاحب! سب خیریت ہے۔ بابر کافی دیر پہلے گھر سے نکلے تھے مگر اتنی رات ہو گئی اور ابھی تک نہیں لوٹے۔ مجھے ان کی بڑی فکر ہو رہی ہے۔'' میں پھر سے سسکنے لگی۔

''ارے بھابی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟ اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے؟''

مجھے روتا دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

''آپ پلیز گھبرائیں مت۔ میں اس سے رابطہ کرتا ہوں۔ ابھی آ جائے گا واپس گھر۔''

''مگر اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا بھائی صاحب، آج تو میرا فون بھی نہیں اٹھا رہے۔'' میں نے ہچکیوں کے درمیان اپنی بات مکمل کی۔

''کہیں آپ سے ناراض شاراض نہیں ہو گیا۔''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' میں نے روتے روتے جواب دیا۔

''اوہ! آپ بالکل ریلیکس ہو جائیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کے سامنے موجود ہو گا وہ۔''

اس کی باتوں سے دل کو بڑی ڈھارس محسوس ہونے لگی۔ کال ڈراپ کر کے پھر سے لیٹ گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد دروازے کے چر چرانے کی آواز سنائی دی تو گردن اٹھا کر دیکھا۔ بابر ہاتھ میں کھانے کا شاپر اٹھائے سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر بجلی کی سی سرعت سے بیڈ سے نیچے اتری اور بھاگتی ہوئی اس کے سینے سے جا لگی۔

''کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر۔ تم تو جانتے ہو نا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' میں اس سے لپٹی سسک رہی تھی۔ اسے بھینچ رہی تھی۔ مگر وہ پتھر کا بت بنا بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ چند لمحوں میں اس کی سرد مہری اور بے حسی کا اندازہ ہوا تو میں بھی پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپر میری طرف بڑھایا۔

''اس میں کھانا ہے۔ پلیٹوں میں ڈال کر لے آؤ۔'' اس کا لہجہ بھی اس کے رویے کی طرح بالکل سپاٹ تھا۔ میں نے شاپر پکڑا اور کچن کا رخ کیا۔ چکن بروسٹ کے ساتھ روغنی نان اور دہی کا رائتہ وغیرہ تھا۔

کھانا لے کر واپس کمرے میں آئی تو بابر نے ایک پلیٹ میں دو نان رکھے اور دوسری میں چند پیس بروسٹ کے اور جاتے جاتے کہا کہ تم کھانا کھا لو۔ میں اماں کے پاس جا رہا ہوں۔ خود بھی وہیں بیٹھ کر کھا لوں گا۔

میں نے چند لقمے زہر مار کیے اور باقی کھانا کچن میں واپس رکھ آئی۔



ناول ''تہی دامن'' ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 3

جب تک بابر واپس اپنے کمرے میں نہیں آیا۔ میں بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ وہ ایک گھنٹے بعد آ کر خاموشی سے میرے پہلو میں لیٹ گیا۔ میں نے اس کے موڈ کے پیش نظر اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح کا سورج بھی اپنے جلو میں اداسیاں لئے طلوع ہوا۔ میں نے اٹھ کر انڈوں اور پراٹھوں کا ناشتہ تیار کیا۔ بابر نے خاموشی سے ناشتہ کیا اور کام پر چلا گیا۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کچھ کھانے کو مگر چائے کے ساتھ پراٹھے کے چند لقمے زبردستی نگل لئے۔ برتن سمیٹے اور سنک میں رکھ دیئے۔

اماں کے کمرے میں جھانکا تو وہ ابھی تک سوئی پڑی تھی۔ بیرونی دروازے کو مقفل کیا اور اپنے کمرے میں آ کر صوفے پر گر سی گئی اور آنے والے وقت کا سوچ سوچ کر دماغ چکرانے لگا۔

’’اب کیا ہوگا؟ کیا بابر واقعی ماں کے کہنے میں آ کر دوسری شادی کر لے گا؟ ضرور کرے گا۔ کیونکہ میں ایک بانجھ عورت ہوں۔ مجھ سے کیا حاصل ہوگا بھلا اسے۔‘‘

سوچ سوچ کے دماغ دکھنے لگا تو فون اٹھا کر فوزیہ کا نمبر ملانے لگی۔

’’ہیلو۔‘‘ اس کی آواز سنتے ہی میرا دل بھر آیا۔

’’کیسی ہو فوزیہ؟‘‘ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

’’میں تو ٹھیک ہوں مگر تم ٹھیک نہیں لگ رہی۔ کیا ہوا؟‘‘ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس نے میری پریشانی فوراً بھانپ لی۔

’’کتنی غلط تھی میں فوزیہ! جو قسمت کی لکیروں کو بدلنے چلی تھی۔ بھلا اپنی قسمت سے بھی کوئی راہ فرار اختیار کر سکتا ہے۔‘‘

’’ہوا کیا ہے؟ آخر کچھ بتاؤ گی بھی یا یونہی بجھارتیں ڈالتی رہو گی۔‘‘

میں رونے لگی اور روتے روتے ساری کہانی اسے کہہ سنائی۔

’’اوہ خدایا! تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے اور بابر سے چھپائی؟ کیا تم نہیں جانتی تھی بانو...... کہ ایک دن یہ راز فاش ہو کر رہے گا؟ بابر خالہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ اولاد حاصل کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جائے گی۔ یعنی ہر حال میں اس کی دوسری شادی کرے گی۔‘‘

''اب کیا ہوگا فوزیہ؟ میرا اس گھر میں کیا مقام ہوگا؟ میں کہاں جاؤں گی؟'' میں ہچکیاں لے رہی تھی۔

''بہت برا ہوا یہ بانو! بے اولاد عورت مرد کے کندھوں کا بوجھ بن جاتی ہے۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

''مجھے مشورہ دو فوزی۔ اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

''جانا کہاں ہے پگلی؟ اپنے پیچھے ساری کشتیاں تو جلا کر نکلی ہو۔ اب یہیں رہو۔ بابر کی دوسری شادی ہوتے ہوئے دیکھو۔ اس کے بچوں کو کھلانا آیا بن کر۔ اور پھر سسک سسک کر ایک دن مرجانا۔ یہی تمہاری زندگی کا دی اینڈ ہوگا۔ اور یہ اینڈ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے۔ اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ تم بھی نہیں۔'' وہ افسردگی سے بولتی چلی جارہی تھی اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ میرے دل پر کاری ضرب لگاتا جارہا تھا۔

''فوزیہ پلیز چپ ہوجاؤ۔'' میں نے کال ڈراپ کردی اور کافی دیر تک روتی رہی۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا بھی سب نے خاموشی سے کھایا۔ میں برتن دھو کر کمرے میں آئی تو بابر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

میں خاموشی سے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھے بنا کروٹ بدل کے میری طرف پشت کرلی تو میرا دل کٹ کے رہ گیا۔ میں بھی اپنی سائیڈ پر لیٹ گئی۔ کچھ سوچا اور پھر بابر کی طرف رخ کرکے اس کی پشت پر نظریں جمادیں۔ پھر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

''بابر! پلیز مجھ سے بات کرو......تمہاری بے رخی مجھے مار ڈالے گی۔'' میں سسکنے لگی تو اس نے رخ میری طرف کرلیا مگر مجھے چپ کروانے کی کوئی کوشش نہ کی۔

وہی بابر جو میری آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ اس وقت پرسکون انداز میں لیٹا، مجھے روتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میں نے آنسو پونچھے اور اس کے گال پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''کیا ناراض ہو مجھ سے؟''

''کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور میرا ہاتھ نرمی سے پیچھے ہٹادیا۔

''بابر! میں مانتی ہوں......میری غلطی ہے۔ مجھے اتنی بڑی بات نہیں چھپانی چاہیے تھی مگر حقیقت تو یہ ہے کہ تمہیں کھونے سے ڈرتی تھی۔ سچائی جان کر تم کبھی مجھے قبول نہ کرتے۔'' بات کرتے ہوئے میری آواز رندھ گئی۔

''تو کیا اب سچ سامنے آنہیں گیا۔ ایسی باتیں کب تک چھپ سکتی ہیں؟ اب اپنی پوزیشن پر غور کرو ذرا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں

بھی اٹھ کر اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کے بولی۔

''مجھے معاف کر دو بابر!''

''سچ تو یہ ہے کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا بانو! میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اپنے شوہر سے اپنی جان بچانے کے لئے، میری ذات کا سہارا لیا۔ تمہیں مجھ سے کبھی بھی محبت نہیں رہی۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بات مکمل کی۔ اس کی باتیں سن کر میں تڑپ اٹھی۔

''ایسا مت کہو بابر! میں نے دل کی گہرائیوں سے تم سے محبت کی ہے اور مرتے دم تک کرتی رہوں گی۔'' میں پھر سے رونے لگی۔

''نہیں بانو! مجھ سے محبت کرنا تمہاری مجبوری تھی کیونکہ اس کے علاوہ تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ جب تمہیں پورا یقین ہو گیا کہ سیٹھ ناصر کسی بھی لمحے تمہاری جان لے سکتا ہے تو تم نے میرا ہاتھ تھام کر اس مقتل گاہ سے راہ فرار اختیار کی۔''

''اس کا مطلب ہے تم مجھے معاف نہیں کرو گے۔؟'' میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''اگر معاف کرنے سے تمہاری مراد یہ ہے کہ میں اولاد کی خواہش دل میں دفنا کر، تمہارے ساتھ ساری زندگی صبر و شکر کے ساتھ گزار دوں تو یقین کرو تمہاری محبت میں یہ بھی کر گزرتا مگر میری ماں اتنی صابر نہیں ہے۔ وہ میری اولاد کو گود میں کھلانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔''

''یعنی تم اماں کے کہنے پر دوسری شادی کر لو گے؟'' میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجبوری ہے۔ کرنی پڑے گی۔ ماں کی نافرمانی کر کے اپنی جنت کو ناراض نہیں کر سکتا'' یہ بات کہہ کر وہ پھر سے میری طرف پشت کر کے لیٹ گیا۔

''اور تمہاری محبت کے وہ دعوے؟ سب جھوٹ تھے؟'' میں غصے سے بولی۔

''محبت تو تم سے کرتا ہوں بانو......اور بہت کرتا ہوں مگر محبت کے علاوہ بھی دنیا میں بہت سے غم ہیں۔'' اس نے بغیر پلٹے جواب دیا اور میں بھی کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح نڈھال لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

اگلا ایک ہفتہ میرے لئے بہت اعصاب شکن ثابت ہوا۔

بابر اور اس کی ماں کے رویوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ دونوں بدستور مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ زیادہ دکھ مجھے بابر کے اچانک بدلنے پر ہو رہا تھا۔ اولاد کی خواہش کے سامنے، ہماری محبت ریت کی دیوار ثابت ہوئی تھی۔

کچھ دنوں سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی اماں کے پاس آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ جب بھی وہ آتی، اماں کے ساتھ دھیمی آواز میں کھسر پھسر کر رہی ہوتی۔ جب میں قریب جاتی تو ایکدم خاموش ہو جاتیں۔ تب اماں مجھے چائے یا کوئی مشروب لانے کے بہانے وہاں

سے اٹھا دیتی۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ اماں اسے اپنے بٹوے سے ہزار کا نوٹ نکال کر دے رہی ہے۔ میں چائے کے کپ ٹرے میں رکھے قریب گئی تو اس عورت نے فٹافٹ نوٹ اپنے گریبان میں اڑس لیا۔ چائے پینے کے بعد وہ چلی گئی تو میں اپنی ساس کے پاس آ بیٹھی۔

''اماں! یہ عورت کون ہے؟''

''تم سے مطلب؟ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔'' اماں نے رکھائی سے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں......کون ہے۔''

''کون ہے؟'' وہ خشمگین نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔

''یہ رشتے کروانے والی وچولن ہے۔ آپ بابر کی دوسری شادی کے لئے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''ہاں ڈھونڈ رہی ہوں لڑکی! اور دوسری شادی بھی اس کی ضرور کروں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے، تمہارے جیسی بانجھ کے ساتھ تباہ ہونے کے لئے اسے چھوڑ دوں؟''

میں دل مسوس کر رہ گئی۔ رات کو بابر کے سامنے اماں کی سرگرمیوں کا ذکر کیا تو اس نے بھی کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ پہلے سے ہی نہ صرف باخبر ہے بلکہ اماں کی خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم بھی کر چکا ہے۔ اب میرے پاس سوائے رونے اور سلگنے کے کوئی راہ باقی نہ بچی تھی۔

فوزیہ سے بات کر کے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہتی۔ مگر وہ بے چاری بھلا کیا کر سکتی تھی۔ سوائے صبر کی تلقین کے۔ اب بابر کا رویہ پہلے کی نسبت کافی بہتر ہو گیا تھا مگر وہ پہلے جیسی گرمجوشی اور والہانہ پن ناپید تھا جو میرے حواس پر ایک نشہ سا طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب تو وہ وظیفہ زوجیت بھی یوں ادا کرتا جیسے روزمرہ زندگی کے دوسرے امور۔ اس کی محبت اور فریفتگی تو جیسے کوئی قصہ پارینہ بن چکا تھا۔

ایک دن چھٹی والے دن وہ اماں کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ویسے بھی اب وہ گھر میں ہوتا تو زیادہ وقت اماں کی ہمراہی میں گزارتا۔ جب کافی دیر تک وہ باہر نہ نکلا تو میں فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دروازے سے کان لگائے اندر کی صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔

''مجھے تو یہ لڑکی سب سے زیادہ اچھی لگی ہے۔ تو کیا کہتا ہے۔؟''

اماں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ دونوں ماں بیٹا لڑکیوں کی تصاویر دیکھ کر باہمی مشاورت سے کوئی ایک لڑکی پسند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''ٹھیک ہے اماں! اگر تمہیں پسند ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔'' بابر کی آواز سے بے زاری چھلک رہی تھی۔

''اچھی طرح غور سے دیکھ لے۔ بعد میں مجھے الزام مت دینا۔'' اماں نے کہا۔

''سچ کہوں اماں! ان میں سے کوئی بھی لڑکی بانو کی ہم پلہ نہیں ہے۔'' بابر کی اس بات سے دل بھر آیا۔

''خالی حسن کسی کام کا نہیں ہوتا۔عورت بچے پیدا کرتی اور زمین فصل اگاتی ہی اچھی لگتی ہے۔بنجر زمین اور بانجھ عورت دونوں ایکدم بیکار ہیں۔'' اماں نے فلسفہ جھاڑا۔

''چل ٹھیک ہے اماں! میرے خیال میں بھی یہی ٹھیک رہے گی۔''

''جگ جگ جیئو میرے لال! دیکھنا کیسی لڑکی لاتی ہوں تیرے لیے بیاہ کر، چند سالوں میں گھر بھر دے گی بچوں سے۔'' اماں نے بیٹے کی بلائیں لے ڈالیں۔ میں مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور بیڈ پر گر سی گئی۔

☆......☆......☆

ایک دن اماں اس وچولن کیساتھ لڑکی دیکھنے کیلیئے گئی۔شام کو واپس آئی تو لڑکی کی خوبصورتی اور سگھڑاپے کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی۔ بابر جب تک کھانا کھاتا رہا۔اماں کی زبان نان سٹاپ چلتی رہی۔لڑکی کے رنگ وروپ سے لے کر قدوبت اور شکل صورت سے لے کر علم وہنر تک، ہر بات پر روشنی ڈالتی رہی اور میرا دل جلاتی رہی۔

بابر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔جب اماں تعریفوں کے پل بناتے بناتے تھک گئی تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ ''اماں اگر تجھے لڑکی پسند ہے تو، بات پکی کردے۔''

وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا اور میں برتن سمیٹنے لگی۔

''بہو! سن میری چائے میرے کمرے میں پہنچا دینا۔'' اماں کا موڈ آج بڑا خوشگوا تھا۔اس کا مجھے یوں اپنائیت سے بہو کہنا اسی بات کی دلیل تھا۔میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

اماں کو چائے دے کر کمرے میں آئی تو بابر ٹی وی دیکھ رہا تھا۔میں پاس بیٹھ گئی۔

''کیا تم واقعی دوسری شادی کر رہے ہو؟'' میں نے بیوقوفانہ انداز میں پوچھا۔

''کیا ابھی تک تمہیں یقین نہیں آیا؟'' اس نے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے جواب دیا۔

''مگر کہاں گئی وہ محبت؟ جو تم مجھ سے دیوانوں کی طرح کرتے تھے؟''

تمہارے جھوٹ اور دھوکے نے نگل لیا اسے۔'' اس نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔

''میں مانتی ہوں، میں نے تمہیں دھوکہ دیا۔مگر تمہیں کھونے کے ڈر سے دیا۔پلیز میری غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو مجھے۔'' میں

نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے۔

''جسے تم غلطی کہہ رہی ہو۔وہ غلطی نہیں جرم ہے اور ہر جرم کی سزا تو ملتی ہے نا؟ اور پھر تمہاری سزا اتنی زیادہ سنگین بھی نہیں ہے۔جتنا تم واویلا مچا رہی ہو۔تم اسی گھر میں میری بیوی بن کر رہو گی۔تمہیں چھوڑنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''اس نے ریموٹ سے ٹی وی بند کیا اور لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

اگلے دن بابر کی چھٹی تھی۔آج لڑکی والے اسے دیکھنے آ رہے تھے۔انہوں نے شام چار بجے کا وقت دیا تھا۔اماں نے مجھے کچھ چیزوں کی تیاری کا آرڈر دیا تھا۔بابر نے مجھے ضروری سامان لا دیا تھا اور اب میں تیاری میں مصروف تھی۔سارا دن اسی مصروفیت کی نذر ہو گیا۔

ساڑھے چار بجے مہمان آ گئے۔دو خواتین اور ایک مرد تھا۔تینوں لڑکی کی ماں، بڑی بہن اور باپ تھے۔اماں اور بابر ان کے پاس بیٹھے رہے جبکہ میں مہمانوں کی خاطر مدارت میں جتی رہی۔ایک ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھنے کے بعد مہمانوں نے جانے کی اجازت چاہی۔میں بھی پاس ہی کھڑی تھی۔اچانک ذہن میں ایک خیال آیا اور بابر کی ہونے والی ساس سے اپنا تعارف کروانے لگی۔

''میں بابر کی بیوی ہوں۔''میں نے آگے بڑھ کر خوشی خوشی بتایا۔

''ہم جانتے ہیں بیٹی! تمہاری ساس تمہارا تعارف کروا چکی ہیں۔اور دوسری شادی کس مجبوری کی بنا پر کروا رہی ہیں۔اس پر بھی روشنی ڈال چکی ہیں۔''اس عورت کی وضاحت نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔پھیکی سی مسکراہٹ، مسکرا کر رہ گئی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے کی راہ لی اور لمبی تان کر سو گئی۔دو دن بعد ہی ان کا فون آ گیا کہ انہیں یہ رشتہ پسند ہے۔کسی بھی دن آ کر منگنی کی رسم ادا کر جائیں۔اماں کے لئے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی۔اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔

اسی دن محلے کی ایک عورت جو اماں کی گہری سہیلی تھی۔دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اپنی اپنی بہوؤں کی چغلیاں اور غیبت وغیرہ کرتی رہتی تھیں۔اس کا نام رضیہ تھا۔سارا محلّہ اسے خالہ رضیہ کے نام سے پکارتا تھا۔

اماں، خالہ رضیہ کے ساتھ بازار گئی۔بابر کی منگیتر کے لئے دو جوڑے سوٹ اور ایک سونے کی انگوٹھی خرید لائی۔گھر آ کر مجھے وہ چیزیں دکھائیں اور پھر بڑی حفاظت سے اپنے کمرے میں موجود الماری میں رکھ دیں۔

منگنی کے لئے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ فکس کر دی گئی مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔اسی رات کو دو بجے ایک فون کال آئی جس میں بابر کو اطلاع دی گئی کہ''ریاض'' کی بحرین میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی ہے۔یہ خبر سنتے ہی بابر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔فوراً اماں کے کمرے کی طرف بھاگا۔

میں بھی سناٹے میں رہ گئی۔نظروں کے سامنے فوزیہ کا ہنستا مسکراتا چہرہ گھومنے لگا۔بیچاری شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔وہ تو ریاض

کے آنے کی آس دل میں دبائے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی مگر اس کے آنے کے بجائے اس کی اندوہناک موت کی خبر آ گئی۔

اماں بھی روتی پیٹتی اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ جوان بھانجے کی المناک موت کی خبر بجلی بن کر حواس پر گری۔ پھر اسی وقت ہم تینوں سرگودھا جانے کی تیاری کرنے لگے۔

رات کے چار بجے ہم سرگودھا جانیوالی لاری میں بیٹھ رہے تھے۔ راستے میں بابر نے فیصل کو اپنے کزن کی اچانک موت کی اطلاع دی اور اس سے تین چار دن کی چھٹی بھی منظور کروالی۔

جب ہم سرگودھا ریاض کے گھر پہنچے تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ وہاں ایک کہرام برپا تھا۔ ابھی تک فوزیہ اور اس کے گھر والے نہیں پہنچے تھے۔ اماں اپنی بہن یعنی ریاض کی ماں کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

میں خاموشی سے آنسو بہاتی ایک سائیڈ پر ہو کر بیٹھ گئی۔ رہ رہ کے فوزیہ کا خیال آ رہا تھا۔ بیچاری کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ یہ روح فرسا خبر سن کر۔

بابر ڈرائنگ روم میں مردوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے آدھا گھنٹہ بیتا تھا کہ فوزیہ اور اس کے گھر والے بھی آن پہنچے۔ عورتیں گریہ زاری کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئیں۔ فوزیہ کی اماں کے ساتھ خراماں خراماں چلتی ہوئی ایک ایک ایسی ہستی پر نظر پڑی کہ نظریں ہٹانا بھول گئی۔ وہ میری ماں تھی جو فوزیہ کی اماں کے گلے لگی بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''اماں!'' میں تڑپ گئی۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ریاض کی موت کے بہانے میں اپنی ماں کو دوبارہ دیکھ سکوں گی۔ میں بے تابی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی جا کر اماں کے گلے لگ گئی۔

اماں مجھے اچانک سامنے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ پھر مجھے سینے سے بھینچے رونے لگی۔ کافی دیر تک ہم دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگیں سینوں میں دبی بھڑاس آنکھوں کے راستے نکالتی رہیں۔ صورت حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں اماں سے پیچھے ہٹ گئی۔ اماں بھی بنا کچھ کہے سوگوار خواتین کے جھرمٹ میں بیٹھ گئی۔

میں اب فوزیہ سے لپٹ گئی جو اپنی خالہ کے کندھے پر سر رکھے سسک رہی تھی۔ فوزیہ بھی میرے ساتھ لگ کر دھاڑیں مار کے رونے لگی۔

''بانو! ریاض مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا'' وہ روتے روتے گریہ کرنے لگی۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے اور تسلی دینے کی کوشش کرنے لگی۔ شام تک لواحقین رو رو کے ہانپ گئے مگر میت نہ آئی۔ بلکہ اطلاع ملی کہ میت اگلے دن پہنچے گی۔

رات کو میں نے اماں سے بہت باتیں کیں۔ پہلے تو اماں نے حقارت سے دھتکار دیا مگر پھر ماں کی ممتا، ناراضی اور خفگی پر غالب

آ گئی۔میری چارپائی اماں کی چارپائی کے بالکل ساتھ تھی۔

جب اماں کا موڈ پوری طرح بحال ہو گیا تو میں نے پوچھا۔

’’اماں! ابا کیسا ہے؟‘‘

’’مت پوچھ کیسا ہے۔‘‘اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگی۔’’تیرے اس فعل نے جیتے جی مار دیا سب کو۔اس بیچارے کی حالت تو زیادہ ہی خراب ہے۔سارا سارا دن چارپائی پر پڑا کھانستا رہتا ہے۔موت کی دعائیں مانگتا رہتا ہے۔کاش بانو! تم گھر چھوڑنے سے پہلے مر جاتی۔کم از کم اتنے افراد تو جیتے جی مرنے سے بچ جاتے۔تمہارا باپ اور بھائی باہر سر اٹھا کر چلنے کے قابل تو رہتے۔‘‘اماں کی زبان زہر اگلتی رہی اور میں چپ بیٹھ آنسو بہاتی رہی۔

اماں جب کوسنے دے دے کر تھک گئی تو میری طرف متوجہ ہوئی مجھے یوں روتا دیکھ کر اماں کی زبان رک گئی۔

’’تو سنا بانو! اپنے بچوں کو خدا کے آسرے چھوڑ کر، رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگنا کیسا رہا؟ کیا بہت خوش ہے اپنے نئے شوہر کے ہمراہ؟‘‘اماں کی جہاندیدہ نظریں میرے چہرے پر چھائے غم کے بادل دیکھ چکی تھیں۔

’’اچھی ہوں اماں!‘‘میں ہچکیوں کے درمیان بولی۔

’’بچے یاد نہیں آتے؟‘‘

’’ایک ماں ہو کے، مجھ سے ایسا سوال کیسے کر سکتی ہے اماں؟ کیا تم مجھے بھول گئی؟‘‘

اماں میری بات سن کر لا جواب سی ہو گئی۔

’’بہت یاد آتے ہیں اماں۔‘‘میں دلگرفتگی سے بولی

’’کیوں چھوڑ کے چلی آئی ان معصوموں کو؟‘‘اماں نے غصے سے سوال کیا۔

’’بس اماں! مجبوری کی حالت میں یہ انتہائی قدم اٹھایا۔تم تو جانتی ہو، میں اپنے بچوں کو کتنا چاہتی تھی۔‘‘میں نے لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

’’بڑا دل جلتا ہے، ان معصوموں کی حالت دیکھ کر۔کیسی یتیمی برس رہی ہوتی ہے چہروں پر۔‘‘اماں نے ہوکا بھرا۔

’’اماں! تم بچوں سے ملنے جاتی ہو؟‘‘بچوں کی حالت سن کر میں تڑپ اٹھی۔

’’ہاں گئی تھی ایک دن ہمت کر کے، مگر بچوں کی دادی نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔وہ تمہارے اس جرم میں مجھے بھی برابر کا شریک سمجھتے ہیں۔حالانکہ مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ تو فوزیہ کے خالہ زاد بابر سے یارانہ لگائے بیٹھی ہے تو تیرا کوئی ایسا علاج کرواتی کہ گھر سے نکل بھاگنے کے قابل نہ رہتی تو۔‘‘اماں کی زبان زہر اگلنے لگی۔تو میں بے بسی سے وضاحت کرنے لگی۔

اماں! ناصر مجھے جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔نت نئے طریقوں سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔''

''تو مجھے نہیں بتا سکتی تھی؟''اماں نے درشت لہجے میں ڈانٹ پلائی۔''گھر سے قدم نکالنے سے پہلے تم نے کچھ نہ سوچا۔باپ اور بھائی کیسے باہر نکل کر دنیا کا سامنا کریں گے۔ناصر سے جان چھڑانے کے چکر میں اتنی خودغرض کیسے ہوگئی تم بانو؟ اپنے جگر گوشوں کا ہی خیال کر لیتی۔کل کو جوان ہوں گے تو اپنی ماں کے متعلق کیسے کیسے طعنے سنیں گے لوگوں سے۔تب ان کے دل پر کیا بیتے گی، کبھی سوچا تم نے؟ مگر نہیں! تم نے صرف اپنی ذات کا سکھ سکون دیکھا۔''اماں اب ہانپ رہی تھی۔

اماں! اگر تم سب لوگوں کا دل توڑا ہے تو اس کی سزا بھی تو مل گئی ہے نا۔بابر بچوں کی خاطر اب دوسری شادی کرنے جا رہا ہے۔''میں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔تم جیسی بانجھ کو کب تک گلے سے لگائے رکھتا۔''اماں کے لہجے کی سفاکی نے چند لمحوں کے لئے مجھے بھی مبہوت کر دیا۔

''بنا بچوں کے خالی عورت مرد کے بھلا کس کام کی؟ جو عورت ماں بننے کی اہلیت نہیں رکھتی وہ مرد کے لئے دل بستگی کا سامان تو ہو سکتی ہے۔مگر اس کے گھر پر حکومت نہیں کر سکتی۔گھر سے نکلتے وقت تم اتنی بڑی حقیقت کیسے بھول گئی؟ کیا تم نہیں جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ راز فاش ہو کر رہے گا؟''اماں کا لہجہ تیکھا ہوتا چلا گیا۔

میں چوروں کی طرح سر جھکائے خاموشی سے اماں کی لعن طعن سنتی رہی۔اماں جب بولتے بولتے ہانپنے لگی تو خاموش ہوگئی اور لیٹ گئی۔میں بھی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔وہ ساری رات کروٹیں بدلتے ہوئے جاگ کر گزار دی۔صبح دس بجے تک ''ریاض'' کی میت آ گئی۔میت کو غسل دیکر اور کفن پہنا کر تابوت میں بند کر کے لایا گیا تھا۔سب نے تابوت کے اوپر لگے شیشے سے ریاض کا آخری دیدار کیا اور تابوت اٹھا کر قبرستان لے گئے۔

فوزیہ نے ریاض کا چہرہ دیکھا تو پچھاڑیں کھا کھا کر رونے لگی۔میں سارا دن اس کی دلجوئی میں لگی رہی۔تیسرے دن ہم نے رخت سفر باندھا۔رخصت ہوتے وقت میں اماں کے گلے لگ کر پھر سے بہت روئی۔بابر نے آگے بڑھ کر اماں کو سلام کیا اور اماں کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔اماں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ دیا البتہ میری ساس نے اماں کو بلانا پسند نہ کیا اور اماں نے بھی اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

☆......☆......☆

گھر واپس آنے کے بعد ایک عجیب سے سوگوار ماحول میں وقت گزرنے لگا۔بابر کی منگنی بھی وقتی طور پہ ٹل گئی۔اس کی ساس دو عورتوں کے ساتھ اماں کے پاس تعزیت کے لئے آئی۔جب پندرہ بیس دن مزید گزر گئے تو بابر کی ہونے والی ساس نے فون کر کے اماں

سے منگنی کے بارے میں عندیہ لینا چاہا۔میں اس وقت اماں کے پاس بیٹھی اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ جب اس کی کال اماں کے سیل فون پر آئی۔اب اماں کو بھی بابر نے ایک سیکنڈ ہینڈ موبائل سیٹ لے دیا تھا۔اماں کا حال احوال پوچھنے کے بعد جب صابرہ آنٹی اپنے مدعے پر آئیں تو اماں کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔

''میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں بہن! میں یہ منگنی نہیں کر سکتی۔'' میرے چلتے ہاتھ رک گئے۔میں چونک کر اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''مگر کیوں بہن؟'' دوسری طرف سے صابرہ کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

''بس ہے کوئی وجہ۔آپ اپنی بیٹی کے لیے کوئی اور بر دیکھ لیں۔''

''میں جانتی ہوں، آپ ابھی تک اپنے بھانجے کے سوگ سے باہر نہیں نکلیں۔اگر ایسی بات ہے تو چند دن اور ٹھہر جاتے ہیں۔'' وہ مفاہمت اختیار کرتے ہوئے بولی۔

''ایسی بات نہیں ہے صابرہ بہن! اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ مرنے والا میرا بھانجا تھا مگر اس کی منگنی بھی میری بھانجی سے بچپن میں ہی طے پا گئی تھی۔اب میری بھانجی کا صدمے سے برا حال ہے۔اس کا دکھ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔میں اس کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں سمجھی نہیں بہن! جو بھی کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔'' آنٹی صابرہ سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بننے کا ناٹک کر رہی تھی۔

''صاف بات ہے بہن! میں اب اپنی اس دکھیاری بھانجی کو ہی اپنی بہو بنانا پسند کروں گی۔شاید اس طرح اس کے دکھوں کا کچھ مداوا ہو سکے۔'' اماں نے اب بغیر کسی لگی لپٹی کے سیدھی بات کی۔

''اچھا بہن! جیسی تمھاری مرضی۔یہ تو من چلے کا سودا ہے۔اس میں زور زبردستی تھوڑی چلتی ہے۔'' صابرہ نے ہتھیار پھینک دئے۔

''دل دکھانے پر معافی چاہتی ہوں۔ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' اماں نے کال ڈراپ کر کے میری طرف فخریہ انداز میں دیکھا۔میں ابھی تک ہونق چہرہ لیے اماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیسا لگا بہو میرا فیصلہ؟'' اماں کے چہرے پر عیارانہ سی مسراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''مطلب......اب فوزیہ بابر کی دلہن بن کر اس گھر میں آئے گی؟'' میں بے یقینی سے پوچھنے لگی۔

''ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' اماں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''آپ میری عزیز سہیلی کو میری سوتن بنا کر میرے سامنے لانا چاہتی ہیں؟'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اگر نہ بنانا چاہو گی سوتن، تو نہیں بنے گی۔یہ تو اب تمہارے رویے پر انحصار کرے گا۔شادی کے بعد بھی تو سہیلیوں کی طرح

ہنسی خوشی اکھٹی زندگی گزار سکتی ہو نا دونوں۔'' اماں نے تاویل دی۔ جسے میں نے سنتے ہی اپنے ذہن میں رد کر دیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے بابر کے آنے کا بے تابی سے انتظار تھا۔

میری پیاری سہیلی میری سوتن کے روپ میں۔ کبھی نہیں۔ میں بے چینی سے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ رات کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جیسے ہی بابر نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی چلی آئی۔

''بابر! کچھ سنا تم نے؟''

''کیا؟'' اس نے قمیض اتارتے ہوئے جواب دیا۔

''اماں نے جو لڑکی تمہارے لئے پسند کی تھی، اسے ریجیکٹ کر دیا۔'' میں پھولی ہوئی سانس ہموار کرنے کو رکی۔

''تو؟'' اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے میری طرف غور سے دیکھا۔

''تو؟ یعنی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اس بات سے؟'' میں حیران سی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''نہیں...... اماں میرے لئے جو بھی فیصلہ کریں گی۔ مجھے منظور ہو گا۔'' اس نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر لیا۔

''مگر اگلی بات سن کر تمہیں ضرور فرق پڑے گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

''اچھا! وہ کیا ہے بھلا؟'' اس نے ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے سوال کیا۔

''اماں اب تمہاری شادی...... فوزیہ سے کرنا چاہتی ہیں۔'' میں نے سرسراتی آواز میں سرگوشی کی۔ مجھے یقین تھا کہ بابر کے لئے یہ انکشاف بہت دھماکہ خیز ثابت ہو گا مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ بات بھی پرسکون انداز میں سنی۔

''تو اس میں کیا انوکھی بات ہے؟ میری خالہ زاد ہے۔ اس سے میرا نکاح شرعی اور قانونی طور پہ بالکل جائز ہے۔''

''یعنی یہ بات تم پہلے سے جانتے تھے؟ اس کے پرسکون اور مطمئن لہجے نے میرے تن بدن میں آگ بھر دی۔

''ہاں! اماں نے کل مجھ سے بات کی تھی اور میں نے اپنی رضامندی بھی دے دی تھی۔ سچ پوچھو تو مجھے فوزیہ کے ساتھ بڑی ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔''

''اوہ...... تو تم اس سے نکاح کر کے اس کے دکھوں کا مداوا بننا چاہتے ہو؟'' میرا لہجہ طنز لئے ہوئے تھا۔

''یہی سمجھ لو۔'' اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

تم اتنا بدل جاؤ گے بابر...... کبھی خوابوں میں بھی سوچا نہ تھا۔'' بے بسی اور احساس محرومی نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا۔

''پلیز! یہ شکوے شکایتوں کا رجسٹر کھول کے مت بیٹھ جانا۔ سارا دن کام کر کے گھر آتا ہوں تو تمہارے دکھڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ تنگ آ گیا ہوں میں تو اپنی زندگی سے۔'' اس نے ریموٹ اٹھایا، ٹی وی آف کیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا مگر میری نیند تو جیسے مجھ

سے ہمیشہ کے لئے روٹھ چکی تھی۔ خاموشی سے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔ رات کے نجانے کس پہر جا کر آنکھ لگی۔

☆......☆......☆

بابر کام پر گیا تو سب سے پہلے کمرے میں آ کر فوزیہ کا نمبر ملایا۔

"اس نے دوسری بیل پر ہی فون اٹھالیا۔

"ہیلو فوزیہ! کیسی ہو؟" میں جلد از جلد اپنے مدعا پر آنا چاہتی تھی۔

"کیسی ہو سکتی ہوں؟ تم اندازہ کر سکتی ہوں۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا

"فوزیہ! ایک بات تم سے کرنے جا رہی ہوں۔ پلیز تحمل سے میری پوری بات سننا۔ میں جانتی ہوں، تمہیں اس بات سے بہت تکلیف پہنچے گی مگر میری ساس کی خودغرضی اور بے حسی سمجھ لو۔" میں نے تمہید باندھنے کے بعد تھوڑی دیر کیلئے خاموشی اختیار کی تا کہ وہ اس بری خبر سننے کے لئے خود کو تیار کر سکے۔

"کیا کہنا چاہتی ہو بانو؟ کھل کر کہو۔" اس نے معتدل لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے اپنے ذہن میں الفاظ کو مناسب ترتیب دی اور گویا ہوئی۔

"فوزیہ! اماں نے، یعنی تمہاری خالہ نے تمہیں اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

میری بات سننے کے بعد دوسری جانب مکمل خاموشی چھا گئی۔ مجھے دل ہی دل میں فوزیہ سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ بیچاری کے دل پر یہ خوغرضانہ بات سن کر کیا بیت رہی ہوگی۔

"فوزیہ! تم سن رہی ہونا؟ میں کیا کہہ رہی ہوں؟" میں نے پیار بھرے لہجے میں پکارا۔

"ہاں بانو! اچھی طرح سن لیا اور سمجھ بھی لیا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"اس طرح خود کو اذیت مت دو یار! فوراً انکار کردو۔ میں جانتی ہوں تم میری سوتن بننا کبھی قبول نہیں کروگی۔ بلکہ ابھی تک تو تمہیں ریاض کی یادوں کے پنجرے سے رہائی بھی نہیں ملی ہوگی۔"

"بیشک ریاض کی یادیں میرے جسم کے روم روم میں بسی ہیں مگر میرے مستقبل کا فیصلہ میرے ماں باپ ہی کریں گے بانو۔ میں تمہاری طرح کوئی بھی فیصلہ خود سے نہیں کروں گی۔" اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا مجھے اس سے اس قسم کے جواب کی ہرگز امید نہ تھی۔ اس ک بات سن کر میں شاکڈ رہ گئی۔

"یعنی تم بابر سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو۔؟" میں نے بڑے دکھ اور بے یقینی کی حالت میں پوچھا

"کیا کروں بانو؟ زندگی نے اس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا کہ میں بھی مجبور ہوگئی۔" اس کی آواز میں نمی سی گھل گئی۔

''ہونہہ مجبوری......اپنی خودغرضی کو مجبوری کا نام مت دو فوزیہ۔'' میرے ہونٹوں پر زہر خند نمودار رہوا۔

''خودغرضی ہی سمجھ لو بانو! میرا منگیتر شادی سے دو ماہ پہلے مر کے مجھ پر منحوس ہونے کا لیبل لگا گیا۔اب کوئی اتنی آسانی سے مجھے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔منہ پر نہیں، مگر دل میں سارے رشتہ دار مجھے منحوس سمجھ رہے ہیں۔ریاض کی موت کا ذمہ دار مجھے گردانتے ہیں۔باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہونے کی بجائے تمہاری سوتن بننا زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔''

''بہت ہی کم ظرف نکلی تم فوزیہ!'' میں نے حقارت سے یہ فقرہ ادا کیا۔

''ابھی تم غصے میں ہو اس لئے جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو۔تنہائی میں، میری جگہ پہ خود کو رکھ کے سوچو گی تو تمہیں میں بالکل بے قصور اور بے بس نظر آؤں گی۔''

میں نے کال ڈراپ کر دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

اور پھر واقعی ٹھنڈے دماغ سے جوں جوں فوزیہ کی باتوں پر غور کرتی گئی۔مجھے ان میں چھپی حکمت دکھائی دینے لگی۔یہ بات تو طے تھی کہ بابر نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ ہر حال میں اس فیصلے پر عمل درآمد کی کوشش بھی کرے گا تو جب بابر کی محبت کا بٹوارہ ہی مقدر ٹھہرا تو پھر یہ دوسری حصہ دار فوزیہ کیوں نہیں۔

کسی نہ کسی عورت کو تو اپنی سوت کے روپ میں قبول کرنا ہی ہے تو پھر فوزیہ ہی سہی۔بچپن کی سہیلی اور راز دار ہے۔شاید روایتی حریف ثابت نہ ہو۔شاید میرے احساسات اور جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔جیسے جیسے تمام پہلوؤں پر سوچتی گئی۔مجھے یہ فیصلہ اپنے حق میں بہتر سے بہتر دکھائی دیتا گیا۔

آخر پورے دو گھنٹے خود سے جنگ لڑ کے مختلف تاویلیں دے کر اپنے آپ کو قائل کر لیا کہ بابر اور اماں کے اس فیصلے کو نہ صرف دل و جان سے قبول کر لوں بلکہ اس کے حق میں زور بھی لگاؤں۔دل کو سمجھا بجھا کر جب کسی ایک نکتے پر آمادہ کر لیا تو دماغ بھی اب قدرے پر سکون انداز میں سوچنے لگا۔

شام تک میں نے خود کو ذہنی طور پہ ہر سمجھوتے کے لئے تیار کر لیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ بابر کے آنے تک، میرا رویہ کافی حد تک خوشگوار ہو چکا تھا۔کھانے کے بعد میں نے برتن سمیٹتے ہوئے اماں سے چائے کا پوچھا تو وہ بھی ایک لمحے کے لیے حیران ہوئی۔

''ہاں بہو! چائے بنا کر میرے کمرے میں لے آ۔آج بڑی ٹھنڈ ہے۔ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔'' اماں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نے کچن کا رخ کیا۔

چائے کا مگ ٹرے میں رکھے جب اماں کے حضور حاضر ہوئی تو وہ ٹانگیں کمبل میں دیئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔میں

نے چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور اماں کے پاس بیڈ پر ٹک گئی۔

''اماں! مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔'' میں نے اماں کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔ اماں میرے رویے اور اطاعت گزاری سے نہال ہونے لگی۔ پھر بھی تصدیق ضرور سمجھی۔

''کیسا فیصلہ بہو؟''

''فوزیہ کو بابر کی دلہن بنانے کا فیصلہ...... مجھے اب کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے نظریں جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔

''جگ جگ جیو بہو! سدا سہاگن رہو۔ ہماری بات کے سامنے سرِتسلیم خم کر کے تم نے اپنے عقلمند ہونے کا ثبوت دیا۔ اگر تم نہ بھی مانتی تو ہونا تو پھر بھی یہی تھا مگر تم نے سمجھوتہ کر کے، ہمارے علاوہ اپنے لئے بھی آسانیاں پیدا کیں۔ خوش رہو۔'' اماں کے ستائش بھرے جملے بھی دل میں پیدا ہونے والی کسک کو ختم نہ کر سکے۔

تھوڑی دیر خاموشی سے بیٹھی اماں کی ٹانگیں دباتی رہی۔ اور اماں بھی چپ چاپ چائے پیتی رہی۔ چائے ختم ہوئی تو اماں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

''بہو اب بس کرو۔ کب تک ان بوڑھی ہڈیوں کو دبا دبا کر حرارت پہنچانے کی کوشش کرتی رہو گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔''

میں نے کپ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆......☆......☆

اپنے کمرے میں آئی تو بابر بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ اس کے مدھم خراٹوں کی آواز کمرے کے سکوت میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے اس کے پیروں تلے دبے ہوئے کمبل کو آہستگی سے کھینچا اور بابر کے سینے تک اوڑھا دیا۔ خود بھی اپنی سائیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ آج اماں کے شفیق رویے نے بڑی حد تک دل پہ پڑے بدگمانی کے داغ دھو ڈالے تھے۔ اب میں خود کو اماں کی جگہ پہ رکھ کے سوچ رہی تھی۔

بابر اماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی اولاد کو اپنی گود میں کھلانا اماں کا فطری حق ہے اور اس سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ کاش میں نے ارباز کی پیدائش کے فوری بعد یہ انتہائی قدم نہ اٹھایا ہوتا اور آج بابر کی محبت اور حق ملکیت کی تقسیم کے جاں گسل مراحل سے یوں نہ گزرنا پڑتا۔ میرے دل سے ایک ہوک نکلی اور آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ اور یہ نمک ملا پانی آنکھوں کے حصار کو پھلانگ کر گالوں کے رقبے کو سیراب کرنے لگا۔

☆......☆......☆

اور پھر اماں کا رویہ حیرت انگیز حد تک بدل گیا۔ اب وہ مجھ سے نرم لہجے میں بات کرتی اور گھر کے دیگر چھوٹے موٹے معاملات میں بھی صلاح مشورہ لینے لگی۔ بابر بھی اس کایا پلٹ پر بڑا حیران تھا۔ آخر رات کو تنہائی ملتے ہی بول اٹھا۔

''یہ تم نے اماں پر کیا جادو کر دیا؟ بڑی مٹھاس انڈیل رہی ہے آج کل تم پر۔'' وہ شرارت بھرے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں نے کیا جادو کرنا ہے کسی پر...... میرا جادو اتنا ہی سحر انگیز ہوتا تو تمہیں نہ اپنے بس میں کر لیتی۔'' میں نے دلگرفتگی سے جواب دیا اور اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ اس نے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

''بانو! تم بہت اچھی ہو۔ تم نے اماں کو اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا۔ اسی لیے اماں تم سے اتنی خوش ہیں۔''

میں نے نظریں اٹھائیں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں آج کافی دنوں بعد اپنے لئے محبت کی تھوڑی سی رمق دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا کرتی؟'' میں نے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔ ''کیا کرتی میں؟ تم ہی بتاؤ، کیا کوئی اور آپشن بچا تھا میرے پاس؟ اماں کی ہاں میں ہاں نہ ملاتی تو تم میرے ہاتھ میں طلاق نامہ تھما کر، دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتے۔ اور یہ سب کرنے کے بعد بھی دوسری شادی کر لیتے۔ جبکہ میں...... میں کہاں جاتی۔ بتاؤ مجھے؟ کوئی ٹھکانہ ہے میرے پاس؟'' میری آواز رندھ گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بابر نے آگے بڑھ کے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور شفقت سے میری کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا

''مت رو بانو! تمہارے رونے سے دل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ دل چھوٹا مت کرو۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ اسی گھر میں رہو گی بلکہ ہم سب مل کر رہیں گیا ور پھر فوزیہ تو تمہاری عزیز سہیلی ہے نا۔ وہ تم سے برا سلوک کیوں کرے گی بھلا؟''

''سوت بننے کے بعد اس کا رشتہ بدل جائے گا بابر...... تم نے سنا نہیں کہ سوتن تو چاہے مکھن کی بنی ہو، پھر بھی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔'' میں نے ہچکیوں کے درمیان جواب دیا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''میری بھولی بانو! تم بہت معصوم ہو، کسی بچے کی طرح۔'' اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور مجھے ساتھ لیے ہی لیٹ گیا اور میں اس کے سینے پر سر رکھے، خوش فہمی کے دریا میں غوطے لگانے لگی کہ مجھ سے میرا یہ مقام اور بابر کے دل سے میری محبت کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا۔

☆......☆......☆

اگلے دن گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر میں نے فوزیہ کو کال ملائی۔ خوشگوار لہجے میں اس کا حال احوال پوچھا تو اس نے بھی اپنائیت سے بات کی۔

''بانو! تم سے شرمندہ ہوں، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ سہیلی کے گھر میں نقب لگا کر اپنی کم ظرفی کا ثبوت دے رہی ہوں۔'' اس کے لہجے سے ندامت مترشح تھی۔

''ارے نہیں ڈیئر! اس میں شرمندہ ہونے والی کیا بات ہے بھلا؟ یاد ہے نا ہم دونوں بچپن میں ایک دعا بڑی شد و مد سے مانگا

کرتیں تھیں کہ اللہ کرے ہماری شادی ایک ہی گھر میں ہو۔ہم دونوں کے دلہے سگے بھائی ہوں اور ہم دیورانی جیٹھانی بن کر ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔بچھڑنے کا ڈر ہی نہ رہے۔سمجھو ہماری وہ دعا اب قبول ہوگئی۔''میں کھوکھلی سی ہنسی ہنسی جبکہ آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

میری بات سن کر وہ گم صم سی ہوگئی۔

''جانتی ہوں بانو! اس وقت تمہارے دل پہ چھریاں چل رہی ہیں۔یہ فیصلہ یقیناً تمہارے لئے آسان نہیں تھا۔یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا میری ذات پر۔''اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تم چاہو تو یہ احسان اتار سکتی ہو۔''میں نے فضا پہ طاری جمود کو توڑنے کی خاطر اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

''مگر کیسے؟''اس نے چونک کر پوچھا۔

''اپنی گود کا پہلا بچہ میری گود میں ڈال دینا۔بولو منظور ہے؟''

میری بات سن کر وہ ہنس دی۔

''بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بانو! میرے ہاں جتنے بھی بچے ہوئے سب تمہارے۔کیا یاد کرو گی۔''اس کے لہجے کی سنجیدگی ہوا ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ شوخی در آئی تھی۔

''نہیں! مجھے صرف تمہارا پہلا بچہ چاہیے۔باقی جتنے دل چاہے پیدا کرتی رہنا اور سنبھالتی رہنا۔میں تو صرف اپنے کو سنبھالوں گی۔''میرے لہجے میں چھپی شرارت محسوس کر کے وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔میری ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی۔

اگلے پندرہ دن اماں نے بڑی بیتابی اور اضطراب میں گزارے۔ہر روز اپنی بہن یعنی فوزیہ کی اماں سے منگنی کے متعلق مشاورت کرتی۔آخر روز روز کی کالز سے تنگ آکر فوزیہ کی اماں نے ایک دن انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ہی ڈالی۔اماں نے پہلی بہو کے لئے خریدے گئے کپڑوں کے جوڑے اور سونے کی انگوٹھی الماری سے نکالی اور جانے کی تیاری زور وشور سے ہونے لگی۔

جمعہ والے دن بابر کو فیکٹری سے ہفتہ وار چھٹی ہوتی تھی۔لہٰذا جانے کے لیے جمعہ کا دن ہی طے پایا۔مجھے بھی اماں نے ساتھ چلنے کی آفر کی مگر میں نے انکار کر دیا۔وجہ صاف ظاہر تھی۔فوزیہ کے ساتھ والا گھر میرے میکے کا تھا۔میں کیسے وہاں جا کر کوئی تماشا کھڑا کر سکتی تھی۔

جمعہ والا دن بھی آن پہنچا۔بابر مٹھائی کی ٹوکری لے آیا۔اماں نے بھی سارا سامان اکٹھا کر لیا تھا۔بابر نے جانے سے پہلے مجھے، بیرونی دروازہ سارا دن بند رکھنے کی تاکید کی اور کہا کہ ہماری غیر موجودگی میں گھبرانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔میں نے مسکراتے ہوئے انہیں الوداع کیا اور ان کے جانے کے بعد بیرونی دروازے کو لاک کر کے اندر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

سارا دن عجیب سا اضطراب چھایا رہا جسم و جان پر۔کبھی اندر جاتی بیڈ پر لیٹ جاتی۔پھر بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر اٹھ

بیٹھتی اور باہر صحن میں آجاتی۔ صحن تھا ہی کتنا بڑا۔ تھوڑی دیر تک چکراتی اور پھر اپنے کمرے میں واپس چلی آتی۔ شام کو دونوں ماں بیٹا واپس آئے تو بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔

پورے محلے میں اماں نے مٹھائی بانٹی۔ اب اماں دن رات بابر کی شادی کے گیت گاتی رہتی۔ منگنی کے موقع پر ہی دو ماہ بعد کی تاریخ شادی کی رکھ دی گئی اور یہ دو ماہ تیاری میں کیسے گزرے پتا بھی نہ چلا۔ گھر میں دو بیڈروم تھے۔ ایک اماں کے پاس جبکہ دوسرا ہمارے استعمال میں تھا۔

اب فوزیہ کے لیے مزید ایک بیڈروم کی ضرورت تھی۔ دونوں کمروں کیساتھ ایک چھوٹا کمرہ جو بطور اسٹور استعمال ہوتا تھا۔ اماں نے اپنا سامان اس کمرے میں سیٹ کرلیا اور اپنا کمرہ فوزیہ کے لئے خالی کردیا۔

پورے گھر میں سفیدی کروائی گئی۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی فوزیہ کا جہیز کا سامان آگیا جو اس کے کمرے میں آراستہ کردیا گیا۔ اماں نے بری میں بہت ہی خوبصورت اور قیمتی جوڑے بنوائے اور ساتھ میں اپنی شادی کا سنبھالا ہوا زیور تڑوا کر نئیفیشن کا زیور بھی بنوایا گیا۔

ہر کام اماں بڑی خوشی اور لگن سے کر رہی تھی اور مجھے ان دنوں ارینج میرج اور لو میرج میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس کا اندزہ بخوبی ہو رہا تھا۔

آخر شادی کا دن آن پہنچا۔ بابر کی شادی کی ہر رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ قریبی عزیزوں کو بلایا گیا۔ رسم حنا کے موقع پر ایک رشتہ دار خاتون نے اماں کو چوٹ لگائی۔

"آپا رقیہ! تم تو خیر سے بابر کی شادی ایسے دھوم دھام سے کر رہی ہو جیسے یہ اس کی پہلی شادی ہو۔"

میں جو اسٹیج کے ایک کونے میں کھڑی ہو کر بابر کو تیل مہندی لگتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس عورت کی بات سن کر چونک کر اماں کی جانب دیکھنے لگی۔ اماں نے جوابی وار کرتے ہوئے ذرا دیر نہ لگائی۔

"بہن! تم تو جانتی ہو میرے بچے کی پہلی شادی کس سے اور کن حالات میں ہوئی تھی۔ اب تم سے کیا پردہ، تم تو ہر بات جانتی ہو۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اپنے دل کے سارے ارمان اسی پر نکالوں گی۔ اللہ کا شکر ہے، اس نے یہ دن دکھایا ورنہ مجھے تو کوئی امید نہ تھی کہ یہ دن زندگی میں کبھی دیکھوں گی۔" اماں نے بات مکمل کر کے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے ساری باتیں سن کر بھی یہی ظاہر کیا کہ جیسے کچھ بھی نہ سنا ہو۔

بارات والے دن بابر دلہا بنا بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ میری نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ بلیک شیروانی اور وائٹ لٹھے کی شلوار میں اس کا روپ خوب کھل رہا تھا۔ میں نے آج بھی بارات کے ساتھ نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ بابر اور اماں نے

بھی زیادہ زور نہ لگایا۔ایک بوڑھی عورت کو میرے پاس چھوڑ کر سب چلے گئے۔

سارا دن سخت اذیت میں گزرا۔ بار بار تخیلاتی پرواز کے ذریعے شیخوپورہ پہنچ جاتی۔اب بابر کا نکاح پڑھایا جا رہا ہوگا فوزیہ کے ساتھ۔اب کھانا کھلایا جا رہا ہوگا۔اب دودھ پلانے کی رسم ادا کی جا رہی ہوگی۔اور بابر اپنی سالیوں کو دودھ پلائی کا نیگ دے رہا ہوگا مگر بابر کی تو کوئی سالی نہ تھی۔فوزیہ بھی میری طرح اپنی اماں کی اکلوتی تھی۔ہم دونوں نے اپنی ماؤں کی اکلوتی بیٹیاں ہونے کے ناطے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میری شادی پہ فوزیہ دودھ پلائی کی رسم ادا کرتے ہوئے ،میرے دلہے کی سالی کا رول ادا کرے گی جبکہ اس کی شادی پر مجھے اس کے دلہے کی سالی کا کردار ادا کرنا تھا مگر قسمت نے کچھ ایسا مذاق کیا تھا ہمارے ساتھ کہ فوزیہ تو اپنا کردار ادا کر چکی تھی۔مگر میں اس کے دلہے کی سالی نہ بن سکی۔یہ بات یاد آتے ہی ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ نمودار ہوئی۔

’’اری بٹیا! تم نے تو سارا دن بھوکا رہنے کی قسم کھا رکھی ہے مگر میرا کیا دوش ہے۔مجھے تو کچھ کھانے کے لئے دے دو۔‘‘ سوکھی چمرخ بڑھیا جو میری طرف کافی غور سے دیکھ رہی تھی۔مجھے مسکراتا دیکھ کر بول اٹھی۔

’’جی اماں! ابھی لاتی ہوں کچھ کھانے کو۔‘‘میں کچن میں گئی۔

صبح کے بچے ہوئے نان چنے لا کر اس کے آگے رکھ دیئے۔وہ کھاتے ہوئے بولی۔

’’تم بھی کچھ کھا لو بٹیا!‘‘

’’مجھے بھوک نہیں ہے۔‘‘میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

’’ہاں بھئی شوہر کی دوسری شادی ہو رہی ہو تو بیوی بیچاری کی بھوک تو اڑ جائے گی نا۔‘‘

’’ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘میں اس بڑی بی سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔

’’ویسے اس کی دوسری شادی کرنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔خیر سے اتنی خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے کون مرد کسی دوسری کی طرف دیکھے گا۔‘‘

’’بس ہے نا ایک وجہ!۔‘‘میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

’’کیسی وجہ بٹیا؟‘‘بڑی بی نے عینک کے دبیز عدسوں سے جھانکا۔

’’کیونکہ میں اپنے شوہر کو اولاد نہیں دے سکتی۔‘‘میرے لہجے میں زمانے بھر کا کرب سمٹ آیا۔

’’کتنی دیر ہوگئی شادی کو؟‘‘

’’دو سال ہونے کو آرہے ہیں۔‘‘

’’صرف دو سال؟‘‘بڑی اماں کے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔’’دو سال تو کوئی ایسی مدت نہیں کہ اولاد کی خواہش پوری

ہونے کی امید نہ رہے۔''

''بس ہے نا کوئی وجہ......آپ نہیں جانتیں۔ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔''

''ہیں؟'' بڑی بی نے حیرانی سے دیدے گھمائے۔

میں اٹھ کر کچن میں جانا چاہ رہی تھی تاکہ اپنے لیے ایک کپ چائے کا تیار کرسکوں۔ اسی وقت بیرونی دروازہ بجنے لگا۔ میں چونک کر ادھر دیکھنے لگی۔

''اس وقت کون ہوسکتا ہے بھلا؟'' میں زیرلب بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی جانب چل دی۔

''کون ہے؟'' میں نے جھری سے جھانکا۔

''ہم ہیں باجی! پلیز دروازہ کھولیں۔'' سامنے دو نوعمر لڑکے کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا توڑا سا پکڑا ہوا تھا۔ میں نے خوف سا محسوس کیا اور پھر بولی۔

''بھائی تم کون لوگ ہو؟ اور کیا لینے آئے ہو؟''

''باجی! ہمیں بابر بھائی نے بھیجا ہے۔ آپ نے لگتا ہے ہمیں پہچانا نہیں۔ ہم مسہری تیار کرتے ہیں۔ یاد نہیں آپ کو؟ آج سے دو سال پہلے بھی ہم اسی گھر میں ایک مسہری تیار کر کے گئے تھے۔'' انہوں نے پچھلا حوالہ دیا تو دل پھر سے سلگنے لگا۔ دروازہ کھول کر انہیں اندر آنے دیا۔ وہ اندر آچکے تو پیچھے سے دروازہ بند کردیا۔ انہیں فوزیہ کا کمرہ دکھایا۔ وہ دونوں کمرے میں چلے گئے اور میں نے کچن کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

شام کے چھ بجے بابر نے فون کیا۔ میں نے کال ریسیو کی تو چھوٹتے ہی بولا۔

''کیسی ہو؟ کیا کررہی ہو؟''

اس کا بچگانہ سوال سن کر میں ہنس دی۔

''کیسی ہوسکتی ہوں؟ تم باآسانی اندازہ کرسکتے ہو۔ اور کیا کررہی ہوں، یہ سوال بھی بے تکا سا ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ! مسہری بنانے والے لڑکے آئے کہ نہیں؟''

''ان کو آئے ہوئے تو ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہوگیا۔'' میں نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''اب تک تو انہوں نے کام نمٹا لیا ہوگا۔ ہے نا؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں شاید! میں نے دیکھا نہیں کہ ان کا کام کہاں تک پہنچا ہے؟''

''تم ایسا کرو۔ انہیں چائے وغیرہ پلاؤ۔ کام ختم کر کے وہ چلیں جائیں گے اور ہم بھی یہاں سے بس نکلنے والے ہیں۔ ایک گھنٹے

تک گھر پہنچ جائیں گے۔"

"اچھا!" میں نے مختصر جواب دیا اور ان لڑکوں کے لیے چائے بنانے چل دی۔

☆......☆......☆

چائے کے کپ ٹرے میں رکھے میں نے دروازے کو ناک کیا تو ایک لڑکے نے دروازہ کھول کے ٹرے میرے ہاتھ سے پکڑ لی۔

"کتنا کام رہ گیا ہے؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"بس باجی! دس پندرہ منٹ مزید لگیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میں پھر سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

صحن میں چارپائی پر بیٹھی بڑی بی بڑی باریک بینی سے میری حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی اکتاہٹ کا شکار ہونے لگتی تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کے قمیض کے پہلو میں بنی جیب سے تسبیح نکالتی اور زیرلب کچھ پڑھتے ہوئے تسبیح کے دانے گرانے لگتی۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ لڑکے کمرے سے باہر نکلے اور جانے کی اجازت چاہی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بیرونی دروازہ بند کیا اور فوزیہ کے حجلہ عروسی میں داخل ہوگئی۔

اس کے جہیز میں دیئے گئے نئے نکور بیڈ پر گلاب کے اصلی پھولوں سے مسہری تیار کی گئی تھی جن کی خوشبو سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ میں حسرت بھری نگاہ سے مسہری کو تک رہی تھی۔ پھولوں کو چھو کر ان کی تازگی اور خوشبو کو محسوس کر رہی تھی۔ آج میرا محبوب اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ پھر سے سہاگ رات منائے گا۔ جو پیار اور وارفتگی مجھ پر لٹاتا تھا۔ آج کسی اور پر لٹائے گا۔

میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ اور آنکھوں سے آنسو چھما چھم برس رہے تھے۔ تھوڑی دیر مسہری کے پاس کھڑی روتی رہی۔ پھر آنسو پونچھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ مجھے ان کے آنے سے پہلے خود کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ میری رونی صورت دیکھ کر فوزیہ اور میری ساس پر اچھا تاثر نہیں پڑے گا۔ وہ سمجھ جائیں گی کہ بابر کی شادی کو ایک اذیت ناک سزا سمجھ کے بھگت رہی ہوں۔

میں نے اپنے کمرے کے واش روم میں جا کر منہ دھویا اور بال سنوار کر ہلکے کلر کی لپ اسٹک ہونٹوں پر جمالی۔ تھوڑی دیر بعد ہی بارات واپس آ گئی۔ مہمانوں کی آمد سے گھر بھر سا گیا۔ ہر طرف چہل پہل ہونے لگی۔

اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہندوانہ رسموں کا پرچار شروع کر دیا۔ بابر اور اس کی دلہن کو بیرونی دروازے کی دہلیز پر کھڑا کر کے ان کے سروں پر سے پانی وار کر پینے والی قبیح رسم ادا کی گئی۔ اس کے بعد فوزیہ کو دہلیز پکڑائی کا نیگ دے کر اندر لایا گیا۔ سیدھا اس کو اس کے حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔

مجھے سامنے دیکھ کر فوزیہ میرے گلے لگ کر مجھ سے ملی اور پھر ٹانگیں لٹکا کر اپنے آراستہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی فینسی، اونچی ہیل والا جوتی کے اسٹیپ کھولنے کے لیے نیچے جھکی تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے نیچے جھکنے سے منع کر دیا اور خود زمین پر بیٹھ کر اس

کے جوتے اتارنے لگی۔

میری اس حرکت سے فوزیہ خجالت محسوس کرتے ہوئے اپنے پاؤں پیچھے کھینچنے لگی۔میں نے نرمی سے اس کے دونوں پاؤں تھامے اور جوتے کھولنے لگی۔جوتے اتار کر میں اس کے مہندی لگے خوبصورت پیروں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔

''پلیز نہیں بانو!'' اس نے احتجاج کیا اور اپنے پاؤں اوپر کھینچ لئے۔

اب وہ دونوں گھٹنے سمیٹے دلہنوں کے مخصوص پوز میں بیٹھی تھی۔میں بھی زمین سے اٹھ کر اس کے برابر اس کے سامنے آ بیٹھی۔

''زندگی کا نیا سفر بہت مبارک ہو پیاری۔'' میں نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

''مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا بہت شکریہ بانو!'' اس نے میری طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔اب اسے کیسے بتاتی کہ شوہر اور محبوب کو کسی دوسرے کے ساتھ بانٹنا کس قدر اذیت ناک ہے اور یہ تصور مجھے پل پل جان کنی کی سی کیفیت سے گزار رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک فوزیہ کے کمرے میں ہنسی مذاق کی محفل جمی رہی اس کے بعد اماں کی کمرے میں آمد کے ساتھ ہی بھیڑ چھٹنے لگی اور وہاں اب صرف میں اور اماں رہ گئیں۔

''بانو بہو! اب تو بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کر۔صبح سے کام کر رہی ہے تھک گئی ہوگی۔''

''جی اماں! میں شکستہ دلی سے بیڈ سے نیچے اتری اور کمرے سے باہر آ گئی۔

دروازے سے نکلتے ہی بابر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔وہ مجھ سے نظریں چراتا ہوا اندر چلا گیا اور میں اس کی لاتعلقی دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔

مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔وہ کمرہ جو میرا اور بابر کا ہوا کرتا تھا مگر اب صرف میرا تھا۔جب سے اس گھر میں آئی تھی۔بابر کے بغیر کبھی تنہا نہیں سوئی تھی مگر آج پہلا موقع تھا جب میں تھی اور میری تنہائی تھی۔

نڈھال سی آ کر بیڈ پر لیٹ گئی مگر ذہنی طور پہ پھر سے، بابر اور فوزیہ کے پاس پہنچ گئی۔اب بابر کمرے میں فوزیہ کے پاس بالکل اکیلا ہوگا۔اس نے دروازہ لاک کر لیا ہوگا۔وہ خراماں خراماں قدموں سے اس کی جانب بڑھے گا پھر اس کے سامنے بیٹھ کر، اس کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھائے گا۔پھر......

میں تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔یہ تصور ہی میرے لیے سوہان روح تھا کہ بابر آج کسی اور کے پہلو کو آباد کرے گا۔میں بیڈ سے نیچے اتری اور اس دیوار کے ساتھ کان لگا دیا جو دونوں کمروں کے دمیان کھڑی تھی۔

دوسری جانب سے ہلکی سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔کسی بات کی سمجھ تو نہیں آئی۔ہاں یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ بابر اپنی نئی ہمسفر کے ساتھ میٹھے لہجے میں پیار بھری مدھم سرگوشیوں میں مصروف ہے۔ان کی دھیمی مدھری باتیں مجھے دھیمی آنچ پر سلگانے لگیں۔میں اضطراری حالت میں کمرے میں چکر لگانے لگی۔

دماغ کی رگیں اعصابی دباء سے جیسے پھٹنے والی ہوگئیں۔اسی وقت فوزیہ کے شوخ قہقہے کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔یقیناً وہ بابر کی بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے ہوئے بے اختیار ہنس رہی تھی۔میرے جسم میں جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔میں نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور اسی اضطراری حالت میں اپنا فون اٹھا کر بابر کا نمبر ملانے لگی۔

''ہیلو'' بابر کی حیرت زدہ سی آواز کان میں پڑی۔

''ہیلو بابر! میرے کمرے میں آؤ پلیز......'' میری ہیجان انگیز آواز سن کر وہ چونک گیا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' اب اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' میں نے لوہا گرم دیکھ کر آواز میں مزید نقاہت پیدا کی۔

''اچھا، میں آرہا ہوں۔'' اس نے آنے کا عندیہ دیا تو دل جیسے بلیوں اچھلنے لگا مگر اس کے آنے پر بہانہ کیا کروں گی؟ میں کوئی معقول بہانہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ دواز ہ کھول کر اندر آگیا۔اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔میں کمرے کے وسط میں بت بنی کھڑی اسے اپنی جانب آتا دیکھ رہی تھی۔وہ نپے تلے قدم اٹھاتا میرے قریب آیا اور دھیمے لہجے میں پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' اس کے لہجے کی سرد مہری مجھے کچوکے لگا رہی تھی۔

''طبیعت خراب ہوگئی۔'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔اس وقت وہ شیروانی اتار کر سادہ کاٹن کے سفید سوٹ میں ملبوس تھا اور اس سادہ سے حلیے میں بھی مردانہ وجاہت کا پیکر نظر آرہا تھا۔

چند لمحوں تک میں اس کی نظروں میں نظریں ڈال کر دیکھتی رہی اور پھر اس کے سینے سے لگ گئی۔وہ بھونچکا رہ گیا اور پھر نرمی سے میری بالوں کو سہلانے لگا۔

''کیا کر رہی ہو بانو! پیار جتانے کے لیے یہی وقت ملا تھا کیا؟'' اس نے میرے بالوں پر اپنا منہ رکھ کے سرگوشی کی۔

''تم میرے ہو بابر، صرف میرے۔'' میں نے اس کے سینے پر اپنا گال رگڑتے ہوئے جواب دیا

''ہاں میں تمہارا ہوں مگر اس وقت کوئی اور بھی میرا انتظار کر رہا ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کے مجھے اپنے وجود سے الگ کرنے کی کوشش کی۔میں نے اس کی کوشش ناکام بناتے ہوئے اور زور سے اسے بھینچ لیا۔اس نے زبردستی مجھے پیچھے دھکیلا تو میں نے آگے بڑھ کر، اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

وہ پھر سے بے بس ہو چکا تھا۔اب کی بار اس نے میری اس حرکت کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا مگر چند لمحوں بعد ہوش کی دنیا میں جیسے واپس آگیا۔مجھے دھکا دے کر دروازے کی طرف پلٹا۔میں نے دوڑ کر اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔اس کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔

''چھوڑ دو مجھے بانو! مجھے جانے دو، فوزیہ میرا انتظار کر رہی ہے۔'' اس نے کمزور سی آواز میں احتجاج کیا۔

''نہیں بابر! تم صرف میرے ہو۔ فوزیہ کے پاس نہیں جانے دوں گی۔ پلیز رک جاؤ۔'' میں نے اس کے کندھے پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف چلنے لگا اور میں اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگی۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بغیر پلٹے باہر نکل گیا۔ میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح زمین پر بیٹھ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

☆......☆......☆

جب رو رو کے تھک گئی تو اٹھ کر بیڈ پر چلی گئی۔ صبح آنکھ دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سے کھلی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے اماں کھڑی تھی۔

''بہو تم ابھی تک سو رہی ہو؟ گھر میں نئی نویلی دلہن آئی ہے۔ اس سے جا کر ناشتے کا پوچھو۔'' اماں شہد آگیں لہجے میں ڈپٹ رہی تھی۔

''جی اماں! رات کو نیند ٹھیک سے نہیں آئی۔ اس لیے دیر سے اٹھی۔''

''اچھا۔'' اماں نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تمہیں نیند کیوں نہیں آئی۔ تھوڑے دن نہیں آئے گی۔ پھر جی بھر کے آیا کرے گی۔'' اماں نے تسلی دی یا نشتر چبھویا، سمجھ نہ سکی۔ منہ دھو کر بال سنوارے اور اماں کی ہدایت کی مطابق دلہن کے کمرے کی راہ لی۔

دروازے پر ہلکے سے دستک دی اور اندر داخل ہو گئی۔ بابر بیڈ پر نیم دراز اپنی نئی نویلی دلہن کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جو آئینے کے سامنے کھڑی اپنی گیلی زلفیں سنوار رہی تھی۔

مجھے دو سال پہلے کی اپنی سہاگ رات والی صبح یاد آگئی۔ مجھے دیکھ کر بابر فوراً اٹھ کے بیٹھ گیا اور فوزیہ بھی پیچھے مڑ کر خوشدلی سے بولی۔

''گڈ مارننگ بانو!'' اس کے لہجے کی تازگی اور چہکار مجھ پر تازیانے کی طرح لگی۔

''صبح بخیر فوزیہ!'' میں نے زبردستی اپنے چہرے پر بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''رات کیسی گزری؟'' یہ بات پوچھتے ہوئے نظریں بے اختیار بابر کے چہرے پر جا ٹھہریں۔ وہ جزبز ہو کر بیڈ سے نیچے اترا اور باہر نکل گیا۔ اب فوزیہ بھی ہاتھ سے کنگھی رکھ کے میرے پاس چلی آئی۔ دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور ترحم بھری نگاہ میرے چہرے پر جما دی۔

''جانتی ہوں...... تم اس وقت اذیت کے ایک بیکراں سمندر کو پار کر رہی ہو۔ یقین کرو مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے نیچے کیا اور بولی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے فوزیہ! فقط وہم ہے تمہارا۔'' میں نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ناشتے میں کیا کھانا پسند کرو گی؟'' یہی پوچھنے آئی تھی میں۔''

''جو بھی تم پیار سے بنا کر کھلا دو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دی اور کمرے سے نکل کر کچن کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

ناشتے کی ٹرے اٹھائے واپس کمرے میں آئی تو وہ دونوں بیڈ پر بیٹھے کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے قہقہوں کو بریک لگ گیا۔ میں ناشتے کی ٹرے ان کے آگے رکھ کر پلٹنے لگی تو بابر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بانو! تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرو۔''

''ہاں بانو! آؤ نا، تینوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔'' فوزیہ نے بھی پیار سے چمکارا تو میں رک گئی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔ تینوں کا آپس میں گہرا رشتہ اور تعلق تھا، اس کے باوجود ایک اجنبیت کی دیوار سی کھڑی ہوگئی تھی ہمارے درمیان۔ میرے آنے سے پہلے دونوں کسی بات پر چہک رہے تھے مگر میری موجودگی میں دونوں نے ایکدم سنجیدگی اختیار کر لی تھی۔ تینوں نے خاموشی سے ناشتہ کیا اور میں برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔

شام کو بابر کا ولیمہ تھا۔ فوزیہ کے میکے سے چند افراد آئے اور چوہدری فیصل نے بھی دعوت ولیمہ میں شامل ہو کر تقریب کو رونق بخشی۔ زندگی پھر سے ایک ڈگر پر آ گئی۔ بابر شرعی انصاف کے تقاضوں کو نباتے ہوئے، دونوں بیویوں کے ساتھ باری باری ایک ایک رات گزارنے لگا مگر مجھے اب اس میں پہلے والے بابر کی جھلک دکھائی نہ دیتی۔ صاف محسوس ہوتا کہ تعلق نبانے کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ نہ وہ پہلی سی گرم جوشی نظر آتی اور نہ ہی دیوانہ پن۔ شاید جذبات و احساسات کا محور و مرکز اب کسی اور کی ذات تھی۔

وقت دھیمی چال سے گزرتا رہا اور فوزیہ کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ بابر اور اس کی ماں کی دلی مراد بر آئی۔ اب فوزیہ کو خوب پھل اور اچھی خوراک کھلائی جاتی اور فوزیہ کا رنگ و روپ بھی خوب نکھر گیا تھا۔ ماں بننے کی خوشی نے اسے ایک انوکھا نکھار اور تمکنت بخشی تھی۔ میرے دل میں احساس محرومی اور بڑھ گیا۔ فوزیہ، بابر کو اولاد کی خوشی دینے کی وجہ سے مجھ سے اعلیٰ و ارفع ہوگئی۔

دل میں حسد اور جلن محسوس ہونے کے باوجود بھی میں فوزیہ کا بہت خیال رکھتی اور اس میں بھی اپنا مفاد پوشیدہ تھا۔ میں فوزیہ سے یہ وعدہ لے چکی تھی کہ پہلا بچہ میرا ہوگا اور اسی لالچ کے پیش نظر اس کی خوب خدمت کرتی، اس کے کھانے پینے کا خوب خیال رکھتی۔

میری ساس اور شوہر میرا اخلاص اور فرمانبرداری سے بہت خوش تھے مگر میرے دل میں چھپی غرضی ان کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ آخر وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب فوزیہ کو دردِ زہ چھڑی اور اسے ہاسپٹل لے کر جانا پڑا۔ بابر کو فون کر کے میں نے یہ اطلاع دی اور ہاسپٹل کا نام بھی بتا دیا۔

رات کے دو بجے فوزیہ نے ایک خوبصورت اور صحت مند بچے کو جنم دیا۔ ہم تینوں جو بے تابی سے لیبر روم کے باہر کوریڈور میں چکر لگا رہے تھے۔ نرس کی زبانی یہ خوشخبری سن کر نہال ہوگئے۔ اماں تو وہیں سجدے میں گر گئیں۔

بچے کا نام بابر اور فوزیہ نے پہلے ہی ''گوہر'' سوچ رکھا تھا۔ وہ تھا بھی تو ہم سب کے لیے ایک گوہر مقصود۔ اور گوہر نایاب۔ گوہر کو لیے ہم سب خوشی خوشی گھر آئے۔ سارے محلے میں مٹھائی بانٹی گئی۔

مسئلہ تو اس وقت کھڑا ہوا جب میں نے فوزیہ سے گوہر کو اپنی گود میں لینے کا مطالبہ کیا۔اس وقت بابر اور اماں بھی فوزیہ کے پاس بیٹھے تھے۔جب میں نے فوزیہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔فوزیہ اس وقت گوہر کو گود میں ڈالے دودھ پلا رہی تھی۔میری بات سن کر اس نے کن انکھیوں سے بابر کی طرف دیکھا اور بولی۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے بانو! مگر......''

''مگر کیا؟''میں نے بیتابی سے پوچھا۔

''مگر گوہر ابھی بہت چھوٹا ہے۔''بابر نے فوزیہ کا جملہ مکمل کیا۔''ماں کا دودھ پیتا ہے۔اسے ماں کی گود کی زیادہ ضرورت ہے۔''

بابر کی بات سن کر میں گنگ رہ گئی۔

''تو کیا میں ماں بن کر نہ پالتی اس کو؟ میری ممتا کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں آپ لوگ؟''میرے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا۔

''ہاں بہو......ہم شک کر رہے ہیں تمہاری ممتا پر......اور یہ شک کرنے کی ایک ٹھوس وجہ بھی ہے۔''اماں بات کو ادھورا چھوڑ کر میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگی۔

''اماں میں کچھ سمجھی نہیں؟''میں ہونق بنی اماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''دیکھو بانو بہو! غصہ مت کرنا......بات یہ ہے کہ فوزیہ اور بابر تمہیں اپنا بچہ دینے کے لیے مطمئن نہیں ہیں۔اور تم بھی یہ بات اپنے دل سے نکال دو۔اور پھر گوہر کون سا تم سے دور ہے۔ایک گھر میں ایک ہی چھت تلے تو رہتے ہیں سب۔''اماں نے بڑی آسانی سے گویا بات ختم کر دی مگر میں اتنی جلدی بات ختم کیسے کر سکتی تھی۔

فوزیہ اور بابر کے چہروں کا باری باری جائزہ لیا۔ان کی جھکی ہوئی نگاہوں اور لب بستہ خاموشی نے یہ عقدہ کھول دیا کہ اماں کی باتوں میں ان کی رضامندی بنفس نفیس شامل ہے۔

''فوزیہ! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا نا کہ پہلا بچہ میری گود میں ڈال دوگی؟ تو پھر کیوں اپنے وعدے سے پھر رہی ہو؟''میرا لہجہ خود بخود تلخ ہو گیا۔

فوزیہ نے جھکی ہوئی نظر اٹھائی اور بولی۔''دیکھو بانو! یہ میرا پہلا بچہ ہے اور دنیا کی کوئی ماں بھی اپنی گود کا پہلا پھل کسی دوسرے کے حوالے کر کے اپنی گود سونی نہیں کرتی۔''

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی کہ اولاد کی محبت، سہیلی کی محبت پر غالب آ گئی۔''میں زہر خند لہجے میں بولی۔

''چلو یہی سمجھ لو۔''وہ لاپرواہی سے بولی۔''اولاد چھوڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔اب ہر کوئی تمہارے جیسے مضبوط دل کا

مالک تو نہیں ہوتا نا۔ جو کسی کی محبت سے مجبور ہو کے اپنے جگر گوشوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔"

اس کے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ جس نے میرے تن من کو جھلسا دیا۔ مزید بات کرنے کی ہمت نہ رہی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی اور باہر کی راہ لی۔

"اپنی کوکھ سے جنم بچوں کو سنبھال نہ سکی اور چلی ہے اب سوتن کے بچے کو گود لینے۔ ہونہہ۔" دروازے سے نکلتے ہوئے اماں نے بھی اپنے تائیں خوب کاری ضرب لگائی۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر کے بیڈ پر گر گئی اور آنکھوں سے نکلنے والے نمکین پانی سے تکیے کو بھگونے لگی۔

شام تک کمرے میں پڑی روتی رہی۔ کسی نے آ کر خبر نہ لی۔ یہاں تک کہ آج اماں نے کھانا پکانے کا آرڈر بھی نہ دیا۔ میں بھی غصے سے لاتعلق سی ہو کر پڑی رہی۔ جب رات کے آٹھ بج گئے تو بابر میرے پاس آیا۔ مجھے لیٹا دیکھ کر سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیوں الٹی سیدھی ضد کر کے خود کو اذیت دیتی ہو؟" وہ نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"الٹی سیدھی ضد؟" میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔ "کیا تمہاری اولاد پر میرا کوئی حق نہیں؟" میں رقت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"حق ہے! ایک ہی گھر میں تو رہتے ہیں۔ تم سارا سارا دن گوہر کو کھلایا کرو، اس کو نہلایا کرو، اس کے کپڑے بدلا کرو۔ تم سے دور تھوڑی ہے وہ۔"

"مجھے اس کی آیا نہیں، ماں بن کے رہنا ہے۔" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ماں تو اس کی فوزیہ ہے۔ تم نہیں ہو سکتی۔" اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

"میں کیوں نہیں ہو سکتی؟" میں دھاڑی۔ "فوزیہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ پہلا بچہ مجھے دے گی۔ پھر کیسے اپنے وعدے سے مکر سکتی ہے؟" میری گردن کی رگیں تن گئیں۔

"زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ماں ہے۔ اگر اپنی اولاد کسی دوسرے کی گود میں نہیں ڈالنا چاہتی تو کوئی زور زبردستی نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"اور ہاں! اب سے میں فوزیہ کے کمرے میں ہی مستقل سویا کروں گا۔ میرے بچے کو میری قربت کی زیادہ ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔

میں چلانے لگی۔

''جاؤ تم اپنی بیوی اور بچے کے پاس...... مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ جی لوں گی میں اکیلی ہی۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی مگر وہ کٹھور دل، مجھے چپ کروانے کی بجائے باہر نکل گیا

☆......☆......☆

میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ گوہر کو گود میں نہیں لوں گی مگر زیادہ دن تک اس عہد پر قائم نہ رہ سکی۔ اس کی من موہنی صورت دیکھ کر سب عہد و پیمان بھولنے لگتی اور اسے فوراً گود میں اٹھا لیتی۔ فوزیہ نے کبھی مجھے اسے اٹھانے اور کھلانے سے منع نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اماں اکثر اسے اشاروں کنایوں میں روکتی رہتی کہ گوہر کو میرے حوالے مت کیا کرے۔

ایک دن خود میں نے اپنے کانوں سے اماں کو فوزیہ کے کان بھرتے سن لیا۔ میں گوہر کے لیے فیڈر بنا کر فوزیہ کے کمرے میں جا رہی تھی جب اماں کی سرگوشیوں کی آواز میرے کان میں پڑی۔

''فوزیہ دھی! تمہیں کتنی بار سمجھا چکی ہوں۔ منے کو اس سے دور رکھا کر۔ تمہاری نظروں کے سامنے جب تک اٹھائے، تب تک تو ٹھیک ہے مگر بالکل اس کے حوالے کر کے خود بے فکری کی نیند سونا کہاں کی عقلمندی ہے بھلا؟''

''خالہ! مجھے بانو پر پورا یقین ہے۔ وہ میری اولاد کو اپنی اولاد سمجھتی ہے۔'' فوزیہ کی بات سن کر دل کو تقویت ملی۔

''سوتن پر بھروسہ کرنا دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ باقی تمہاری اولاد ہے۔ تم جانو، میرا کام تو تمہیں سمجھانا تھا۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی اور میں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ دودھ والا فیڈر منے کے منہ میں دیا جو وہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے غٹا غٹ پینے لگا۔

اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنا فیڈر خود سنبھال سکتا تھا۔ فوزیہ مجھے گوہر کے لیے کی گئی شاپنگ دکھانے لگی جو ایک دن پہلے وہ بابر کے ساتھ کرنے گئی تھی۔ اماں ہم دونوں کو مصروف دیکھ کر اٹھ کر باہر چلی گئی۔

وقت دھیمی چال سے چلتا گیا اور گوہر ایک سال کا ہوا تو فوزیہ کا پاؤں پھر سے بھاری ہو گیا۔ ان دنوں اس کی طبیعت پر ہر وقت کسلمندی سی طاری رہتی۔ گوہر کو بھی نہ سنبھالتی۔ اب وہ ہر وقت میرے پاس رہتا۔

اماں نے بھی یہ اعتراض کرنا چھوڑ دیا تھا کہ گوہر کو بانو سے دور رکھا کرو۔ بابر بھی اب فوزیہ کی چڑ چڑاہٹ سے بیزار ہو کر زیادہ وقت میرے پاس گزارنے لگا تھا۔

زندگی ایک مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھی کہ اچانک پھر سے ایک بھونچال آیا جس نے میری زندگی کا سکون تہہ و بالا کر دیا۔

وہ سردیوں کا ایک سہانا دن تھا۔ سنہری دھوپ خوب بھلی لگ رہی تھی۔ میں گھر کا سارا کام کاج نمٹا کر گوہر کو اٹھائے چھت پر چلی گئی۔ ابھی وہ نیا نیا چلنا شروع ہوا تھا۔ اس لیے ایک لمحے کے لیے بھی ایک جگہ ٹک کر نہ بیٹھتا تھا۔ چھت کی منڈیریں نہ تھیں۔ میں اسے

چھت کے بیچ و بیچ ایک چارپائی پر بٹھا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

میں تھوڑی دیر پہلے ہی نہائی تھی۔ اجلی دھوپ دیکھی تو گیلے بال کھول دیئے۔ گوہر کے آگے کچھ پلاسٹک کے کھلونے پڑے تھے۔ جنہیں وہ اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ توتلی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ وہ قلقاریاں مار مار کر ہنسنے لگا۔ اسے یوں ہنستا دیکھ کر میں اس پہ واری صدقے جانے لگی۔ ویسے بھی وہ معصوم فرشتہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا کیونکہ اس میں مجھے بابر کی گہری شباہت دکھائی دیتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا، جیسے میں نے اسے اپنی کوکھ سے پیدا کیا ہے۔

میں گوہر کے ساتھ کھیل رہی تھی جب ساتھ والی چھت سے زرینہ نے مجھے آواز دی۔ زرینہ ساتھ والے ہمسایوں کی بڑی بہو تھی۔ اس کے آواز دینے پر میں اس کی طرف پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اس نے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ اس نے ہاتھ میں کوئی چیز بھی اٹھا رکھی تھی۔ میں اس کی بات سننے کے لیے اس کے پاس چلی گئی۔ وہ ہاتھ میں اٹھائے شاپر کو کھول کر اس میں رکھا اپنا سوٹ نکال کر دکھانے لگی۔

''بانو! دیکھ کر بتانا ذرا...... یہ سوٹ کیسا ہے؟ گڑیا کے پاپا لائے ہیں میرے لیے۔''

''بہت ہی شاندار...... پرنٹ تو غضب کا ہے۔'' میں اس کے سوٹ کی تعریفوں میں رطب للسان تھی۔ جب اچانک میرے کانوں میں ایک زوردار دھماکے کی آواز پڑی۔ میں نے چونک کر پیچھے مڑ کے دیکھا تو گوہر کو غائب پایا۔

میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ میں دوڑتی ہوئی منڈیر کے پاس گئی اور اپنے گھر کے صحن میں جھانکا تو وہ معصوم اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون نکل نکل کر فرش پر ڈھیر ہو رہا تھا۔ میں ہذیانی انداز میں چیختی چلاتی، دیوانوں کی طرح سیڑھیاں پھلانگتی نیچے پہنچی۔

میں گوہر کے پاس بھی نہ پہنچنے پائی تھی کہ فوزیہ اپنے کمرے سے باہر آئی۔ یہ دلدوز منظر دیکھا تو وہیں غش کھا کر گر گئی۔

اتنے میں اماں بھی صحن میں بنے واش روم سے نکل آئی۔ تب تک میں گوہر کے لہولہان بے جان وجود کو اٹھائے اسے دیوانوں کی طرح پکار رہی تھی۔ اسے ہلا جلا رہی تھی کہ شاید کہیں زندگی کی تھوڑی سی رمق باقی ہو مگر گوہر مر چکا تھا۔ میری لاپرواہی اور نادانی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔

اماں نے صورت حال دیکھی تو اپنے سینے پر دوہتڑ مارنے لگی۔ چیخ و پکار سن کر گلی محلے کے لوگ ہمارے گھر اکٹھے ہو گئے۔ زرینہ سب سے پہلے آئی۔ اس نے فوراً ایک چارپائی بچھائی اور گوہر کو میرے ہاتھوں سے لے کر اس چارپائی پر ڈال دیا۔

کسی نے بابر کو فون کیا تو وہ بھی دوڑا چلا آیا۔ ذرا سی دیر میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ فوزیہ کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ وہ اپنے بچے کو دیکھ کر تڑپ رہی تھی، بلک رہی تھی۔ میں جو ابھی تک بال بکھرائے گوہر کی چارپائی سے لپٹی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ایک نئی افتاد میرے سر پہ آن پڑی۔ میری ساس اچانک اٹھی اور مجھے تھپڑوں اور گھونسوں سے مارنے لگی۔ میرے بال بیدردی سے کھینچنے لگی۔

''اماں! مجھے چھوڑ دو۔ میں بے قصور ہوں۔'' میں اماں کے مضبوط شکنجے میں پٹتے ہوئے دہائیاں دے رہی تھی مگر اماں پر ایک وحشت سوار تھی وہ عالم جنون میں مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ عورتوں نے آگے بڑھ کے مجھے اماں کے عتاب سے بچایا مگر تب تک اماں کے ہاتھوں میری اچھی خاصی درگت بن چکی تھی۔

بابر بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ فوزیہ اٹھ کر اس کے سینے سے جا لگی تھی۔ رات کے نو بجے تک اس ننھے فرشتے کی تدفین کر دی گئی۔ رات کو سب لٹے پٹے مسافروں کی طرح جہاں جگہ ملی پڑ رہے۔

صبح ہوئی تو میرے لیے ایک نئی قیامت کی نوید لے کر آئی۔ بابر نے میرے کمرے کا دروازہ پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے کھولا۔ میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھی تو کسی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا اور بالوں سے کھینچتا ہوا باہر صحن میں لے آیا۔ باہر فوزیہ اور اماں چارپائی پر بیٹھی بین کر رہی تھیں۔ بابر مجھے ان کے سامنے مارنے لگا۔ دونوں چپ چاپ تماشہ دیکھتی رہیں۔ کسی نے آگے بڑھ کے چھڑانے کی کوشش نہ کی بلکہ اماں اس قسم کے جملے الاپنے لگی۔

''ہائے میرے پوتے کو کھا گئی یہ ڈائن۔ جو اپنے بچوں کی نہ بنی وہ بھلا میرے بچے کی کیسے بن سکتی تھی۔ کہتی تھی فوزیہ کو، اپنا بچہ اس ناگن کے حوالے مت کر۔ مگر اس کی آنکھوں پر تو سہیلی کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہائے میری کس نے نہ سنی۔''

میں مار کھاتی رہی اور اپنی بیگناہی کا یقین دلانے کے لیے دہائیاں دیتی رہی مگر میری کسی نے نہ سنی۔ آخر جب اماں نے دیکھا کہ بابر کی وحشت میں بجائے کمی کے اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو اس نے اٹھ کر بابر کا بازو پکڑ لیا۔

''چھوڑ دے پتر! اس کو مارنے کا کیا فائدہ... جانے والا تو چلا گیا۔ اس کو جان سے بھی مار دو گے تو وہ واپس نہیں آنے والا۔ میں تو کہتی ہوں، تین حرف بھیج کر، گندگی اس پوٹ کو گھر سے باہر نکال پھینک۔ یہ تیری اولاد کی دشمن ہے۔ تیرے آنے والے بچے بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں۔''

اماں کی بات بابر کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے مارنا بند کر دیا اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں کراہتی ہوئی اٹھی اور فوزیہ کی طرف بڑھی۔ دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔

''مجھے معاف کر دو فوزیہ! میرا یقین کرو، جو کچھ بھی ہوا۔ انجانے میں ہوا۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔ تم تو جانتی ہو۔ میں گوہر کو کتنا چاہتی تھی۔''

میں ہچکیاں لے کر رونے لگی تو فوزیہ بھی پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگی۔ اسی وقت بابر کی غراتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''

میں تڑپ کر پیچھے پلٹی۔ ''نہیں بابر! خدا کے لیے رک جاؤ۔''

مگر اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ تھی۔ بولتا چلا گیا۔

''طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔''

میں دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔۔ ایک پل میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ بابر نے سفاکی اور ظلم کی ساری حدیں پھلانگتے ہوئے مجھے اپنی زندگی سے نکال باہر پھینکا تھا۔ چند لمحوں تک خالی الذہنی کے عالم میں فرش پر سر پکڑے بیٹھی رہی۔ چہرہ تھپڑوں کی بھرمار سے سلگ رہا تھا۔ پھر جب اس سنگدل نے ہاتھ سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھایا تو ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

''اٹھو! اپنے کپڑے اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس کے لہجے سے نفرت اور حقارت دونوں بیک وقت چھلک رہی تھیں۔

''مگر بابر! میں کہاں جاؤں گی؟ میرا تو اس دنیا میں تمہارے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔'' میں سسکنے لگی۔

''یہ میں نہیں جانتا۔ بس اس گھر سے اور میری نظروں سے کہیں دور دفع ہو جاؤ۔'' اس نے بیگانگی سے جواب دیا۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں گئی۔ چند جوڑے روزمرہ کے کپڑوں کے ایک چھوٹے بیگ میں ڈالے۔ یہ وہی بیگ تھا جو گھر سے بھاگتے وقت بھی میرے ہمراہ تھا اور آج پھر سے، میرے ساتھ انجانی راہوں کا ہمسفر بننے جا رہا تھا۔ الماری سے اپنی جمع پونجی نکالی جو صرف دو ڈھائی ہزار روپوں پر مشتمل تھی اور باہر آ گئی۔ فوزیہ مجھے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ اماں نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے رخ پھیر لیا۔ بابر مجھے نظر انداز کرتے ہوئے چھت پر چڑھ گیا۔

میں شکستہ حالی اور لاچاری کا عبرت ناک نمونہ بنی گھر سے باہر نکلی۔ گلی کراس کر کے مین روڈ پر پہنچی۔ ایک رکشے والے کو اشارہ کیا تو وہ پاس آ گیا۔ اس میں بیٹھ کر اسے بس اسٹینڈ جانے کا حکم دیا۔ رکشہ روڈ پر فراٹے بھرنے لگا اور اس کی اسپیڈ سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے میرا دماغ دوڑنے لگا۔ رہ رہ کر یہی خیال تنگ کر رہا تھا کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں کہاں جائے پناہ تلاش کروں۔ صرف ایک دروازے کے علاوہ دنیا کا ہر دروازہ مجھ بدقسمت کے لیے بند ہو چکا تھا اور پھر اسی در پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

تقدیر کے اس نئے ستم پر سر جھکائے بیٹھ گئی۔ سوچوں کا جھولا جھولتی کب بس اسٹینڈ پہنچ گئی، خبر ہی نہ ہوئی۔ رکشے والے نے رکشہ روک کر نیچے اترنے کے لیے کہا تو چونک کر اطراف میں نگاہ دوڑانے لگی۔ اپنے سوجے ہوئے چہرے اور پھٹے ہوئے بالائی ہونٹ کو چادر کے ایک کونے سے چھپایا۔ اسے کرایہ ادا کیا اور بیگ اٹھائے لاہور جانے والی ایک بس میں سوار ہو گئی۔

بس کا سفر بھی خاموشی سے کٹ گیا۔ لاہور کے بس اسٹاپ پر اتری اور پھر سے آٹو رکشے کی تلاش میں نگاہ دوڑانے لگی۔ آخر نظر انتخاب ایک عمر رسیدہ اور باریش رکشہ ڈرائیور پر جا ٹھہری۔ اسے قابل اعتماد گردانتے ہوئے اس کے رکشے میں بیٹھ گئی اور اسے ''دارالنساء'' چلنے کے لیے کہا۔ رکشہ چلنے لگا اور میں نے آنکھیں موند کر اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

☆......☆......☆

ایک مرتبہ میں پھر سے ہاتھ میں بیگ اٹھائے اس پناہ گاہ کے گیٹ پر کھڑی تھی جو بظاہر عوتوں کے لیے جائے امان تھی مگر حقیقت تو یہ تھی کہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کے لیے دنیا کا کوئی گوشہ بھی دارالامان نہ تھا۔ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی سیدھی میڈم فرح کے آفس تک جا پہنچی۔ راستے میں کسی نے روکنے کی کوشش نہ کی نہ گیٹ پر بیٹھے گارڈ نے اور نہ آفس کے باہر بیٹھی آیا نے کیونکہ سب میری شکل سے واقف تھے۔ میں یہاں اپنی زندگی کے چند ماہ گزار چکی تھی اور اب شاید سالوں گزر جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ عمر کا باقی حصہ یہیں تمام ہونا طے پایا ہو۔

میں آفس کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ اندر میڈم فرح دو ملاقاتیوں کے ساتھ بیٹھی بات کر رہی تھیں۔ دونوں مردوں کی دروازے کی جانب پشت تھی۔ میں نے اپنا چہرہ پھر سے ڈھک لیا اور آہستہ روی سے چلتے ہوئے اس کے سامنے جا پہنچی۔ وہ استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔

میں بغیر کوئی جواب دیئے ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میڈم فرح نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا اور اپنے سامنے بیٹھے احباب سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ دونوں آدمی اٹھ کر چلے گئے تو میڈم میری طرف متوجہ ہوگئی۔

''جی فرمائیے! آپ کون ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ میں اب بھی خاموش رہی اور آہستگی سے چہرے سے چادر ہٹادی۔ مجھے دیکھ کر میڈم فرح یوں اپنی کرسی سے اچھلی جیسے اچانک کرسی میں کرنٹ آگیا ہو۔

''تت... تم بانو ہونا؟'' اس نے سکتے کے عالم میں پوچھا۔

''جی! میں نصیبوں جلی بانو ہی ہوں۔'' میں تلخی سے مسکرائی تو ہونٹوں کے کھچاؤ کی وجہ سے زخمی ہونٹ سے پھر سے خون رسنے لگا۔

''اوہ خدایا! تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟'' اب وہ پھر سے اپنی کرسی پر دھنس چکی تھی اور صدمہ چہرے پر سجائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''بابر نے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کیا؟ اس بابر نے جو تم سے جنونی محبت کرنے کا دعویدار تھا۔ جس کی خاطر تم نے اپنا گھر بار اور بچے چھوڑے؟ مگر وہ عاشق سے درندہ کیسے بن گیا؟'' میڈم نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے۔

''انسان کو بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ صرف ایک لمحہ۔ ہاں صرف ایک لمحے میں کوئی بھی شریف انسان شرافت کا چولا اتار کر حیوان بن سکتا ہے۔'' میں نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔

''مگر......وہ تو ایسا نہیں لگتا تھا۔ بڑا نرم مزاج اور تم پر جان چھڑکنے والا تھا۔'' میڈم کو میرے الفاظ پر یقین کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''آپ کی چھٹی حس واقعی بہت تیز ہے میڈم! آپ نے دو سال پہلے جو پیشین گوئی کی تھی میرے مستقبل کے حوالے سے۔

بالآخر وہ سچ ثابت ہوئی۔‘‘

’’میں مانتی ہوں کہ حالات و واقعات کی بھٹی میں پک کر، ایک اچھی پیش گو بن چکی ہوں مگر خدا گواہ ہے کہ تمہارے حوالے سے جس خدشے کا اظہار کیا تھا۔ دل میں اس کے جھوٹا ہونے کی بہت دعائیں کرتی رہی ہوں۔‘‘ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ریوالونگ چیئر پر جھولنے لگی۔

’’اب آگے کا کیا ارادہ ہے؟‘‘ میڈم کھوجتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

’’ابھی تو کچھ سوچنے سمجھنے کی سکت نہیں۔ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا ٹھکانہ نظر نہیں آیا۔ اس لیے یہاں چلی آئی۔‘‘ میری آواز رندھ گئی۔

’’بہت اچھا کیا جو یہاں چلی آئی۔ ورنہ جا بجا بکھرے انسانی بھیڑیے تمہیں نوچ کھاتے۔ خیر آؤ میرے ساتھ، تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں اور کچھ پین کلر میڈیسن کی بھی تمہیں ضرورت ہے۔‘‘ میڈم فرح نے وہ گھومنے والی کرسی چھوڑی تو میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دی۔

☆......☆......☆

کمرہ نمبر دس کے سامنے میڈم رک گئی۔ ہلکے ہاتھ سے ناک کر کے اندر داخل ہوگئی۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر چلی آئی۔ ایک قبول صورت لڑکی یا جواں سال عورت اپنے بیڈ پر نیم دراز ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے کتاب بند کر دی اور ہماری طرف دیکھنے لگی۔

’’کیسی ہو شبانہ؟‘‘ میڈم نے خوشدلی سے پوچھا۔

’’آئی ایم فائن میڈم۔‘‘ اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا

’’ان سے ملو! یہ بانو ہیں۔ تمہاری نئی روم میٹ۔ پہلے بھی اس ہوسٹل میں رہ چکی ہیں۔ میرے دل کے بہت قریب ہیں۔ اس لیے تمہارے کمرے میں لائی ہوں کیونکہ تم ایک سلجھی ہوئی لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ بانو کو تم سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔‘‘ میڈم نے بات ختم کر کے تائید طلب نگاہ اس پر ڈالی تو اس نے بھی جواباً اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

’’جی میڈم! میں بھی امید کرتی ہوں کہ مس بانو میرے ذاتی معاملات میں انٹرفیئر کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔‘‘ اس نے رکھائی سے جواب دیا تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ بھی اس کے لہجے کی طرح بالکل سپاٹ تھا۔ پھر میں نے قدرے حیرانی سے میڈم کی طرف دیکھا تو انہوں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پلکوں کی جنبش سے مجھے ریلیکس رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے بیگ زمین پر رکھا اور دوسرے بیڈ کی طرف بڑھی جس پر سفید بے داغ چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں بیڈ پر بیٹھ گئی تو میڈم نے میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز سے پیناڈول کا ایک پتا نکالا اور میری طرف بڑھایا۔

’’میں تمہارے لیے دودھ کا گلاس بھیجتی ہوں۔ اس کے ساتھ دو گولیاں کھا کر آرام کرو۔‘‘

''جی میڈم۔''میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور نیم دراز ہوگئی۔

میڈم چلی گئی تو شبانہ نے پھر سے ناول کھولا اور اس میں کھوگئی۔اس نے میری موجودگی کو ایسے فراموش کر دیا جیسے میں وہاں موجود ہی نہ تھی۔چند منٹ بعد آیا نیم گرم دودھ کا کنگ سائز گلاس دے گئی۔میں نے دو گولیاں اس نیم گرم دودھ کے ساتھ نگل لیں اور پھر سے دراز ہوگئی۔بیتی ہوئی زندگی پھر سے ایک فلم کی مانند دماغ کی پردہ اسکرین پر چلنے لگی۔

سیٹھ ناصر کی وحشت ناک سزائیں،قتل کر دینے کی دھمکیاں،جان بچانے کے ڈر سے گھر سے فرار ہو کر بابر کی آغوش محبت میں پناہ لینا،بابر کی محبتیں اور وارفتگیاں اور پھر اس کا دوسری شادی کرنا اور بدل جانا۔ایک ایک کر کے سارے واقعات اور باتیں یاد آتی گئیں اور آنکھوں میں نمک ملا پانی بھرتا چلا گیا اور پھر یہ نمکین پانی پلکوں کا بند توڑ کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔

کافی دیر تک چت لیٹی چھت کو گھورتی رہی اور روتی رہی۔رو رو کے آنکھیں جلنے لگیں تو بوجھل ہو کر خود بخود بند ہوگئیں۔سوتے میں اچانک سردی کا احساس ہوا تو ٹانگیں موڑ کر پیٹ کی طرف اکٹھی کر لیں۔پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے جسم کو نرم سی حرارت ملنی شروع ہوگئی ہے۔شاید مجھے کسی نے کمبل اوڑھایا تھا مگر کس نے؟یقیناً شبانہ نے۔نیم غنودگی کے عالم میں بس اتنا ہی سوچ سکی اور پھر ذہن جیسے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

نجانے کب تک بے خبر پڑی سوتی رہی۔جب آنکھ کھلی تو سامنے لگا دیوار گیر کلاک رات کے ساڑھے سات بجا رہا تھا۔نظریں گھما کر شبانہ کو دیکھنا چاہا تو وہ اس وقت فرش پر جائے نماز بچھائے نماز ادا کر رہی تھی۔اسے نماز پڑھتا دیکھ کر مجھے عجیب سی لگا۔اس کے پیشے کے حساب سے یہ عبادت و ریاضت اس سے میل نہیں کھاتی تھی۔

میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔اور بڑی محویت سے اسے دیکھنے لگی۔وہ دونوں ہاتھ اٹھائے اب دعا مانگ رہی تھی۔سفید دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹے وہ آنکھیں بند کیے بڑے خضوع خشوع سے دعا مانگنے میں مشغول تھی۔آخر اس نے دعا کو سمیٹا اور دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر اٹھ کر جائے نماز تہہ کرنے لگی۔جائے نماز رکھ کر اپنے بیڈ پر آ بیٹھی اور زیر لب کسی وظیفے کا ورد کرنے لگی۔

میں اس کی حرکات و سکنات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔جب اس کے تھرکتے ہونٹ جامد ہوئے تو اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

جب سے میں اس کمرے میں آئی تھی اس نے مجھے مخاطب نہیں کیا تھا۔مجھے وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف اور ہٹ کر لگی۔میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرے مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔بالآخر میں نے ہی اسے بلانے کا ارادہ کیا اور بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ سوچنے لگی۔

''شبانہ!''

میرے پکارنے پر وہ یوں چونک کر میری طرف دیکھنے لگی جیسے اسے مجھ سے اس قدر دیدہ دلیری کی امید نہ ہو۔

''تم کب سے ہو یہاں؟'' مجھ سے کوئی بات نہ بن پڑی تو جلد بازی میں یہی سوال کر ڈالا۔

وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ گویا فیصلہ کر رہی ہو کہ میں بات کرنے کے قابل ہوں یا نہیں۔

''چھ ماہ ہونے کو ہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا

''اچھا! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم یہاں کیوں ہو؟'' میں نے جھجکتے ہوئے اگلا سوال بھی داغ دیا۔

''پہلے تم بتاؤ! تم یہاں کیوں ہو؟'' اس نے جارحانہ انداز میں پوچھا تو میں گڑبڑا گئی۔

ابھی میں کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بولی۔ ''ایک مرد کی وجہ سے؟ ہے نا؟'' اس نے تائید چاہی اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''میں بھی ایک مرد کی مہربانیوں سے اس حال کو پہنچی تمہاری طرح۔ بلکہ یہاں آنے والی ہر عورت کی آمد ایک مرد کی مرہون منت ہے۔'' اس نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا تو میں سمجھ گئی کہ ایک اور سلگتی ہوئی عورت کہانی چھلکنے کو بے تاب ہے۔ وہ چپ ہو گئی۔ کمرے میں اداس کرنے والا سکوت چھا گیا۔

میں نے بھی پہلی ملاقات پر اس سے زیادہ کریدنا مناسب خیال نہ کیا۔ دروازے پر کسی نے دستک دی تو ہم دونوں چونک کر ادھر دیکھنے لگیں۔ آیا نے اندر سر گھسا کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے آ کر کھا لو۔

''تم چلو! ہم آ رہی ہیں۔'' شبانہ نے جواب دیا تو آیا واپس چلی گئی اور شبانہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''چلو اٹھو! کھانا کھانے چلیں۔''

میں نے ٹانگیں نیچے لٹکائیں اور چپل میں پاؤں ڈالنے لگی۔

☆......☆......☆

رات کو سونے کے لیے لیٹی تو پورا جسم کسی پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ شبانہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا تو وہ بھی اپنے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس وقت چائے کی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی مگر بنانے کی ہمت نہ تھی۔ عام طور پر ہوسٹل کی لڑکیاں چائے کا سامان اپنے پاس کمرے میں رکھتی تھیں۔

الیکٹرونک کیٹل میں پانی ڈال کر اسے کسی بھی بجلی کے پلگ میں لگا کر پانی گرم کر لیتیں۔ پانی کھولنے لگتا تو اسے کپ میں انڈیل کر ٹی بیگ اس میں ڈبو دیتیں۔ جب اچھی طرح چائے کی پتی کا رنگ نکل آتا تو خشک دودھ کا ایک چمچ اور چینی مکس کر کے چائے تیار کر

لیتیں۔میرے پاس چائے کا سامان اور ہمت دونوں چیزیں ندارادتھیں۔

اسی وقت جیسے شبانہ نے میرے دل کی آواز سن لی۔وہ اپنے بیڈ سے نیچے اتری اور ایک کونے میں بنے ہوئے ریک سے الیکٹرک کیٹل نکالا، پانی کی بوتل اٹھائی اور کیٹل میں پانی ڈالنے لگی۔اچانک اس کے جی میں پتا نہیں کیا آئی پیچھے پلٹ کر مجھے پوچھنے لگی۔

''چائے پیئو گی؟''

میں جو اس کی تمام کارروائی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔اس کی اس فراخدلانہ پیشکش پر جھوم اٹھی۔

''طلب تو بہت محسوس ہو رہی ہے۔اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو۔''میں نے لجاجت سے جواب دیا تو اس نے میری بات پر کوئی ردعمل ظاہر کیے بنا پھر سے پشت پھیر لی۔پانچ منٹ بعد وہ کھولتا ہوا پانی دو کپوں میں انڈیل رہی تھی۔پھرٹی بیگ اور خشک دودھ چینی کے ساتھ ملا کر ایک چھوٹا چمچ چائے کے مگ میں رکھا اور مگ میری طرف بڑھایا۔میں مگ ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی الرٹ ہو کر بیٹھ چکی تھی اور ندیدوں کی طرح کپ کو اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔اب میں بے صبری سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔چائے میرے تھکے ہوئے وجود کے لیے ٹانک کا کام کر رہی تھی۔

''چائے بہت اچھی بنی ہے۔''میں نے شبانہ کو خوش کرنے کے لیے تعریف کی جو بالکل حقیقت پر مبنی تھی۔چائے واقعی بہت خوش ذائقہ تھی یا شاید میری طلب نے اس کپ کے اندر ذائقہ بھر دیا تھا۔

وہ بھی اپنے بیڈ پر بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔چہرے پر حسب عادت گہری متانت چھائی ہوئی تھی۔میری بات سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور پھر سے سر جھکائے چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔

''ایک بات پوچھوں؟''میں نے اجازت طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔اس نے اجازت تو نہ دی البتہ مستفسرانہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''تم اتنی سنجیدہ کیوں رہتی ہو؟''میں نے خوشدلی سے پوچھا۔دل میں یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ اسے میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔وہ چند لمحے خاموشی سے چائے پیتی رہی پھر بولی۔

''ویسے ہی......بولنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔''اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

''دیکھو شبانہ!تم میری روم میٹ ہو۔بنا بات کیے کیسے کام چلے گا۔اس خاموشی سے مجھے گھبراہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔'' میرے لہجے میں نمی سی گھل گئی۔

اس نے چند لمحے پھر سے میری آنکھوں میں جھانکا جیسے میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔پھر اپنے کپ میں بچا ہوا آخری گھونٹ حلق میں انڈیل کر خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔سچ تو یہ ہے کہ اس کے پراسرار رویے کی وجہ سے میں اب الجھن سی محسوس کرنے

لگی تھی۔اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور میری طرف متوجہ ہوگئی۔

''کہو! کیا کہنا چاہتی ہو؟''اس کا لہجہ معتدل اور چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

میں نے بھی چائے ختم کی اور بولی۔

''تم ایسی کیوں ہو؟''

''مطلب؟''میری بات نے اسے قدرے حیران کیا

''مطلب یہ کہ ہر وقت آدم بیزار کیوں رہتی ہو؟ ہنسا کرو، مسکرایا کرو۔''میں نے نرمی سے کہا۔

''بلاوجہ کا ہنسنا مسکرانا مجھے پسند نہیں۔''اس نے حسب عادت دوٹوک لہجے میں جواب دیا تو میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

''ایک بات پوچھوں؟''میں نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

''پوچھو۔''

''تم اس پیشے میں کب سے ہو؟ کیا جب سے آئی ہو......تب سے؟''

''کس پیشے کی بات کر رہی ہو تم؟''اس کے لہجے میں حیرانی عود کر آئی۔

''جسم فروشی کی بات کر رہی ہوں۔''میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

''مگر! تم نے کیسے یہ اندازہ لگایا کہ میں جسم فروشی کے دھندے سے منسلک ہوں؟''

''یہاں رہنے والی اکثر لڑکیاں یہی کاروبار کرتی ہیں۔میں یہاں پانچ چھ ماہ گزار چکی ہوں۔ہر بات جانتی ہوں۔''

''پھر تو تم نے بھی یہی کچھ کیا ہوگا جس کی امید مجھ سے لگائے بیٹھی ہو؟''اس کا لہجہ اب طنزیہ رنگ اختیار کر گیا تھا۔

''نہیں! مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔میں یہاں عارضی طور پہ کچھ عرصہ گزارنے آئی تھی۔''اس کی بات سن کر غصہ تو آیا مگر تحمل سے کام لیا اور شائستگی سے جواب دیا۔

''مگر اس ہوسٹل میں رہنے والی ہر عورت تو دھندہ نہیں کرتی۔''اس کا لہجہ ہنوز کاٹ دار تھا۔

''ہاں! کچھ نہیں بھی کرتیں۔حق حلال کی روزی کما کر کھاتی ہیں۔''میں شرمندہ سی ہوگئی۔واقعی مجھے پہلے اس سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔

''جیسے یہاں کچھ عورتیں یہ دھندہ نہیں کرتیں۔ان عورتوں میں مجھے بھی شامل کر سکتی ہو۔''اب اس کا لہجہ نارمل ہو چکا تھا۔''اور ویسے بھی جو عورت ایک مرد کے وجود کو برداشت نہ کر سکی، وہ روز نت نئے مردوں کو کیسے برداشت کر سکتی ہے۔''اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا مطلب؟ کیا شوہر سے جھگڑ کر یہاں بیٹھی ہو؟''

''ہاں۔''اس نے بلا تامل جواب دیا

''کیا کسی اور پہ دل آ گیا تھا اس کا؟''

''نہیں۔''

''تو کیا تم نے بے وفائی کی؟''

''نہیں۔''اس نے پھر سے مختصر جواب دیا۔

''پھر تو یقیناً بے اولادی ہی وجہ ٹھہری ہوگی۔''میں فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

''تمہارا یہ اندازہ بھی غلط ہے۔''وہ مسکرائی۔

''تو پھر؟ کیا وجہ بنی جو تمہارے شوہر نے تمہیں چھوڑ دیا؟''میں ہونق چہرہ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اس نے مجھے نہیں، بلکہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔''اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا؟ مگر کیوں؟''میں نے تیزی سے پوچھا۔

''کیونکہ وہ انسان نہیں، ایک درندہ تھا۔ کسی کتے کی طرح میرے جسم کو بھنبھوڑتا تھا۔ دانتوں سے کاٹتا تھا۔ تکلیف سے چلاتی تھی تو تھپڑ مار کر خاموش کرواتا تھا۔ ہر رات مجھے تختہ مشق بناتا اور ہر دن میں اس کے دیئے ہوئے زخموں کی سینکائی کیا کرتی۔ پہلے زخموں سے ابھی ٹیسیں اٹھ رہی ہوتیں اور وہ درندہ نئے زخم لگانے کے لیے تازہ دم ہو کر آ دھمکتا۔''وہ طیش کے عالم میں بولتی چلی گئی۔ نفرت سے اس کی گردن کی رگیں بھی تن گئی تھیں۔

''اوہ خدایا! تم کسی کو بتاتی نہیں تھی اس کی سفاکی اور بربریت کی کہانی؟''شبانہ کی باتوں نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ مرد کے کیسے کیسے گھناؤنے روپ دیکھنے کو ملے، گھر کی چار دیواری سے باہر۔

''تم نے کسی کو بتایا نہیں؟''میں نے پوچھا۔

''پہلے پہل تو خاموشی سے برداشت کرتی رہی مگر جب برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو بڑی بہن کو بتایا مگر اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کروا دیا۔ اور یہ بھی کہا کہ ایسی باتیں کسی کو نہیں بتایا کرتے۔''

''پھر؟''میں نے اضطراری حالت میں پوچھا۔

''ایک دو مرتبہ ناراض ہو کر میکے آ بیٹھی۔ اس ظالم کے ساتھ جانے سے صاف انکار کیا مگر ماں تو تھی نہیں۔ بھابی اور بھائی سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر سے پچکار کر، بہلا کر اس کے حوالے کر دیتے۔ بھائی نے ایک مرتبہ دبے لفظوں سے اسے تنبیہ بھی کی مگر اس

کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔دن بھر گھر کا کام کاج کرتی،ساس سسر کی خدمت کرتی اور رات کو اس کی درندگی کے سامنے مشق ستم بنتی۔''

وہ خاموش ہو کر خلا میں تکنے لگی جیسے اس سے آگے کی کہانی بیان کرنا اس کے لیے بہت اذیت ناک ہو۔

''تو پھر تم نے اس کے گھر سے بھاگ کر یہاں پناہ لے لی؟''

''ہاں۔''اس نے ہنکارا بھرا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ہاں ظاہر ہے۔کوئی کب تک اور کہاں تک مرد کی بربریت کا سامنا کرے۔مجھے اپنا وقت یاد آ گیا جب سیٹھ ناصر مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دے کر ہراساں کیا کرتا تھا۔

''صرف اپنی ذات تک اس کا ہر ستم برداشت کیے جا رہی تھی مگر اس نے میری کوکھ میں پلنے والے میرے بچے کی جان لے لی۔اپنے بچے کے قاتل کو کیسے معاف کر دیتی بھلا؟ کیسے اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی روز۔تب گھر سے بھاگ کر یہاں پناہ لی۔''اس کی زبان زہر اگل رہی تھی جبکہ آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

اُفف کتنا زہر بھر دیا تھا اس نانہجار نے اس بیچاری کے وجود میں۔مرد عورت کو کن کن طریقوں سے ٹارچر کر سکتا ہے۔یہ سوچ کر روح کانپ گئی۔

اگلی صبح شبانہ کی کھٹ پٹ کی آوازوں سے آنکھ کھلی۔وہ فیکٹری جانے کی تیاری کر رہی تھی۔رات کو مجھے بتا چکی تھی کہ وہ گارمنٹس کی کی فیکٹری میں سلائی کا کام کرتی ہے۔مجھے جاگتا دیکھ کر وہ مسکرائی اور''گڈ مارننگ''بھی کہہ ڈالا۔میں اس کایا پلٹ پر حیران رہ گئی۔کہاں وہ کل والی خشک مزاج اور کم گو شبانہ اور کہاں یہ آج والی مسکراتی شبانہ۔ہوسکتا ہے رات کو میرے آگے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا یہ خوشگوار نتیجہ سامنے آیا ہو۔میں نے بھی اس کے سلام کا خوشدلی سے جواب دیا۔

''جا کر ناشتہ کر لو۔وقت ختم ہو گیا تو دوپہر کے کھانے کا انتظار کرنا پڑے گا۔''اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں نصیحت کی۔

''بس جا رہی ہوں۔''میں نے ایک طویل انگڑائی لی اور بستر چھوڑ دیا۔

''اوکے!میں جا رہی ہوں۔شام کو ملاقات ہو گی۔آج رات کو تمہاری بیتی زندگی کی کہانی سنوں گی۔''اس نے مسکرا کر کہا اور ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔میں نے بھی واش روم کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے میڈم کے آفس کا رخ کیا۔دروازے پر ہلکی آواز سے ناک کر کے میں اندر چلی آئی۔میڈم نے بھی شاید ابھی ابھی آ کر اپنی سیٹ سنبھالی تھی۔ایکدم تر و تازہ اور پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔سرخ رنگ کے کپڑے پہنے اور ہونٹوں پر

سرخ لپ اسٹک لگائے میڈم بہت خوبصورت اور کم عمر سی دکھائی دے رہی تھی۔

''آؤ بانو! کیسی ہو؟'' میڈم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں میڈم!'' میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''شبانہ کے ساتھ وقت کیسا گزر رہا ہے؟''

''اچھا گزر رہا ہے۔شروع شروع میں تھوڑی اکھڑ مزاج لگی مجھے،مگر بعد میں پتا چلا کہ آدم بیزاری اور کرختگی کا خول چڑھائے بیٹھی ہے اپنی ذات پر۔حقیقت تو یہ ہے کہ اندر سے وہ بھی ایسی ہی نکلی۔مظلوم اور ستم رسیدہ۔'' میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''ہمم!'' میڈم اب کرسی پر جھولتے ہوئے میرا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔

''دوسروں کی چھوڑو......اپنے متعلق کیا سوچا تم نے؟ باقی کی زندگی کیسے گزارو گی؟''

''ابھی تو عدت پوری کروں گی میڈم۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اور اس کے بعد؟'' میڈم نے پوچھا۔

''اس کے بعد،کہیں نوکری ڈھونڈ لوں گی۔شاید شبانہ کی فیکٹری میں مجھے بھی ملازمت مل جائے۔''

''تم کیا سمجھتی ہو!اس طرح زندگی بڑے سکون سے کٹ جائے گی؟''

''نہ بھی سکون سے کٹی تو بے سکونی سے کٹ جائے گی۔اب کاٹنا تو پڑے گی نا۔'' میرے لہجے میں بے بسی اتر آئی۔

''چلو۔دیکھتے ہیں،آنے والا وقت ابھی تمہارے لیے اور کتنے سرپرائز چھپائے بیٹھا ہے۔'' میڈم ذومعنی انداز میں مسکرائی تو میں چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔جب کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکی تو کھڑی ہوگئی۔

''میڈم!'' جس کام کے لیے آپ کے پاس آئی تھی،وہ تو ذہن سے ہی نکل گیا۔میں نے ہتھیلی میں دبی پرچی کھول کر اس کی طرف بڑھائی۔

''اس پر ضروریات زندگی کی کچھ چیزیں لکھی ہیں۔میں تو عدت میں ہوں۔یہاں سے باہر قدم نہیں نکال سکتی۔آپ یہ چیزیں مجھے منگوا دیں۔''

''اوکے۔ابھی پیون کو مارکیٹ بھیج کر منگوا دیتی ہوں۔اور کچھ؟'' اس نے سنجیدگی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں میڈم! فی الحال انہی کی ضرورت ہے۔جب مزید چاہیے ہوں گی،آپ کو بتا دوں گی۔اور میڈم......ایک بات اور بھی کہنی تھی۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا تو میڈم چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں ہاں کہو! شرماؤ مت۔''

''ابھی میرے پاس پیسے نہیں ہیں، جب کام پر لگوں گی تو سارا ادھار چکتا کر دوں گی۔''میں نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''اوکے۔میں تمہارے لیے ایک کھاتہ بناتی ہوں۔۔اس میں تمہارا حساب لکھتی جاؤں گی۔جب کام پر لگ جاؤ گی۔امید ہے سب سے پہلے میرا کھاتہ ہی کلیئر کرو گی...... ہے نا؟''اس نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا تو میں نے احمقوں کی طرح فٹ سے گردن اثبات میں ہلائی۔

''جی میڈم!سب سے پہلے آپ کا قرضہ اتاروں گی پھر کوئی دوسرا کام کروں گی۔''میں نے اٹل لہجے میں جواب دیا تو وہ پھر سے مسکرانے لگی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔چیزیں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔''

میں باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب قدم اٹھانے لگی تو میڈم نے پیچھے سے آواز دی۔

''سنو بانو!''

میرے چلتے قدم رک گئے۔پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہ گویا ہوئیں۔

''چھوٹے چودھری کا فون آیا تھا۔تمہاری خیریت دریافت کر رہے تھے۔''

''اچھا!مگر انہیں میرے متعلق کس نے بتایا؟''

''میں نے بتایا!اور ویسے بھی پتا تو انہیں چل ہی جانا تھا۔بھلا یہ بات کب تک ان کی نظروں سے چھپ سکتی تھی۔''میڈم نے وضاحت پیش کی مگر میں کوئی بھی جواب دیئے بنا باہر آ گئی۔

شام کو شبانہ آتے ہوئے اپنے ساتھ دہی بڑے اور سموسے لے آئی۔اس کے ساتھ اب کسی قسم کی جھجک نہ رہی تھی۔وہ ایک بہترین دوست اور بہت اچھی غم گسار ثابت ہو رہی تھی۔ان چیزوں کے بعد چائے کا دور چلا۔آج چائے میں نے بنائی تھی۔چائے پینے کے ساتھ ساتھ پھر سے باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔

آج میں نے اپنے ماضی کے اوراق اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔وہ خاموشی سے سنتی رہی اور میں سناتی رہی۔میں اپنی داستان المناک سناتے سناتے نڈھال سی ہو گئی۔اب ہچکیوں کی شکل میں رو رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔

''اف!دنیا میں کتنا غم ہے اور میرا غم کتنا کم ہے۔''شبانہ نے ایک گہری سانس لی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کے سہلانے لگی۔

''حوصلے سے کام لو میری بہن!ابھی نیرنگیٔ زمانہ نجانے کیا کیا تماشہ دکھائے گا۔بہرحال ایک بات ضرور کہوں گی۔تمہیں گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔''

''تو کیا کرتی......گھر چھوڑنا میری مجبوری بن چکی تھی۔شوہر نے سانس لینا دوبھر کر دیا تھا۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''اب کیا کرو گی۔زندگی گزارنے کے لیے بہت سی چیزیں ضروری ہیں۔جن میں پیسہ سرفہرست ہے۔اس ہوسٹل میں فری میں تو کھانا نہیں ملے گا۔'' وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''جانتی ہوں۔عدت پوری ہوتے ہی تمہارے ساتھ کام پہ لگ جاؤں گی۔اپنے مالکوں سے میرے لیے بھی بات کرنا تم۔'' میں نے اسے تاکید کی تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''چلو کھانا کھانے چلیں۔ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔نو بجے تک کھانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔''

ہم دونوں کھانے کے لیے مخصوص ہال نما کمرے کی طرف چل دیں۔

☆......☆......☆

رات کے دس بجے کا وقت تھا جب میرا سیل فون بجنا شروع ہوا۔میں اس وقت اپنے کپڑے بیگ سے نکال کر الماری میں تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔تیسری چوتھی بیل پر میں نے کال ریسیو کر لی۔کسی ان نون نمبر سے کال آ رہی تھی۔

''ہیلو!'' میرے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے ایک بھاری اور دلکش مردانہ آواز نے ''السلام علیکم'' کہا۔

''جی کون؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا مگر اگلے ہی لمحے، میں اس آواز کو پہچان چکی تھی۔وہ چودھری فیصل تھا۔

''جی میں فیصل بات کر رہا ہوں۔'' اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

''جی جی! پتا چل گیا۔کیسے ہیں آپ؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو خیریت سے ہوں، بس آپ کے متعلق سنا تو بہت دکھ ہوا۔بابر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ رسمی سے انداز میں افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔میں فون کان سے لگائے اب بیڈ پر آ بیٹھی۔شبانہ بھی کتاب سے نظریں ہٹائے بڑی دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔اور مجھے اس بات کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔

''بس جی قسمت میں لکھے کو کون بدل سکتا ہے بھلا؟'' میں نے بھی رسمی انداز میں جواب دیا۔

''بچے کا چھت سے گر کے ہلاک ہو جانا فقط ایک حادثہ تھا۔اس کے سوا کچھ نہ تھا۔''

میں خاموش رہی تو وہ پھر سے بولا۔

''خیر! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔میں ہوں نا۔آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے حکم کریں۔'' اس کے لہجے سے حد درجہ حلیمی جھلک رہی تھی۔

''بہت شکریہ فیصل صاحب! اب میں اپنے قدموں پر چلنا سیکھ جاؤں گی۔ دنیا کی ٹھوکروں نے بہت کچھ سکھا دیا۔'' میں نے مربیانہ انداز میں بات کی تو وہ خاموش ہوگیا۔ یوں جیسے میری باتوں نے اسے لاجواب کر دیا ہو۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

''مس بانو! اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ آپ کو کہیں بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے آپ کو محنت مزدوری کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ آپ تو حکومت کرنے کے لیے آسمان سے اتاری گئی ہیں۔ یہ الگ بات کہ اب تک ٹھیک سے کوئی قدردان نہ ملا آپ کو۔''

اس کی باتوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔

''جی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں سمجھی نہیں۔'' میں نے سادگی سے پوچھا۔

''دھیرج رکھیں۔ سب سمجھ جائیں گی۔'' وہ ہنسا اور فون بند کر دیا۔ میں ہونق نظروں سے فون کی سیاہ اسکرین کو گھور رہی تھی۔

''کون تھا؟'' شبانہ نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

''چودھری فیصل۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور فون رکھ کے پھر سے کپڑے تہہ کرنے لگی۔

اگلے دن شبانہ کام پر چلی گئی جبکہ میں ناشتے سے فارغ ہو کر اس کے ناول سے دل بہلا رہی تھی جب آپا نے آ کر اطلاع دی کہ آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ میں نے کتاب بند کر کے رکھی، سر پر دوپٹہ ٹھیک سے لیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

راستہ بھر یہی سوچتی رہی کہ مجھ سے ملنے کون آ سکتا ہے بھلا؟ جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائی تو یہ کہہ کر دل کو سمجھایا اور ریلیکس ہوگئی کہ جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

آفس کے دروازے پر ناک کیا تو میڈم کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور میرا شک یقین میں بدل گیا میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔ آنے والا چودھری فیصل ہی تھا۔ میں نے اپنے چہرے کا بڑا حصہ اپنے دوپٹے سے ڈھانپا اور میڈم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''جی میڈم؟'' میں نے استفہامیہ انداز میں میڈم کی طرف دیکھا مگر اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ چودھری فیصل گہری نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی نظریں مجھے اپنے وجود پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''تشریف رکھو بانو! چھوٹے چودھری صاحب تم سے ملنے آئے ہیں۔'' میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں چودھری فیصل سے تھوڑا فاصلہ رکھ کے بیٹھ گئی۔ میں سر جھکائے بیٹھی تھی کہ میڈم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''تم لوگ باتیں کرو۔ میں آپا سے چائے کا کہہ کر ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر میڈم دفتر سے باہر نکل گئی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ چائے کا صرف بہانہ ہے۔ وہ ہمیں جان بوجھ کر تنہائی مہیا کر گئی ہے۔ اب اس تنہائی کا مقصد اور مصرف کیا تھا، یہ بھی کھل کر سامنے آنے والا تھا۔

''کیسی ہو بانو؟'' فیصل نے میری طرف رخ بدل کر بے تکلفی سے پوچھا تو میں چونکے بنا نہ رہ سکی۔ آپ سے تم پر آنا قابل غور تھا میرے لیے۔

''ابھی رات کو ہی تو آپ نے فون کر کے میری خیریت دریافت کی تھی۔ پھر اچانک ایسی کیا افتاد آن پڑی کہ آپ پھر سے خود کو اتنی زحمت میں ڈالتے ہوئے میری خیریت دریافت کرنے چلے آئے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

فیصل چونک کر میری طرف دیکھنے لگا پھر خجالت آمیز ہنسی ہنسا اور بولا۔

''بس ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہاری خیر خیریت پوچھتا چلوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آمد تمہیں اس قدر ناگوار گزرے گی۔'' وہ شرارت آنکھوں میں بھر کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں ابھی تک اس کی طرف دیکھنے سے اعتراض کر رہی تھی۔

''کیسا اتفاق ہے فیصل صاحب! آج سے دو سال پہلے بھی آپ کو ادھر سے گزرتے ہوئے مجھ سے ملنے کا خیال آیا اور اس وقت بھی میں عدت میں تھی مگر کسی کی محبت نے مجھے اتنی جرأت ضرور بخش دی کہ آپ سے ملنے سے صاف انکار کر دیا اور آج بھی اس وقت آپ کو مجھ سے ملنے کا خیال آیا جبکہ میں پھر سے عدت میں ہوں مگر آج میں ملنے سے انکار نہ کر سکی کیونکہ آج میں بالکل ''تہی دامن'' ہوں۔ میرے ساتھ کسی کی محبت کی طاقت نہیں۔ اب میں مکمل طور پہ آپ کے رحم و کرم پہ ہوں۔ آپ اس ہوسٹل کے کرتا دھرتا ہیں۔ بھلا انکار کرنے کی جرأت کیسے کر سکتی تھی۔'' بات کرتے کرتے میری آواز میں نمی سی گھل گئی۔

''پلیز ایسا مت سوچو! تم بے سہارا نہیں ہو۔ میں بنوں گا تمہارا سہارا۔'' وہ پر عزم لہجے میں بولا۔ میں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جب سے اس کے روبرو بیٹھی تھی۔ پہلی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی قطعی غیر ارادی طور پہ۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی جو تمہارے کانوں نے سنا۔ میں تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔ عمر بھر کے لیے۔ کبھی بیچ راہ میں نہیں چھوڑوں گا۔ بابر کی طرح کم ظرف نہیں ہوں۔'' وہ اپنے لہجے میں حتی المقدور اپنائیت سموتے ہوئے بولا۔

''سوری فیصل صاحب! مجھے اب کسی مرد کا سہارا نہیں چاہیے۔ اب باقی زندگی کسی مرد کے سہارے کے بغیر ہی گزارنے کا تہیہ کر لیا ہے۔'' میں نے اٹل لہجے میں جواب دیا تو اس نے کچھ کہنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر میڈم کو اندر آتا دیکھ کر اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے آخر۔'' میڈم نے اپنی کرسی پر گرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں میڈم فرح! ابھی بات کسی حتمی نتیجے پر پہنچی نہیں۔ جب پہنچ جائے گی تو عام سے خاص بن جائے گی۔'' فیصل نے معنی خیز انداز میں بات کی جس کی تہہ تک میڈم فوراً پہنچ گئی۔ اس نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا اور کرسی پر جھولتے ہوئے جواب دیا۔

''جی چھوٹے چودھری! آپ جب کسی ارادے کی ٹھان لیں تو اسے بھلا عام سے خاص بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے''

اس وقت مجھے میڈم سے کراہیت سی محسوس ہوئی۔ وہ اس وقت ہیرا منڈی کی وہ نائکہ لگ رہی تھی جو اپنے امیر کبیر گاہک کو پھانسنے کے لیے مچھلی کو کانٹے پر لگائے گاہک کو للچانے کا بندوبست کر رہی تھی۔ اتنے میں ملازمہ چائے کے برتن ٹرے میں رکھے اندر آتی دکھائی دی۔

میں اٹھ گئی۔

''میں اب چلوں گی میڈم!''میں نے باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے تو میڈم نے پیچھے سے آواز دی۔

''رکو بانو! بیٹھو، ہمارے ساتھ چائے پیئو۔''میڈم نے نرمی سے درخواست کی۔

''نہیں شکریہ!ابھی تھوڑی دیر پہلے چائے پی تھی۔''

''پلیز مس بانو!ایک کپ ہماری سنگت میں بیٹھ کر پیئیں گی تو ہمیں بہت اچھا لگے گا۔''فیصل نے آنکھوں میں لجاجت بھر کے کہا مگر میں کوئی بھی جواب دیے بنا کمرے سے باہر نکل آئی۔ میرا دل بوجھل ہو رہا تھا۔آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔تھوڑی دیر بھی مزید رکتی تو ان کے سامنے ہی شاید رونے لگ جاتی جو کہ بہت ہی معیوب لگتا۔کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور بیڈ پر گر کر زارزار رونے لگی۔

☆......☆......☆

اسی دن میڈم نے مجھے سامان منگوا دیا تھا۔شب و روز ایک تسلسل سے گزرنے لگے۔شبانہ کے ساتھ خوب نبھ رہی تھی۔اب میں نماز پنجگانہ ادا کرتی اور روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہو کر اس کی کتابوں کا مطالعہ کرتی۔اس کے پاس ناولز کی بہترین کلیکشن تھی۔

وقت سبک رفتاری سے گزرتا چلا گیا اور میری عدت کے دن پورے ہو گئے۔عدت پوری ہوتے ہی میں نے شبانہ کے ساتھ جا کر اس کی فیکٹری جوائن کر لی۔چند ضروری سوالات کرنے کے بعد سپروائزر نے مجھے نوکری دے دی۔

مجھے بھی ایک سلائی مشین کے پیچھے رکھے اسٹول پر بٹھا دیا گیا اور میں بھی کپڑے سینے لگی۔اس حصے میں صرف خواتین سلائی کرتی تھیں۔صرف سپروائزر مرد تھا۔اس کا نام ریاض تھا۔وہ بھی بہت اچھا اور شریف آدمی تھا۔کسی عورت سے غیر ضروری بات نہیں کرتا تھا۔

گارمنٹس فیکٹری میں مجھے کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ پھر فیصل کا فون آ گیا۔اس دن رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں اپنے اپنے بیڈ پر لیٹیں ناولز کے مطالعہ میں کھوئی ہوئی تھیں جب میرے موبائل فون کی رنگ ٹون بجنے لگی۔

فیصل کا نمبر دیکھ کر میں تذبذب میں پڑ گئی کہ کال ریسیو کروں یا نہ کروں۔آخر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے فون یس کر کے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو''میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''جی کیسی ہیں مس بانو صاحبہ؟''اس نے کھنکتے ہوئے لہجے میں میرا احوال دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔''میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''مگر میں ٹھیک نہیں ہوں۔''وہ شرارت سے بولا۔''ہر وقت عجیب سی بے چینی چھائی رہتی ہے، جسم و جان پر۔''

''میں کیا کر سکتی ہوں۔کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں اور اپنا علاج کروائیں۔''میں نے تنک کر جواب دیا تو اس نے قہقہہ لگایا۔

''میرا اعلاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔صرف آپ ہی میری مسیحا بن سکتی ہیں۔''

''میں بھلا کیسے آپ کے کسی کام آسکتی ہوں؟''میں اس کی بات کی تہہ تک پہنچنے کے باوجود انجان بنتے ہوئے بولی۔

''میری زندگی میں شامل ہو جاؤ۔میری سب بے تابیاں اور بے چینیوں کو قرار آجائے گا۔''وہ خمار آلود لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''مگر!اب میں کسی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتی۔باقی کی زندگی اکیلی گزارنا چاہتی ہوں۔''میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''نہ......اکیلی ذات صرف خدا کی ہوتی ہے۔انسان کو یہ اکیلا پن نہیں سجتا اور نہ ہی کوئی بشر تنہا رہ سکتا ہے۔''اس نے مربیانہ انداز میں نصیحت کی۔

''مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا اور کال ڈراپ کر دی۔فون رکھ کر میں نے شبانہ کی طرف دیکھا۔۔وہ بھی بغور میرا جائزہ لے رہی تھی۔

''کس کا فون تھا؟''

میں خاموش رہی تو وہ پھر بولی۔

''چھوٹے چودھری کا؟''

میں نے اب بھی لب کھولے بنا ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا کہتا ہے؟''اس نے کریدنا چاہا۔

''مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے۔''میں نے مختصر جواب دیا۔

''ہمم۔''وہ کچھ سوچنے لگی۔پھر بولی۔

''میرے خیال میں یہ آفر اتنی بری نہیں ہے۔اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو۔''اس نے نرم لہجے میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ تم کہہ رہی ہو شبانہ؟''میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔''تمہیں تو دنیا کے تمام مردوں سے نفرت ہے نا؟''

''نفرت تو ہے۔''اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔''مگر مرد کا سہارا لینا بھی تو عورت کی مجبوری ٹھہری۔کارخانے میں کپڑے سی سی کر کمر جھکانے سے بہتر ہے کہ چودھری کا ہاتھ تھام لو اور باقی زندگی خوشحالی سے کاٹو۔یہی عقلمندی ہے۔''

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میری آنے والی زندگی سکون سے کٹے گی۔کوئی بھونچال میرا منتظر نہیں ہوگا؟''میں نے سوالیہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

''سیدھی سی بات ہے بانو!چودھری ایک عیاش فطرت انسان ہے۔اسے تم سے یا تمہارے حالات سے کوئی ہمدردی نہیں

ہے۔اسے دلچسپی ہے تو تمہارے اس بے پناہ حسن سے،تمہارا حسین چہرہ اور دلکش سراپا اسے تمہاری طرف متوجہ کر رہا ہے۔تو بہتر یہی ہے کہ اپنی اس خوبصورتی کو کیش کرواؤ اور باقی زندگی عیش سے گزارو۔ یہاں بھی مزدوری کر رہی ہو۔تو پھر وہ مزدوری بری ہے کیا؟ تنخواہ تو اپنی مرضی کی ملے گی نا۔''اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

میں اس کی کسی بات کا جواب دیے بنا ہے لیٹ گئی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے بھی مزید کوئی بات نہ کی اور پھر سے ناول میں کھو گئی۔شبانہ کے کہے گئے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ بلاشبہ اس کا لفظ لفظ حقیقت پر مبنی تھا اور حقیقت جتنی بھی کڑوی ہو،اس کی سچائی سے مفر ممکن نہیں۔

اگلے دن کام سے واپس آئی تو میڈم نے اپنے آفس میں طلب کر لیا۔دعا سلام کے بعد سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تو میڈم بغیر کوئی تمہید باندھے سیدھی مطلب کی بات پر آ گئی۔

''کیا سوچا تم نے چودھری کی آفر کے متعلق؟'' میڈم نے یوں عام سے لہجے میں بات کی جیسے وہ کوئی سیل میں ڈسکاؤنٹ ریٹ پر سوٹ ملنے کی آفر ہو۔

''کیسی آفر میڈم؟''میں نے انجان بننے کی اداکاری کی۔

''چودھری نے تم سے بات کرنے سے پہلے ساری بات میرے گوش گزاری تھی۔ پھر تم سے بات کی تھی۔'' میڈم نے پر سکون لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا! آپ اس آفر کی بات کر رہی ہیں۔یعنی مجھ سے شادی کے خواہش مند ہیں چودھری صاحب۔''میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بات مکمل کی۔

''شادی کی آفر؟'' میڈم نے بڑی حیرانی سے یہ الفاظ دہرائے۔''تمہیں کس نے کہا کہ چودھری تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟'' میڈم کی بات سن کر میں گڑبڑا سی گئی۔

''رات کو چودھری صاحب نے فون پر مجھ سے بات کی تھی اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔'' میں نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''کیا چودھری نے تم سے یہ کہا تھا کہ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟'' میڈم نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''جی جی......''میں نے زور سے گردن اثبات میں ہلائی۔

''تمہیں یقین ہے کہ ان کے الفاظ یہی تھے؟'' وہ ابھی تک کھوجتی ہوئی نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔

''الفاظ تو یہ نہیں تھے مگر مفہوم یہی تھا......انہوں نے کہا کہ ''میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔''

میری بات سن کر میڈم دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔اسے یوں ہنستا دیکھ کر میں خجالت سی محسوس کر رہی تھی۔آخر میڈم کی ہنسی تھمی تو بولی۔

''بانو! تم بہت بھولی ہو۔چودھری نے تم سے فقط اتنا کہا کہ وہ تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے اور تم نے اپنے معصوم ذہن سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ وہ تم سے شادی کے خواہش مند ہیں۔''اتنی بات کر کے وہ پھر سے ہنسنے لگیں۔

''سیدھی سی بات ہے میڈم! کوئی کسی کو اپنی زندگی میں کب شامل کرتا ہے۔جب اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔اس فقرے کا مطلب ہی یہی نکلتا ہے۔''میرا لہجہ تھوڑا شکایت آمیز ہو گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ میڈم کے اس طرح ہنسنے سے مجھے اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔میرے غصہ کرنے پر میڈم نے ہنسی روک کر سنجیدگی اختیار کرلی اور بولی۔

''سوری بانو! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا ہرگز نہ تھا۔مجھے تو تمہاری معصومیت پر ہنسی آ گئی۔''

''میں سمجھی نہیں۔''میں نے بھی گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''دیکھو بانو! وہ تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔اس کا اظہار مجھ سے بھی کر چکے ہیں مگر تم سے شادی کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔وہ تمہاری کفالت کریں گے،تمہارا ہر خرچ اٹھائیں گے۔سمجھو یہ ایک قسم کی شادی ہی ہے مگر بغیر نکاح کے۔''میڈم نے اپنی بات مکمل کر کے اس کے اثرات میرے چہرے پر تلاشنا چاہے۔

یہ بات سن کر میں تو جیسے پتھر کا بت بن گئی۔چند لمحوں کے لیے جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو کر رہ گئی۔پھر میڈم کے لفظوں پر غور کیا تو طیش کی ایک تند و ترش لہر نے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''آپ کا مطلب ہے......وہ مجھے اپنی داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے؟''غصے سے میری آواز پھٹنے لگی تھی۔''اس نے اتنی گھٹیا بات سوچ بھی کیسے لی؟''میرا وجود جیسے خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''اس خبیث انسان کو کہہ دیجیے گا کہ آئندہ کبھی مجھے ایسی کوئی شرمناک آفر کی تو خون پی جاؤں گی اس کا۔''میں اپنی نشست سے کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھو بانو!''میڈم میرے ہیجان انگیز رویئے سے پریشان ہو گئی۔۔''پلیز ریلیکس۔''اس نے گویا التجا کرتے ہوئے کہا اور میں پھر سے کرسی پر گر گئی۔



ناول ''تہی دامن'' ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 4

''میں تمہیں آسان لفظوں میں سمجھاتی ہوں۔'' میڈم گلا کھنکار کر میری طرف متوجہ ہوئی۔

''دیکھو بانو! اب جو بات تم سے کہنے جا رہی ہوں، اسے ذرا توجہ اور تحمل سے سننا۔ بات یہ ہے کہ چودھری کے ساتھ تمہارا کنٹریکٹ ریلیشن شپ ہوگا۔ جس کی رو سے تم چودھری کی ذمہ داری بن جاؤ گی۔ تمہارا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا سب چودھری کے ذمہ ہوگا۔ بدلے میں تمہیں چودھری کو اپنا وقت اور وفاداری دینا ہوگی۔ جب تک تم چاہو، اپنی مرضی اور خوشی سے یہ تعلق نباہ سکتی ہو اور جب دل بھر جائے تو انہیں باقاعدہ اطلاع دے کر چھوڑ سکتی ہو۔ وہ تمہیں ان سب شرائط سے آزاد کر دیں گے۔ تمہارے پیروں میں پڑی بیڑیاں کٹ جائیں گی۔ تم پھر سے آزادی حاصل کر سکو گی۔ کوئی زور زبردستی نہیں چلے گی تم پر۔''

اس نے چند ثانیے میری طرف دیکھا۔ مجھے شانت دیکھ کر پھر سے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آج کل کے اس ترقی یافتہ دور میں ایسے تعلقات کوئی بہت زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ اگرچہ ہمارے معاشرے میں ایسے رشتوں کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر ماڈرن طبقے میں ایسے کیسز عام ہیں۔ ایلیٹ کلاس کے بزنس مین ہوں یا بیوروکریٹس اپنی سے آدھی عمر کی خوبصورت لڑکیوں کو لگژری فلیٹس لے کر الگ سے رکھتے ہیں۔ ان لڑکیوں کو مہذب دنیا کی مہذب زبان میں Keeps کہا جاتا ہے۔

جب تک وقت خوش اسلوبی سے گزرتا ہے، گزارا جاتا ہے اور جب کوئی دونوں فریقوں میں سے ایک فریق ایگریمنٹ کے اصولوں کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہیں بجائے ایک دوسرے سے الجھنے کے نہایت خوش اسلوبی سے اپنی راہیں جدا کر لی جاتی ہیں۔ اور پھر سے کسی نئے پارٹنر کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے۔ ایسی لڑکیاں اگر اپنی جوانی کے چند سال کسی بوڑھے رئیس کی گود میں ڈال بھی دیتی ہیں تو بدلے میں بہت کچھ حاصل کر لیتی ہیں۔ بنک بیلنس کے علاوہ دنیا بھر کی سیر و تفریح، اور لگژری لائف کے علاوہ، چھوٹی موٹی پراپرٹی بھی ہتھیا لیتی ہیں۔ اور پھر چودھری فیصل تو جوان اور ہینڈسم ہے۔ کوئی ساٹھ ستر سال کا بیمار بوڑھا نہیں، جس کے پاس جانے سے تم کراہیت محسوس کرو۔''

میڈم اب خاموش ہو کر پھر سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ میری رائے جاننے کی منتظر تھی۔

''آپ کی بات مکمل ہو گئی؟'' میں نے نہایت پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔ تقریباً۔'' میڈم کے چہرے پر اب تجسس نمودار ہونے لگا تھا۔

''مجھے یہ رشتہ اور یہ آفر نہیں منظور۔ اگر آپ نے مزید کوئی بات نہیں کرنی تو میں جانے کی اجازت چاہوں گی۔'' میرا لہجہ ابھی تک پرسکون تھا۔

''سوچ لو۔ میں تو تمہارے بھلے کے لیے ہی اتنا زور دے رہی تھی۔ بہر حال مرضی تو تمہاری ہی چلے گی۔'' میڈم نے کندھے اچکا کر بظاہر لاپرواہی سے جواب دیا مگر میں جانتی تھی کہ میڈم مجھے راضی کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گی۔

''مجھے آپ کے خلوص اور نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں۔ یہ آپ کا خلوص ہی تو ہے کہ آپ مجھے ہر رات ایک نئے گاہک کے حوالے کرنے کی بجائے ایک مستقل گاہک فراہم کر رہی ہیں۔ جو میری ہر رات کی قیمت یک مشت ادا کرے گا۔ کسی فلیٹ کی صورت یا پھر کسی پلاٹ کی شکل میں۔ مگر سوری میڈم! مجھے یہ ڈیل منظور نہیں۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ باہر جانے کے ارادے سے دروازے کی جانب ہو لی۔ چلتے چلتے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ میڈم کی طرف پلٹی تو میڈم ہکا بکا سی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

''جانتی ہوں میڈم! یہ ہوسٹل چودھری فیصل جیسے کرتا دھرتاؤں کے سر پہ چل رہا ہے۔ اگر وہ ڈونیشن دینا بند کر دیں تو آپ کے لیے اسے چلانا ناممکن ہو جائے۔ اسی لیے ان لوگوں کو خوش رکھنا آپ کی مجبوری ہے اور میرا انکار چودھری سے کبھی ہضم نہیں ہوگا۔ مجھے یہ ہوسٹل چھوڑ کر جانا ہوگا۔ فکر نہ کریں جلدی ہی کوئی دوسری جائے پناہ ڈھونڈ لوں گی۔''

یہ کہہ کر میں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی میڈم کے آفس سے باہر آ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن فیکٹری میں آن ڈیوٹی تھی۔ جب پیون نے آکر اطلاع دی کہ آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ میں سلائی مشین سے اٹھ کر اس کے پیچھے چلتی ہوئی میٹنگ روم تک چلی آئی۔ پیون دروازے سے واپس پلٹ گیا۔ میں اندر داخل ہوئی تو سامنے فیصل سفید کلف زدہ سوٹ پہنے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بڑے طمطراق سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے نروس ہوگئی۔ پھر خود کو مضبوط کرتے ہوئے اعصاب کو پرسکون رہنے کا حکم دیا اور سلام کرتے ہوئے اس کے سامنے دوسرے صوفے پر ٹک گئی۔

''جی چودھری صاحب! کیسے زحمت کی یہاں تشریف لانے کی۔ یہ جگہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ آنکھوں میں شکوہ بھر کے میری طرف دیکھنے لگا۔

''شایان شان تو یہ تمہارے بھی نہیں ہے بانو!''

اس کی بات سن کر میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا؟''

''ہاں کام ہے......اور وہ بھی بہت ضروری۔''اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''جی کہیے! مگر ذرا جلدی۔ میں اپنا کام چھوڑ کر آئی ہوں۔''

''بات یہاں بیٹھ کر کرنے والی نہیں ہے۔''

''تو پھر کہاں بیٹھ کر کریں گے؟''میں نے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''کسی اچھی اور پرسکون جگہ پر بیٹھ کر کرنے والی اور سننے والی ہے یہ بات۔''اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

باہر کمپاؤنڈ میں وہ گاڑی کے پاس کھڑا سپر وائزر ریاض سے بات کر رہا تھا۔صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ریاض اس سے حد درجہ مرعوب دکھائی دے رہا ہے۔اس کا سر جھکا جھکا کر، خوشامدانہ انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر ریاض ایک طرف کو چل دیا جبکہ فیصل نے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول دیا۔

میں پاس پہنچ کر رک گئی۔

''میں آپ کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔''میں نے دوٹوک انداز میں کہا تو فیصل جو کہ گاڑی میں بیٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا۔میرا غیر متوقع جواب سن کر وہ ٹھٹک گیا۔

''ہم صرف کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر چند منٹ اطمینان سے باتیں کریں گے۔اس کے علاوہ کچھ نہیں اور اس بات کا یقین کر لو کہ تمہیں مجھ سے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

یہ کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں چند لمحے تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی اور پھر اس کیساتھ پسینجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔اس نے گاڑی فیکٹری کی حدود سے نکال کر مین روڈ پر ڈالی اور مناسب اسپیڈ سے ڈرائیو کرتا ہوا ایک شاندار ریسٹورنٹ کے سامنے لا روکی۔ راستہ خاموشی سے کٹ گیا۔ ریستوران کے آگے گاڑی روک کر اس نے مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں گاڑی سے نکلی تو وہ پارکنگ ایریا کی طرف گاڑی بڑھا لے گیا۔ چند منٹ بعد وہ انگلی میں گاڑی کی چابی گھماتا ہوا ہوٹل کی جانب آتا دکھائی دیا۔سفید لٹھے کے سوٹ میں اس کا سرخ و سفید چہرہ تمتما رہا تھا۔میڈم کے کہے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے۔

''فیصل ایک جوان اور خوبرو مرد ہے۔ساٹھ پینسٹھ سال کا بیمار بوڑھا نہیں جس کے پاس جانے سے تمہیں کراہیت محسوس ہو۔''

وہ پاس آکر بولا۔''آؤ اندر چلیں۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے ریسٹورنٹ کے ایئر کنڈیشنڈ ہال میں داخل ہوئی تو خوشگوار خنکی میرے چہرے سے ٹکرائی۔اس نے ہال میں داخل ہو کر طائرانہ نگاہ سے اطراف کا جائزہ لیا اور ایک کونے میں رکھی ہوئی ٹیبل کی طرف بڑھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک باوردی بیرا ہماری طرف لپکا۔

''جی سر؟''اس نے مودبانہ انداز میں آرڈر پوچھا۔

''کیا کھاؤ گی؟''فیصل نے مجھ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔میں فیکٹری کی کینٹین سے کھانا کھا چکی ہوں۔''

''تم دو مینگو جوس لے آؤ۔''

''یس سر۔''ویٹر نے سر جھکایا اور چلا گیا۔

''ہاں اب بتاؤ!تمہیں میری پیشکش قبول کرنے میں کیا قباحت دکھائی دی؟''اس نے چھوٹتے ہی سوال داغ دیا۔

''سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ میں کسی کی رکھیل بن کر گناہ آلود زندگی نہیں گزار سکتی۔''میں نے ڈرے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا تو وہ چونک سا گیا۔اسے شاید مجھ سے اس طرح کے دوٹوک جواب کی توقع نہ تھی۔

''مگر میں نکاح نہیں کرسکتا۔''اب کی بار اس کا لہجہ قدرے نرمی لیے ہوئے تھا۔

''تو مت کریں۔میں کون سا مری جا رہی ہوں آپ سے نکاح کرنے کی چاہ میں۔''میرا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔''کوئی اور دیکھ لیں۔آپ کے مطلب کا مال ضرور مل جائے گا آپ کو۔''

''مال؟''اس نے حیرت سے زیرلب دہرایا۔

''جی جی مال۔ہم جیسی عورتیں آپ جیسے رئیسوں کے لیے مال غنیمت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔''

''پتا نہیں تم کیوں مجھ سے اتنا بدظن ہو رہی ہو؟میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھ رہی ہو۔''اس نے مصالحانہ لہجہ اپنایا۔

ویٹر جوس کے دو گلاس رکھ کر چلا گیا تو اس نے اپنی بات پھر سے شروع کی۔

''ہم لوگ زندگی میں صرف ایک ہی شادی کر سکتے ہیں اور وہ بھی اپنے خاندان کی کسی عورت سے۔خاندان سے باہر نہ تو شادی کرنے کی اجازت ہے اور نہ بچے پیدا کرنے کی۔اپنے خاندانی اصولوں کو میں کیسے توڑ سکتا ہوں بھلا؟''اس نے استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

''جوس لو نا۔''اس نے ایک گلاس میری طرف کھسکایا۔

میں نے گلاس اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے سپ بھرنے لگی۔

''نکاح بھی تو ایک ایگریمنٹ کا نام ہے تو پھر نکاح کا جھنجھٹ پالے بنا بھی تو ایک سمجھوتے کے تحت زندگی گزاری جا سکتی ہے نا؟تمہیں ہر حقوق نکاح جیسے ہی حاصل ہوں گے۔''

''مگر نکاح کے بغیر مجھے کوئی آسائش نہیں چاہیے۔اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو رہنے دیں۔بار بار اصرار کر کے مجھے میری نظروں

سے مت گرائیں پلیز۔“

”ٹھنڈے دماغ سے میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو بانو!“ اس نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر میں نے اس کے پکڑنے پہلے ہی کھینچ لیا۔

”سوری فیصل صاحب! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں اور میری بات آپ سمجھنا نہیں چاہ رہے۔ اس لیے مزید بحث کرنا بالکل فضول ہے۔ پلیز مجھے واپس ڈراپ کردیں۔ میرے کام کا حرج ہورہا ہے۔“ میں نے خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”بہت ضدی ہو تم!“ اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”معاف کیجیے گا آپ بھی کچھ کم نہیں۔ میرے وجود کا حصول اپنی ضد بنا کر بیٹھے ہیں اور میرا مسلسل انکار آپ کی انا کی دیوار پر ہتھوڑے کی ضرب ثابت ہورہا ہے۔“ میں طنزیہ انداز میں مسکرائی تو وہ بھی مسکرانے لگا۔

”دیکھنے میں جتنی معصوم نظر آتی ہو، اتنی ہو نہیں۔“

اس کی بات سن کر میں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ روکی اور بولی۔

”دنیا کی اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد معصومیت باقی کہاں بچتی ہے۔“

”تو کیا تمہارا یہ آخری فیصلہ ہے کہ نکاح کی ضد سے دستبردار نہیں ہوگی؟“

”اگر اسے آپ میری ضد سمجھتے ہیں تو ضد ہی سہی۔“

”اچھی طرح سوچ لو۔ مجھ سے ضد لگانے کا انجام بھیانک بھی ہوسکتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”پرواہ نہیں۔ آپ کی ہر دھمکی سر آنکھوں پر۔“ میں نے دل میں ایک انجانا سا خوف محسوس کیا مگر چہرے اور آواز پر اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔

”اوکے!“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں تمام تر دلائل دینے کے باوجود قائل نہ کرسکا۔ میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

”جی جی۔ میں تو کب سے بے چین ہوں جانے کے لیے۔“

فیصل نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ بل ادا کیا اور ہم دونوں ریستوران سے باہر آگئے۔ مجھے اس نے وہیں کھڑی رہنے کا اشارہ کیا اور خود گاڑی لینے چلا گیا۔ گاڑی میرے سامنے روکی تو میں فرنٹ ڈور کھول کر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ مختصر راستہ پھر خاموشی سے طے ہوا۔ میری فیکٹری کے صحن میں اس نے گاڑی روکی۔ میں خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کی تپش میں اپنے چہرے پر محسوس کررہی تھی۔ میں نے باہر نکل کر دروازہ بند کرکے آگے بڑھنا چاہا تو فیصل کی آواز نے پاؤں جکڑ لیے۔ اس نے مجھے میرا نام لے کر آہستگی سے پکارا تھا۔ پہلے مجھے اپنا وہم محسوس ہوا۔ پھر میں نے نیچے جھک کر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیا آپ نے ابھی ابھی مجھے پکارا؟''

''ہاں پکارا تو ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''جی۔؟''

''جمعہ والے دن آؤں گا، نکاح خواں کو ساتھ لے کر۔ میرا انتظار کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے باہر لے گیا۔ میں پتھر کا بت بنی ساکت وجامد کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے کانوں نے جو کچھ سنا ہے وہ حقیقت ہے یا کوئی خواب۔

جب وہاں کھڑی کھڑی میرے پاؤں شل ہونے لگے تو اندر اپنے فولڈر کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ پاؤں جیسے من من بھاری ہو چکے تھے۔ فیصل کے اعلان نے رگ وپے میں ایک سنسنی سی بھر دی تھی۔ مگر اس کے باوجود خوشی کا کوئی احساس نہ جاگا تھا۔ بلکہ کوئی بھی احساس نہ جاگا تھا۔ نہ خوشی اور نہ دکھ کا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کام شروع کیا مگر غائب دماغی کی وجہ سے بار بار غلطی کر رہی تھی۔

سپروائزر ریاض اپنی طرف آتا دکھائی دیا تو میں اپنی جگہ پہ کھڑی ہوگئی۔

''جی مس بانو! کیا آپ کو کچھ چاہیے؟''

''جی ریاض صاحب! مجھے فوری چھٹی چاہیے۔ طبیعت کچھ ٹھیک محسوس نہیں ہو رہی، گھر جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی جی آپ چلی جائیں۔ میں آپ کی لیو لگا دوں گا۔'' اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

میں نے ہینڈ بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور شبانہ کو جانے کی اطلاع دی۔ وہ پہلے ہی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ فیکٹری سے باہر نکلی، ایک رکشہ روکا اور ہوسٹل چلی آئی۔ ہوسٹل کے کمرے میں ایک نیا سرپرائز میرا منتظر تھا۔ دروازہ کھولا تو اماں میرے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اماں کو دیکھتے ہی میں دیوانوں کی طرح ان کی طرف لپکی۔

''اماں۔'' میرے پکارنے پر اماں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اماں کے اٹھنے کا انتظار بھی نہ کیا اور ان کے اوپر ڈھے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اماں میرے وجود کے بوجھ تلے دبی سسک رہی تھی۔

''ارے مجھے اٹھ تو لینے دے۔'' اماں کراہی تو میں پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اماں نے اٹھ کر پھر سے مجھے ساتھ لپٹا لیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں ماں بیٹی روتی رہیں۔ اماں نے مجھے خود سے الگ کر کے میری پیشانی چوم لی اور پھر سے سسکنے لگی۔

''میری نصیبوں جلی بیٹی!'' اور پھر سے گلے سے لگا کر رونے لگی۔ ''بانو! کیا اتنے لاڈ اور پیار سے اس لیے پالا تھا تجھے۔ کیا دنیا کی ٹھوکریں کھانے کیلئے؟''

''اماں! دعا مانگ کہ میں مر جاؤں۔ زندگی کا بوجھ مزید نہیں ڈھویا جاتا۔''

”کاش تو بچپن میں ہی مر جاتی۔ تب شاید رو دھو کے صبر بھی آ جاتا۔“

جب رو رو کے تھک گئیں تو ایک دوسرے سے الگ ہو کر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھیں رہیں۔ آخر میں نے لب کھولے۔

”اماں! تمہیں میرا اپتا کیسے ملا؟“

”فوزیہ کے بچے کا سنا تو افسوس کے لیے اس کے پاس جا پہنچی۔ سوچا تمہیں بھی ایک نظر دیکھ لوں گی۔ وہاں جا کر تمہاری پڑوسن کی زبانی پتا چلا کہ تمہارے ساتھ کیا کیا بیتی ہے۔ کیسے تجھے بابر نے مار مار کر گھر سے باہر نکالا تھا۔ یہاں کا ایڈریس بھی بابر نے مجھے دیا تھا شاید اسے مجھ پر یا میری تڑپتی ہوئی مامتا پر ترس آ گیا تھا۔ وہ جانتا ہے کہ تم یہاں پر ہو۔“ اماں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

”اماں! میرے بچے کیسے ہیں؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

”بغیر ماں کے بچے کیسے ہو سکتے ہیں۔ ویسے ہی ہیں۔ ڈرے سہمے سے۔ ان کی دادی تو اللہ کو پیاری ہو گئی۔ سیٹھ ناصر بھی اب بیمار رہتا ہے۔ شاید تیری بیوفائی کا غم کرتا ہے اندر ہی اندر۔ پہلے جیسی صحت نہیں رہی۔“

”تو کیا اس نے دوسری شادی نہیں کی؟“ اس کی حالت کا سن کر ایک احساس جرم سا مسلط ہو گیا ذہن پر۔

”نہیں۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ اور اب تو بچوں کے ساتھ بھی رویہ بہت بدل گیا۔ ان کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ انہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔“

”اماں! تم تک یہ اطلاعات کون پہچاتا رہتا ہے۔ تمہیں تو ان کے گھر میں جانے کی اجازت نہیں ہے نا؟“

”تمہاری ساس کے مرنے کے بعد اب بچے کبھی کبھار ملنے چلے آتے ہیں۔ ان کو اپنے ہاتھ سے ان کے من پسند کھانے بنا کر کھلاتی ہوں۔“

”بہت شکریہ اماں! احسان ہے تمہارا مجھ پر۔“ میرا لہجہ ممنونیت سے بھر گیا۔

”کول ہی رکھ اپنا شکریہ۔ تمہارے بچے سمجھ کر نہیں کھلاتی پلاتی ان کو۔ بن ماں کے سمجھ کر ترس آ جاتا ہے ان پر۔“ اماں کی آواز رندھ گئی اور میری آنکھیں پھر سے چھلک گئیں۔

”اماں! کبھی میرے متعلق نہیں پوچھا انہوں نے؟“ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی ماں مر چکی ہے۔ اب تو شاید تیری شکل بھی بھول چکے ہوں۔“ اماں نے گہری سانس لی۔ اماں کی باتیں کلیجے کو چھلنی کر رہی تھیں۔

”اماں کھانا کھائے گی؟“ مجھے بڑی دیر کے بعد خیال آیا۔

”نہیں! کھانا کھا چکی ہوں۔ تمہاری ہیڈ ماسٹرنی نے کھلایا تھا۔ میں تو بارہ بجے کی یہاں آئی بیٹھی ہوں۔“ اماں پھر سے لیٹ

گئی۔شاید دوہرے سفر کی مشقت نے نڈھال کر دیا تھا۔

''میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔''

میں اٹھ کر اماں کے لیے چائے بنانے کی تیاری کرنے لگی۔چند منٹوں کے اندر دو کپ تیار کر کے اماں کے سامنے لا رکھے۔

''اماں اٹھو! چائے پی لو۔''

اماں کراہتی ہوئی اٹھی اور ایک کپ اٹھا لیا۔میں نے دوسرا کپ اٹھا لیا۔

''اماں! ابا کیسا ہے؟''میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''مت پوچھ کیسا ہے۔زندہ لاش بن چکا ہے۔ہر وقت چپ کا روزہ رکھے چار پائی پر پڑا رہتا ہے۔نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔''

ابا کی ایسی حالت کا سن کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

''سچ پوچھو تو۔مجھے تو تھوڑے دنوں کا مہمان لگتا ہے۔''اماں کے لہجے کی سفاکی نے مجھے لرزا دیا۔

''ایسا مت کہو اماں! ابا کو کچھ نہیں ہوگا۔''میرے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا۔

''میں کون سا اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبانے جا رہی ہوں۔بس آثار تو کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دے رہے۔''اماں کا لہجہ تلخ ہو گیا اور پھر اس کے بعد میں نے بھی مزید کوئی بات نہ کی۔چپ چاپ دونوں چائے پیتی رہیں۔چائے کے خالی کپ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔

''اب کیا کرو گی؟ جس کی خاطر سب کو چھوڑا اس نے تمہیں مکھن سے بال کی طرح اپنی زندگی سے نکال باہر پھینکا۔''

''اماں۔''اتنا کہہ کر میں چپ ہو گئی۔پوری بات کرنے کے لیے ہمت مجتمع کرنے لگی۔اماں میری طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

''ہاں ہاں کہو! کیا کہنا چاہتی ہو۔؟ اگر تم واپس آنے کی بات کرنا چاہتی ہو تو مت کرنا۔تمہارے لیے واپسی کا کوئی راستہ سلامت نہیں۔''اماں نے اپنا ہاتھ کھڑا کر کے مجھے بات کرنے سے روکنا چاہا۔

''نہیں اماں! میں کچھ اور کہنے جا رہی ہوں۔واپسی کی ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔جانتی ہوں۔''

''تو کہو! کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''اماں! میں پھر سے شادی کر رہی ہوں۔''میں نے دھیمی آواز میں یہ کہہ کر گویا اماں کے سر پر بم پھوڑ دیا۔اماں اچھل کر بیٹھ گئی اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو بانو؟ تم پھر سے ایک نئے مرد کے پاس جا رہی ہو؟ اللہ معاف کرے۔''اماں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔''ہمارے گاؤں میں ایک عورت تھی۔اس نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں تو سب اسے عجیب عجیب ناموں سے پکارا کرتے تھے۔مذاق کا نشانہ بنا کر فقرے کسے جاتے تھے اس پر۔اس وقت کیا خبر تھی کہ خود میری بیٹی بھی انہی راہوں پر چل نکلے گی۔''اماں اب

دونوں ہاتھ تاسف بھرے انداز میں مل رہی تھی۔

''اماں! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ میں نکاح کر رہی ہوں۔ بدکاری نہیں۔'' میں نے قدرے اونچی آواز میں اماں کو ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''نکاح تو ایک مرد سے ہوتا ہے نا۔ یوں بار بار مرد بدلنے جیسی بے راہ روی پر نکاح اور شادی جیسے لفظ بھی پردہ پوشی نہیں کر سکتے۔'' اماں کی زبان برابر زہر اگل رہی تھی۔

''اماں! تم تو جانتی ہو کہ میں یہ تیسرا نکاح بحالت مجبوری کر رہی ہوں۔ اکیلی عورت کو دنیا جینے نہیں دیتی۔ اور اگر عورت جوان اور خوبصورت بھی ہو تو ہر کوئی تر نوالہ سمجھنے لگتا ہے۔'' میں روہانسی ہو گئی۔

''پتا نہیں بانو! تم مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہو؟ یا تم نے مردوں کو کھلونا بنا رکھا ہے۔'' اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کھڑی ہو گئی۔

''کہاں جا رہی ہو اماں؟ پلیز رک جاؤ۔'' اماں کے ساتھ میں بھی کھڑی ہو گئی۔

''مجھے جانا ہو گا اب۔ گھر سے فوزیہ کے بچے کی فوتگی کا بہانہ کر کے نکلی ہوں۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ہمارے گھر میں کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ فوزیہ تمہاری ہی سوتن بن کر گئی ہے۔''

میں نے اماں کو مزید روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جانتی تھی کہ وہ نہیں رکنے والی۔ نکلنے سے پہلے اماں نے مجھے گلے سے لگایا اور پیشانی چوم کر کہا۔

''تمہاری آنے والی زندگی تمہارے لیے خوشیوں کی نوید لے کر آئے میری بچی۔ اس سے زیادہ بھلا کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔''

میں نے نمناک آنکھوں سے اماں کو رخصت کیا اور خود واپس آ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ کسی کے گلا کھنکارنے پر آنکھ کھلی تو آنکھیں وا کر کے دیکھا۔ سامنے میڈم کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''معافی چاہتی ہوں۔ تمہیں ڈسٹرب کیا۔ تمہاری اماں چلی گئیں؟'' اس نے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی! ابھی ابھی گئی ہیں۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''چھوٹے چودھری کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ تم نے رضامندی کا عندیہ دے دیا۔''

''جی!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''میرے خیال میں تم نے بروقت درست فیصلہ کیا۔''

میں خاموش رہی تو اس نے پھر پوچھا۔

''مگر تم تو نکاح کے لیے بضد تھی نا؟''

''جی ہاں! چودھری نکاح کے لیے مان گیا ہے۔''

''کیا واقعی؟ مگر یہ انقلاب کیسے؟ یہ بات تو چودھری کے اصولوں کے خلاف ہے۔'' وہ بے یقینی کے عالم میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ''ایک بات تو طے ہے کہ چودھری تمہارے عشق میں گرفتار ہو گیا۔''

میڈم نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

''یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ یہ عشق ہے یا ضد۔'' میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا تو میڈم جیسے کسی گہری سوچ میں کھو گئی۔

''میڈم!'' میں نے پکارا تو وہ چونکی۔

''آپ کو بڑا ناز ہے نا اپنی چھٹی حس پر۔ بڑا یقین ہے نا اپنی پیشین گوئی پر۔ اب آپ کیا پیشگوئی کریں گی۔ میری آئندہ زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے؟''

''اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے بانو! یہی دعا ہے میری۔''

''بہت شکریہ میڈم! مگر یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ مجھے جواب چاہیے۔ اب آپ کا دل کیا کہتا ہے؟'' میں بھی جیسے ضد پر اڑ گئی۔

''یہ دل کمبخت اب بھی تمہارے مستقبل کے حوالے سے کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی باتیں سن کر میں لرز گئی۔ شاید اب کی بار مجھے اسکے منہ سے ایسے الفاظ سننے کی توقع نہیں تھی۔

''یعنی آپ کو چودھری فیصل پر اعتماد نہیں؟ وہ بھی بابر جیسا نکلے گا؟''

''مجھے نہیں لگتا کہ چودھری تم سے کسی قسم کی وعدہ خلافی کا مرتکب ہوگا۔ وہ یقیناً اپنی زبان کا پکا ثابت ہوگا۔'' میڈم کا لہجہ مستحکم تھا۔

''تو پھر کیوں ایسی بری فال منہ سے نکال رہی ہیں میرے لیے؟ اب تو مزید دکھ سہنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔''

''دیکھو بانو! میں کوئی ولی اللہ نہیں۔ اللہ کرے میرے سب اندیشے غلط ثابت ہوں۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ چودھری بتا رہا تھا کہ جمعے کی شام کو نکاح ہے۔''

''جی مجھے بھی یہی دن بتایا تھا انہوں نے۔'' میں نے جواب دیا۔

شام کو شبانہ آئی تو آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''کہاں گئی تھی اچانک کام چھوڑ کر؟ اور پھر جب واپس آئی تب بھی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔''

''چودھری فیصل کے ساتھ گئی تھی۔'' میں نے نارمل سے انداز میں جواب دیا۔

''مگر کیوں؟ اور کہاں؟'' اس نے ہینڈ بیگ بیڈ پر پٹخا اور میرے پاس بیٹھ گئی۔

''ایک ریستوران میں لے گیا۔اور پھر سے اپنا وہی مطالبہ دہرانے لگا۔''

''عجیب پاگل انسان ہے۔جب تم نے ایک بار انکار کر دیا تو جان کیوں نہیں چھوڑ رہا آخر۔'' وہ منہ بگاڑ کر بولی۔

''اچھا تم نے کیا جواب دیا اسے؟'' وہ اشتیاق بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''کیا دیا ہوگا؟ تم بتاؤ۔'' میں مسکرا کر بولی۔

''ہمم۔یقیناً تم نے جھاڑ پلائی ہوگی اور اپنے موقف پہ سختی سے ڈٹی رہی ہوگی۔'' اس نے اندازہ لگایا۔

''ہاں میں تو ڈٹی رہی تھی مگر وہ زیادہ دیر تک ڈٹ نہ سکا اور اس نے میری ڈیمانڈ مان لی۔''

''کیا؟'' وہ اچھل پڑی۔''مگر اتنی آسانی سے تو ماننے والا وہ بھی نہیں تو پھر......ہتھیار کیسے پھینک دیئے اس نے؟''

اس کا ہونق چہرہ دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

''بس پھینک دیئے۔یہ نہیں پتا کہ کیوں پھینک دیئے۔''

''یعنی اب وہ تم سے نکاح کرنے کے لیے تیار ہو گیا؟''

''ہاں جی یہی بات ہے۔''

''کمال ہو گیا پھر تو۔تو پھر کب بنو چودھرانی بننے جا رہی ہے؟'' وہ شوخ ہونے لگی۔

''جمعے کی شام کو۔'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

☆......☆......☆

اسی رات کو فیصل کا فون آ گیا۔میں سونے کی تیاری کر رہی تھی۔جب اس کی کال آئی۔

''تم کل سے فیکٹری نہیں جاؤ گی۔'' اس نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے کمزور سا احتجاج کرنا چاہا۔

''بس میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا۔اور ویسے بھی اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

میں خاموش رہی تو بولا۔

''تمہارے لیے فلیٹ دیکھتا رہا آج۔میں چاہتا ہوں کہ تمہارے شایان شان فلیٹ خریدوں۔جس میں شہزادی بن کر رہو۔'' اس کا لہجہ شوخ ہو گیا۔

میں اب بھی خاموش رہی تو پوچھنے لگا۔

''تمہیں میری آواز تو سنائی دے رہی ہے نا؟''

''ہاں جی! سن رہی ہوں۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا کیونکہ میری نظریں بار بار شبانہ کی طرف بھی اٹھ رہی تھیں۔ جس کے کان پوری طرح میری طرف متوجہ تھے اور وہ بظاہر کتاب کا مطالعہ کرنے کے باوجود کن انکھیوں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''کل آؤں گا ہوسٹل۔ میرا انتظار کرنا۔'' اس نے کہا۔

''اوکے۔'' میں نے پھر سے مختصر جواب دیا۔ اس نے کال ڈراپ کر دی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' فون بند کرتے ہی شبانہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''فی الحال تو کام چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ آگے آگے کیا پابندیاں لگائے گا۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''ہمم! کہیں ایسا تو نہیں بانو؟ تم نے اپنے لیے ایک سونے کا پنجرہ منتخب کر لیا ہو؟'' اس کی آنکھوں میں تشویش لہرانے لگی۔

''پتا نہیں یار! کیا منتخب کیا ہے، یہ تو آنے والا وقت ہی بہتر بتائے گا۔ اب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔'' میں نے لاپرواہی سے جواب دیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں کام پر نہ گئی بلکہ اپنا استعفیٰ لکھ کر شبانہ کے ہاتھ بھجوا دیا۔ چار بجے میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی آواز میں کسی نے دستک دی اور پھر اگلے ہی لمحے فیصل اندر چلا آیا۔ میں اس وقت بھی بیڈ پر لیٹی لایعنی سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر اٹھ بیٹھی اور دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

''بانو! میرے ساتھ میرا ڈرائیور بھی ہے۔ تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی ہے۔ وہی سامان اٹھائے باہر کھڑا ہے۔''

پھر اس نے میرا جواب لینا ضروری خیال نہ کیا اور اسے اندر بلا لیا۔ ڈرائیور کے ہاتھوں میں چار پانچ شاپنگ بیگز تھے۔ وہ خادمانہ انداز میں نظریں جھکائے اندر آیا، تمام شاپنگ بیگز بیڈ پر رکھے اور سر جھکائے واپس باہر چلا گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں حیرت سے ان شاپرز کو دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے لیے کچھ چیزیں خریدی ہیں۔ دیکھ کر بتاؤ! کیسی ہے میری چوائس؟'' وہ خوشدلی سے بولتا ہوا میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے وجود سے مسحور کر دینے والے کسی مہنگے کلون کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اس کے اس قدر قریب بیٹھنے پر میں نروس سی ہو گئی۔

''کھولو نا! دیکھ کر بتاؤ۔'' اس نے بڑی اپنائیت سے مطالبہ کیا۔ میں ایک ایک کر کے شاپنگ بیگز میں رکھا سامان نکالنے لگی۔ سب سے پہلے سب سے زیادہ پھولا ہوا بیگ کھولا۔ اس کے اندر ایک گتے کا بڑے سائز کا ڈبہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہ ڈبہ باہر کھینچ کر نکالا، کھولا تو اس میں ایک گلابی رنگ کا کامدار سوٹ تھا۔ جس پر ریشم کے دھاگے اور قیمتی نگوں اور موتیوں سے نفیس کام کیا گیا

تھا۔ میں حیرت سے اس سوٹ کو دیکھنے لگی تو وہ بولا۔

''کھول کر دیکھو۔ یہ پرسوں تم نکاح کے موقع پر زیب تن کرو گی۔''

میں وہ سوٹ ڈبے سے باہر نکالا اور کھول کر دیکھنے لگی۔ بڑے اسٹائلش انداز میں، مشہور برانڈ کا ڈیزائنر سوٹ تھا۔ دوپٹہ تو بہت ہی خوبصورت تھا۔ میں سوٹ پر نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگی اور وہ بولی۔

''ان سب چیزوں کی بھلا کیا ضرورت تھی؟''

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''اب تم میری زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہو۔ تو بہتر ہے کہ ان دقیانوسی باتوں اور اس روایتی رویے کو یہیں چھوڑ دو۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' میں بھولپن والی سنجیدگی لیے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرا مطلب ہے کہ اب دوبارہ تمہارے منہ سے یہ فقرہ نہ سنوں۔ تمہیں کچھ بھی پیش کروں تو یہ فقرہ کبھی منہ سے مت نکالنا کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

میں جھینپ گئی۔ اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ باقی شاپنگ بیگز الٹ کر ان میں رکھی چیزیں بیڈ پر گرانے لگا۔ دیگر چیزوں میں میک اپ کا سامان، جوتے، پرس وغیرہ تھے۔ ہر چیز امپورٹڈ اور بیش قیمت تھی۔ پھر ایک چھوٹے سائز کا خوبصورت شاپنگ بیگ اس نے کھولا اور اس کے اندر رکھا ہوا مخملیں بکس باہر نکالا۔ یہ زیورات رکھنے والا ڈبہ تھا۔ اس نے وہ بلو کلر کا ویلوٹ کا ڈبہ کھول کر میرے آگے کیا تو اندر رکھی جیولری کی چمک دمک سے میری آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ اس ڈبے کے اندر رکھا ڈائمنڈ کا نیکلس جگمگا رہا تھا۔ نیکلس کے ساتھ دو چھوٹے بندے اور ایک انگوٹھی بھی تھی۔

''کیسا لگا یہ؟'' وہ گہری نظروں سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

میں جو یہ ساری شاپنگ دیکھ کر ہراساں ہو رہی تھی۔ اس ڈائمنڈ کی جیولری کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ میں نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی قیمتی اور انمول چیزیں کبھی میرے وجود کو چھوئیں گی۔

''اب میں کیا بولوں؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر تر کرنے کی کوشش کی۔ ''آپ نے وہ فقرہ بولنے سے منع کر دیا۔ جس کا استعمال اس موقع پر شاید سب سے زیادہ کرتی میں۔''

''ہاں وہ تو میں نے روک دیا۔ کچھ اور کہہ لو۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''کچھ اور۔'' میں خود کلامی والے انداز میں زیر لب بڑبڑائی۔ ''اور کیا کہوں؟؟'' میں ہونق انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ میرے ہونق چہرے اور اور احمقانہ باتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''کچھ بھی کہہ لو۔ٹرائی تو کرو کچھ کہنے کی۔''ابھی تک اس کے لبوں پر ایک شریری مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی ہوں جی۔آپ نے میرے لیے بہت زیادہ کر دیا۔''میں نے جھجکتے ہوئے بات مکمل کی۔

''اچھا جی!''اس نے اپنے لہجے میں مصنوعی حیرانگی کا رنگ بھرا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اگر آپ چاہیں تو......آپ بھی میرے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں جی۔''

میرا ٹھنڈا یخ ہاتھ اس کے گرم ہاتھوں میں کپکپا رہا تھا۔

''جی؟میں بھلا آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''اگر آپ کو زیادہ زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے کا پلا دیں جی۔اور چائے دو کپ بنایئے گا۔آپ کا ٹھنڈا کپکپاتا ہاتھ بتا رہا ہے کہ آپ کو اس وقت مجھ سے بھی زیادہ طلب ہو رہی ہے چائے کی۔''

میں نے اپنا ہاتھ کھینچا اور اٹھ کر چائے بنانے کی تیاری کرنے لگی۔فیصل اب بیڈ کے پشتے سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو چکا تھا۔اس کی موجودگی مجھے پریشان کر رہی تھی۔اس کی بیباک نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔میں نے کیٹل میں پانی ڈال کر اسے سوئچ بورڈ کے پلگ سے لگایا اور نظر بے اختیار فیصل کی جانب اٹھ گئی۔

وہ جو پوری طرح میری طرف متوجہ تھا۔نظریں چار ہوتے ہی لوفرانہ انداز میں مسکرانے لگا۔اس کی مسکراہٹ سے میں جز بز ہونے لگی۔میں نے شبانہ کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے ایک ناول اٹھایا اور اسے زبردستی تھما دیا۔

''جب تک چائے نہیں بن جاتی۔آپ اس کو دیکھیں۔''

وہ میری حالت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اچھا جی!''اس نے فرمانبرداری سے کتاب کو پکڑ لیا۔''مجھے تو کتابیں پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جی۔مگر آپ کی خوشی کی خاطر دیکھ لیتا ہوں۔''

وہ کتاب کے اوراق بے دلی سے الٹنے پلٹنے لگا۔اور میرے لیے یہی غنیمت تھا کہ اس کی آوارہ اور بیباک نظروں کی دسترس سے محفوظ ہو گئی۔چاہے وقتی طور پہ ہی سہی۔پتا نہیں کیوں دل چاہ رہا تھا کہ چودھری فیصل جلد از جلد یہاں سے چلا جائے مگر میں تو اس کے ہمراہ پوری زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔یہ بات ذہن میں آئی تو اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔

چائے تیار کر کے دو کپوں میں انڈیلی۔کپ ٹرے میں رکھے اس کی طرف پلٹی تو وہ کتاب چہرے کے آگے کیے اس کے اوپر سے آنکھیں نکالے بدستور میری طرف دیکھ رہا تھا۔اس کی بے ایمانی دیکھ کر میں سلگ اٹھی۔ٹرے اس کے آگے رکھی اور کتاب اس کے ہاتھ سے پکڑ لی۔

''آپ چائے پئیں۔ یہ آپ کے بس کا کام نہیں۔''

میرا طنزیہ لہجہ دیکھ کر وہ خفت زدہ انداز میں ہنسا۔

''جی جی۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ کتابیں پڑھنا ہمارے بس میں کہاں۔ ہم تو خوبصورت چہرے پڑھ سکتے ہیں فقط۔'' اس نے پھر سے نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

☆......☆......☆

چائے پی کر جب اس نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو میں نے بخوشی دے دی۔ میں خود اس کی موجودگی میں اعصابی تناؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بیڈ پر بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹنے سے پہلے پھر سے انہیں بغور دیکھنے لگی اور فیصل کے ذوق کو سراہنے لگی۔ ہر چیز اپنی قیمت کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔ میں نے سب چیزیں اٹھا کر الماری میں رکھ دیں اور پھر جمعے کا دن اپنے جلو میں کئی انجانی مسرتیں اور اندیشے چھپائے آن پہنچا۔

آج شبانہ نے فیکٹری سے چھٹی لے لی تھی۔ ویسے بھی سپر وائزر ریاض اس پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مہربان تھا۔ اس لیے چھٹی لینے میں کبھی کوئی مشکل پیش نہ آئی تھی۔ فیصل نے ایک بہترین میرج ہال کا ایک میٹنگ روم ہائر کیا ہوا تھا، نکاح کی تقریب وہیں پہ منعقد ہونا تھی۔

میڈم کے ذریعے یہ اعلان ایک دن پہلے ہی کروا دیا تھا کہ جمعہ والے دن ہوسٹل میں رہنے والا ہر ذی نفس فیصل کا مہمان ہے۔ چودھری صاحب کے نکاح کی خوشی میں ہاسٹل کے سارے مکین مدعو تھے اور اس رات کا ڈنر چوہدری کے ذمہ تھا۔

شام کے پانچ بجے تک میں نے نہا کر وہ پنک کامدار سوٹ پہن لیا اور اب میں بیڈ پر شبانہ کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ میرے بناؤ سنگھار میں مصروف تھی۔ میک اپ کرنے کے بعد اس نے ہیروں کے نیکلس سیٹ کو میری زیبائش کا حصہ بنایا اور دو قدم دور ہٹ کر تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیا تو دونوں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر بے اختیار بلائیں لے ڈالیں۔

''چشم بدور! بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

میں اٹھ کر دیوار کے ساتھ چپکے چھوٹے سائز کے آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس میں پورا سراپا تو نظر نہیں آیا البتہ چہرہ اور اور کندھے دکھائی دے رہے تھے۔ اس آئینے میں جتنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ بہت خوب لگ رہی تھی۔ بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ تیسری بار دلہن بنی کھڑی ہوں۔ ابھی تک چہرے کی معصومیت اور دلکشی برقرار تھی۔

چند لمحے اپنے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی پھر وہاں سے ہٹ گئی اور بیڈ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت اوپر سے میڈم آ گئی۔ میڈم کو دیکھ کر میں بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ میڈم نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگایا اور پیشانی چوم لی۔

''ہمیشہ خوش رہو میری جان! کبھی کوئی غم پاس نہ پھٹکنے پائے۔ یہ چاند سا چہرہ ہمیشہ یونہی جگمگاتا رہے۔''

''آمین۔'' پاس کھڑی شبانہ نے فوراً کہا۔

''فیصل نے فون کیا ہے۔ وہ گاڑی کے ساتھ ڈرائیور بھیج رہا ہے۔ تم دونوں تیار ہو نا؟''

''جی میڈم! بانو کو تیار کر دیا۔ میں بھی دس منٹ میں ہو جاتی ہوں۔'' شبانہ نے الماری سے اپنا ہینگر شدہ سوٹ کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

''اور تم بانو! اپنا ضروری سامان ایک سوٹ کیس میں پیک کر چکی ہونا۔ جب ڈرائیور آئے تو اسے کہنا وہ اٹھا کر ڈکی میں رکھ آئے گا۔''

''جی میڈم! میں نے اپنی پیکنگ رات کو ہی مکمل کر لی تھی۔''

''گڈ! میں بھی تیار ہونے جا رہی ہوں۔''

میڈم کمرے سے باہر چلی گئی تو میں کونے میں کھڑے اس سوٹ کیس کو تکنے لگی جس میں فیصل کے خریدے گئے نئے ملبوسات اور دیگر قیمتی چیزیں بند تھیں۔ میں اپنے نئے اور قیمتی ملبوسات ایک دن پہلے ہی پیک کر چکی تھی جبکہ پرانے اور بوسیدہ ہو جانے والے کپڑے ہوسٹل کی آیا کے حوالے کر دیئے تھے۔ میں اپنے ہمراہ کوئی بھی پرانی چیز لے کر جانے کی روادار نہ تھی۔ نہ پرانے کپڑے اور نہ ہی پرانی یادیں۔

بیس پچیس منٹ بعد دروازے پر ہلکی آواز میں دستک دی گئی۔ میں سمجھ گئی کہ ڈرائیور ہمیں لینے کے لیے آن پہنچا ہے۔

''آ جاؤ۔'' میں نے اپنی آواز میں تھوڑا تحکم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

''اسے گاڑی کی ڈکی میں رکھ آؤ۔ ہم لوگ بھی تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔'' میں نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کر کے کہا تو اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور وہ بھاری بھرکم سوٹ کیس اٹھائے باہر نکل گیا۔

میں اور شبانہ بھی جانے کے لیے باہر آ گئیں۔ اس فینسی جوڑے اور ہیل والے جوتے کے ساتھ ہوسٹل کی راہداریوں میں چلنا بہت عجیب لگ رہا تھا۔ کئی کمروں کے ادھ کھلے دروازوں اور کھڑکیوں سے کئی حسرت ناک نگاہوں نے مجھے خراج تحسین پیش کیا۔

کچھ نگاہوں میں حسرت کے دیے ٹمٹما رہے تھے اور کچھ نظروں میں حسد کے چراغ روشن تھے۔ مختلف راہداریوں اور کوریڈورز سے گزر کر میڈم کے آفس میں پہنچیں تو میڈم وہاں تیار کھڑی ہماری راہ تک رہی تھی۔

سبز سلک کی ساڑھی میں میڈم بہت باوقار اور خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ میں شبانہ کی سنگت میں خراماں خراماں چلتی ہوئی اس کے پاس جا رکی۔

''میڈم! آج آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔'' میں نے میڈم کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''جتنی بھی حسین لگوں مگر تم جتنی نہیں لگ سکتی۔'' میڈم نے پیار سے میرا گال تھپتھپایا۔

''آپ مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔ بس میرا دل رکھنے کی خاطر مجھے بہلاتی ہیں۔''

''شریر کہیں کی!'' میڈم نے قہقہہ لگایا اور پھر میں ان دونوں کے جلو میں ہوسٹل سے باہر گاڑی تک آئی۔ گاڑی بالکل مین گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور گاڑی میں، انجن اسٹارٹ کیے بیٹھا تھا۔

شبانہ نے عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گئی تو وہ گھوم کر دوسری سائیڈ سے آئی اور میرے مقابل بیٹھ گئی جبکہ میڈم ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔

گاڑی آگے بڑھی تو آنکھیں نم ہونے لگیں۔ میں تو ایسے رو رہی ہوں جیسے بابل کے گھر سے ڈولی میں بیٹھتے وقت لڑکیاں روتی ہیں۔ یہ سوچتے ہی ہنسی آتے آتے رہ گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد گاڑی میرج ہال کے دروازے کے بالکل سامنے جا رکی۔ فیصل دروازے پر کھڑا ہمارا ہی منتظر تھا۔ میں شبانہ کے ہمراہ گاڑی سے اتری تو اس کی بیباک نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ میڈم نے آگے بڑھ کر شادی کی مبارک باد دی تو میڈم سے باتیں کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں میرے سراپے پر ہی مرتکز تھیں۔

''آیئے اندر تشریف لایئے۔'' اس نے بازو وا کر کے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

وہ ہمارے آگے چلنے لگا۔ ایک لمبی راہداری جو مختلف بینکوئیٹ ہالز کے متوازی ہوتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس پر چلتے چلتے آخری کونے پر ایک لکڑی کا منقش دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس دوازے سے اندر داخل ہوئے تو پتا چلا کہ یہ ایک بڑے سائز کا میٹنگ روم ہے۔ جہاں صرف سو ڈیڑھ سو افراد کے بیٹھنے اور کھانا کھانے کی سہولت موجود تھی۔

سامنے ایک سمپل سا چھوٹے سائز کا اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر کھڑے ہو کر غالباً لوگ تقریریں وغیرہ کرتے ہوں گے مگر آج اس پر ایک نکاح کی تقریب ہونے ہونے جا رہی تھی۔

میں شبانہ اور میڈم کے ہمراہ اسٹیج پر رکھے ایک سادہ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میرے سامنے ہال میں گول میزیں اور ان کے گرد دس دس کرسیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہوسٹل کی لڑکیاں اور عورتیں جوق در جوق آ رہی تھیں اور یہ خالی میزیں بھرتی جا رہی تھیں۔

فیصل ہال میں گھوم پھر کر انتظامی معاملات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ آج گرے کلر کے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا اور ہمیشہ کی طرح بڑا شاندار اور وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا شمار شاید ان لوگوں میں ہوتا تھا جن پر ہر قسم اور رنگ کا لباس جچ جاتا ہے۔

پورے ہال میں فیصل اور اس کے ڈرائیور کے علاوہ، مردوں کے نام پر صرف چند ویٹرز تھے۔ ہوسٹل کی خواتین فیصل کو بڑے شوخ انداز میں شادی کی مبارک باد دے رہی تھیں۔ کچھ تو ضروت سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ پرانی شناسائی نبھائی جا رہی ہے۔ اتنے میں ہال کمرے میں تین مرد مزید داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک باریش آدمی یقیناً نکاح خواں تھا جبکہ دوسرے دو آدمی گواہی کے لیے لائے گئے تھے۔

فیصل نے ان تینوں کا استقبال کیا اور انہیں ساتھ لیے اسٹیج پر چڑھ آیا۔ سب نے اپنی اپنی نشست سنبھال لی اور مولوی نے نکاح پڑھانا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہال میں مکمل سکوت چھا گیا۔ ایجاب و قبول کروایا گیا اور دو لاکھ روپے حق مہر رکھا گیا۔ اس کے بعد اس باریش آدمی نے اپنے ساتھ لائے ہوئے رجسٹر کو کھولا اور اس میں ہمارے نکاح کا باقاعدہ اندراج کیا گیا۔ نکاح نامے کے فارمز پر بھی میں نے اور فیصل کے علاوہ ان دونوں گواہان نے بھی دستخط کیئے۔

ایک مرتبہ پھر سے مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ فیصل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے آدمیوں کے گلے لگ کر نکاح کی مبارکباد وصول کی۔ اس کے ڈرائیور نے مٹھائی کی ٹوکریاں کھول کر پر میز پر رکھ دیں۔ اسٹیج پر بھی ایک ٹوکری کھول کر رکھ دی گئی۔

نکاح کے بعد ویٹرز کھانا لگانے لگے تو فیصل نے ان چند آدمیوں کو ایک کونے میں بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں چلنے کے لیے کہا۔ شاید ان کے کھانے کا ارینج منٹ وہاں الگ سے کیا گیا تھا۔ اب اسٹیج پر میں، شبانہ اور میڈم رہ گئی تھیں۔ ویٹرز نے ہمارے آگے بھی کھانے کی ڈشیں لا کر رکھیں۔

کھانے میں مٹن قورمہ اور چکن بریانی کے علاوہ کھیر بھی شامل تھی۔ شبانہ نے پلیٹ میں میرے لیے تھوڑا سالن ڈالا اور ساتھ نان کا ایک پیس پکڑا دیا۔ بھوک ہونے کے باوجود مجھ سے کھانا نہ کھایا گیا۔ حالانکہ کھانا بہت لذیذ اور عمدہ پکایا گیا تھا۔ میں نے چند لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا ہوا؟'' شبانہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس دل نہیں چاہ رہا۔''

''کیوں دل نہیں چاہ رہا؟'' اس نے ڈانٹنے والے انداز میں پوچھا۔

''پتا نہیں یار۔ نوالے منہ میں پھول رہے ہوں جیسے۔'' میں نے جواب دیا تو وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''ہمم! سمجھ گئی۔''

''کیا سمجھ گئی؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں دکھائیں۔

''لڑکیو! دھیان سے کھانا کھاؤ۔ کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے۔'' میڈم نے پیار بھری ڈانٹ پلائی تو ہم نے خاموشی اختیار کر لی۔ چند منٹ بعد فیصل اور وہ آدمی اس چھوٹے سے کیبن نما کمرے سے برآمد ہوئے۔ فیصل انہیں چھوڑنے دروازے تک گیا اور واپس پلٹ کر اسٹیج پر چلا آیا۔

''آپ لوگوں نے کھانا ٹھیک سے کھایا نا؟'' اس کی نگاہیں میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

میرے بولنے سے پہلے شبانہ بول پڑی۔

''جی جی دولہا بھائی! ہم سب نے تو پیٹ بھر کر کھایا۔ مگر آپ کی بیگم نے کچھ نہیں کھایا۔''

''کیوں؟ ہماری بیگم نے کیوں نہیں کھایا؟ آپ کو کھلانا چاہیے تھا نا۔''

''میں نے تو بہت زور لگایا مگر نہیں کھا رہی۔ غالباً آپ کے ہاتھوں سے کھانا چاہ رہی ہے بنو رانی۔'' شبانہ نے قہقہہ لگایا تو میں نے اپنی کہنی اس کے پہلو میں ماری۔

''اوئی ماں!'' اس کے منہ سے سسکاری نکلی تو فیصل اور میڈم ہنسنے لگے۔ میں نے خفت زدہ انداز میں پلکیں جھکا دیں۔ فیصل ہال میں نظریں دوڑانے لگا۔ جہاں خواتین کھانے سے زیادہ اب گپیں مارنے میں مشغول تھیں۔

''میڈم! اب ہمیں جانے کی اجازت دے دیں۔'' اس نے میڈم کی طرف دیکھا۔

''جی جی چھوٹے چودھری صاحب! کیوں نہیں۔ ہم دونوں آپ کو دروازے تک رخصت کرنے جائیں گی۔ کیوں شبانہ؟'' انہوں نے شبانہ کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

''جی میڈم! کیوں نہیں۔ اٹھیں چلیں۔ اپنی عزیز سہیلی کو گاڑی تک چھوڑ کے آئیں گی۔''

پھر میں ان کے ہمراہ باہر گاڑی تک آئی۔ ڈرائیور گاڑی کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ میں شبانہ کے گلے لگ گئی۔ آنکھیں چھلکنے کو بیتاب تھیں مگر شبانہ نے الگ ہو کر ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''خبردار! اگر میری محنت پر پانی پھیرنے کی کوشش کی تو!''

میں مسکرانے لگی۔

''یہ ہوئی نا بات۔ گڈ گرل۔''

پھر میں میڈم کے گلے لگ گئی۔ میڈم نے میری پیٹھ تھپک کر مجھے خود سے الگ کیا اور میرے ہاتھ میں ایک نوٹ پکڑا کر ہتھیلی بند کر دی۔ میں نے ہتھیلی کھول کر نوٹ دیکھا تو وہ پانچ ہزار کا ایک نیا نوٹ تھا جو ہتھیلی میں دبانے سے مڑا تڑا سا ہو گیا تھا۔

''مگر میڈم! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''زیادہ کہاں ہیں جگر۔ تمہاری موجودہ پوزیشن کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔'' پھر میڈم نے کن انکھیوں سے فیصل کی طرف دیکھا جو کافی فاصلے پر کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ غالباً وہ میرا گاڑی میں بیٹھنے کا منتظر تھا۔

''اب تو تم چودھرانی بن چکی ہو۔ ایسے نوٹ تو اب تمہارے پرس میں ہر وقت جھانکا کریں گے۔'' میڈم نے سرگوشی کی تو شبانہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔

''مانا ہم غریب لوگ ہیں چودھرانی صاحبہ! مگر اتنے بھی غریب نہیں کہ تمہاری شادی کے موقع پر تمہیں بالکل خالی ہاتھ رخصت کر

دیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بھی میری مٹھی میں پانچ ہزار کا ایک نوٹ دبا دیا۔

''مگر شبانہ......'' میں نے کچھ کہنا چاہا تو شبانہ نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''بس کچھ مت کہنا۔ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ورنہ چودھری صاحب کی بیتابی دیکھ کر لگ رہا ہے کہ پاس آ کر زبردستی بٹھا دیں گے۔'' اس نے پھر سے قہقہہ لگایا اور مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ فیصل بھی آ کر میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میڈم اور شبانہ نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ جواب میں، میں نے بھی ہاتھ ہلایا۔

گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوگئی۔ بیس پچیس منٹ بعد گاڑی ایک پر شکوہ اور فلک بوس بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔

''ہمارا گھر آ گیا۔'' فیصل نے یہ کہہ کر گویا مجھے نیچے اترنے کا اشارہ دیا۔

میں گاڑی سے باہر نکل کر اس عالیشان بلڈنگ کو دیکھنے لگی۔ جس کا فرنٹ بلو کلر کے فائبر گلاس سے تیار کیا گیا تھا۔ رات کو لائٹس کی روشنی میں وہ بلو شیشے سے بنی عمارت کسی قیمتی نگینے کی مانند جگمگا رہی تھی۔

فیصل نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم عمارت میں داخل ہو گئے۔ ڈرائیور نے ڈکی سے میرا بیگ نکالا اور اب وہ بھی ہمارے ہمراہ لفٹ میں کھڑا تھا۔ فیصل نے فلور نمبر سات پش کیا اور لفٹ برق رفتاری سے اوپر جانے لگی۔

میرا لفٹ میں چڑھنے کا پہلا تجربہ تھا۔ لفٹ کی خفیف سی لرزش نے مجھے ڈرا دیا اور میں نے فیصل کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ فیصل میری اس اضطراری حالت پر مسکرانے لگا اور اس نے دوسرا بازو میری کمر کے گرد حائل کر کے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا مگر یہ پر خطر سفر صرف دو منٹ میں ختم بھی ہو گیا۔

لفٹ رکی، دروازہ کھلا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لگائے باہر آ گیا۔ اب ہم سات نمبر دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ میں ڈرائیور کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے اس سے الگ ہوگئی۔ اس نے اپنے تھری پیس سوٹ کی جیب سے اپارٹمنٹ کی چابی نکالی اور کی ہول میں لگا کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولتے ہی گلاب کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک نتھنوں سے ٹکرائی۔ ڈرائیور نے میرا بیگ ایک طرف رکھا اور واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فیصل نے فلیٹ کا دروازہ مقفل کیا اور میری طرف پلٹا۔ اس نے مجھے بانہوں میں لے لیا تو میں اس کے بازوؤں کے مضبوط شکنجے میں کسمسانے لگی۔

''چھوڑیں مجھے! یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' میں تنک کر بولی تو وہ ہنستے ہوئے پرے ہٹ گیا۔

''دنیا کا کوئی بھی قانون اور مذہب اپنی منکوحہ کو گلے لگانے سے نہیں روکتا۔ اور تم اسے بے ہودگی کہہ رہی ہو؟'' وہ استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

''آئی ایم سوری! شاید میں کچھ غلط کہہ گئی۔ وہ اصل میں آپ کا انداز اس قدر اچانک اور جارحانہ تھا کہ......منہ سے نکل گیا۔'' میں نے بڑی آسانی سے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔

''تمہاری اتنی پیاری اور معصوم سی معذرت قبول کرتا ہوں مگر یہ بات آئندہ کے لیے بھی ذہن میں بٹھالینا کہ میرا ہر انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔اچانک اور جارحانہ۔سمجھ گئی؟''

''جی! سمجھ گئی۔'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

''چلو چھوڑو یہ باتیں! آؤ تمہیں یہ پورا فلیٹ دکھاؤں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹنے والے انداز میں کھینچا۔

☆......☆......☆

اس وقت ہم جہاں کھڑے تھے۔ وہ لیونگ روم یا لاؤنج نما حصہ تھا۔ وہاں قیمتی اور خوشنما صوفے رکھے گئے تھے۔ ان صوفوں کے درمیان ایک بڑے سائز کی سینٹرل گلاس ٹیبل رکھی گئی تھی۔ اس ٹیبل پر تین چار قیمتی ڈیکوریشن پیس رکھے تھے۔

ان شوپیس کے علاوہ ٹیبل کے وسط میں گلاب کے پھولوں کی پتیوں سے ایک بڑے سائز کا دل بنایا گیا تھا۔جس کی دلفریب مہک سے اس وقت پورا لاؤنج مہک رہا تھا۔صوفوں کے بالکل سامنے والی دیوار پر ایک دیوار گیر شوکیس بنایا گیا تھا جو مکمل شیشے سے بنایا گیا تھا۔ اس شوکیس میں کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔شوکیس سے تھوڑا نیچے ایک بڑے سائز کی ایل ای ڈی نصب تھی۔

یہ سارا جائزہ میں نے اندر داخل ہوتے ہی لے لیا تھا۔اب میں فیصل کے ساتھ چل رہی تھی بلکہ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ چلا رہا تھا۔ لاؤنج میں تین کمروں کے دروازے نکلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جن میں سے ایک کچن تھا۔جس کا اندازہ دور سے ہی ہو رہا تھا۔ وہ سب سے پہلے اسی طرف گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''یہ رہی تمہاری راجدھانی۔ دیکھ کر بتاؤ کیسی لگی؟ جانتا ہوں ایک ہاؤس وائف کی زندگی کا سب سے بڑا حصہ کچن میں ہی گزرتا ہے۔اس لیے ہر قسم کی جدید سہولت اور لوازمات سے سجایا ہے اس کو۔تم جائزہ لے لو۔اگر کوئی چیز کم دکھائی دی تو حکم دینا، خادم مہیا کردے گا۔'' آخری فقرہ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر کو قدرے جھکا کر ادا کیا تھا اور پھر میرا ریسپانس دیکھنے کے لیے میری طرف دیکھنے لگا۔ میرا چہرہ سپاٹ دیکھ کر خود ہی خفیف سا قہقہہ لگا کر اپنی خفت مٹانا چاہی۔ نجانے کیوں اس کا عامیانہ انداز کا ہنسی مذاق مجھے کوفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

کچن واقعی بہت جدید اور صاف ستھرا تھا۔ ایسے آئیڈیل کچن کا میں خواب دیکھا کرتی تھی یا پھر ٹی وی ڈراموں اور کوکنگ شوز میں بڑی حسرت سے دیکھا کرتی تھی۔ یہاں ضروریات کی ہر جدید ترین چیز موجود تھی۔ فریج، مائیکرو ویو اوون، کوکنگ رینج کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں۔

لکڑی کے بنے ہوئے کیبنٹس کی ایک طویل قطار سامنے والی دیوار پر نظر آرہی تھی جن میں یقیناً کراکری کے علاوہ روزمرہ

استعمال کی چیزیں موجود تھیں۔

''کھانے پینے کا سارا راشن کچن میں موجود ہے۔مزید کچھ چاہیے ہوگا تو صبح لسٹ بنا دینا۔''فیصل نے پھر سے قریب آ کر ہاتھ تھام لیا۔

''جی جی ضرور۔''میں نے نرمی سے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔اس نے مجھے باہر کی طرف کھینچا۔

''آؤ،تمہیں دوسرے کمرے دکھاتا ہوں۔''

کچن کے دروازے کے بالکل ساتھ نظر آنے والے دروازے کے ہینڈل پر اس نے ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔اندر اندھیرا تھا۔سوئچ بورڈ دروازے کے بالکل ساتھ ہی تھا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ جلا دی اور کمرہ روشنی میں نہا گیا۔اس کمرے میں ایک آٹو میٹک واشنگ مشین رکھی تھی اور باقی چیزوں کے گتے کے خالی ڈبے بکھرے پڑے تھے۔

''یہ ہمارا لانڈری روم ہے۔اسٹور روم بھی کہہ سکتی ہو۔''

''اوکے۔''میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔پھر اس کمرے سے ہم باہر نکل آئے۔اب اس کا رخ اگلے دروازے کی طرف تھا اور یہ یقیناً ہمارا بیڈ روم تھا۔وہ میرا ہاتھ پکڑے ادھر ہی جا رہا تھا جبکہ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی۔

اس دروازے کے ہینڈل پر اس نے ہاتھ رکھا تو پھر سے گلاب کی تیز مہک نے ہمارا استقبال کیا۔

یہ ایک کشادہ بیڈ روم تھا جسے جدید اور خوشنما فرنیچر سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔خصوصاً بیڈ بہت بڑا اور دلآویز تھا۔اس کے وسط میں بھی پھولوں کی پتیوں سے بڑے سائز کا دل بنایا گیا تھا۔اس کے علاوہ بھی پھولوں کے گلدستے کمرے میں جا بجا رکھے گئے تھے جس کی وجہ سے پورا کمرہ معطر ہو کر مہک رہا تھا۔

میں سحر زدہ سی ہو کر اس خوابناک ماحول میں کھڑی ٹکر ٹکر ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔ایسے ماحول اور ساز و سامان کا تو کبھی تصور کی دنیا سے بھی گزر نہیں ہوا تھا۔

''کیسی لگی ہماری خواب گاہ؟''اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے ساتھ بھینچا۔''ہے نا بالکل خوابوں جیسی؟''وہ ہنسا۔

''جی ہاں!''میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

''جاؤ ڈریسنگ روم میں جاؤ اور لباس چینج کر کے واپس آؤ۔ہری اپ۔''اس نے کمرے میں دکھائی دیتے ایک دروازے کی طرف مجھے دھکیلا۔

''مگر میرے کپڑے تو لاؤنج میں رکھے سوٹ کیس میں بند ہیں۔''میں بوکھلا کر بولی اور باہر کھلنے والے دروازے کی طرف سے نکلنا چاہا۔وہ دونوں بازو تان کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ڈریسنگ روم ادھر ہے۔''اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''مم۔مگر......وہ تو واش روم ہے نا؟اور میرے کپڑے......''میں ہکلائی۔

''واش روم کے دروزے سے پہلے ڈریسنگ روم ہے۔یعنی ڈریسنگ روم سے گزر کر واش روم میں جانا پڑتا ہے۔ڈریسنگ روم، جس کے اندر دیوار گیر الماریاں بنی ہوئی ہیں جو ملبوسات سے بھری پڑی ہیں۔ان میں کچھ نائیٹیز بھی خرید کر رکھی ہیں تمہارے لیے۔دیکھ لو جو اچھی لگے۔وہ پہن کر باہر آ جاؤ۔''اس نے بات مکمل کر کے بائیں آنکھ میچی تو اس خنکی میں بھی میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

''مگر......میں نے......کبھی نائٹی نہیں پہنی۔''میں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو زندگی میں پہلی بار کرنے پڑتے ہیں مائی ڈیئر۔''اس نے اپنے دونوں بازو میرے کندھوں پر ٹکا دیئے۔میں نے اس کے بازو آہستگی سے ہٹائے اور مرے مرے قدموں سے کمرے میں دکھائی دینے والے ایک منقش دروازے کی طرف بڑھی۔اسے کھولا تو یہ ایک چھوٹے سائز کا اسٹور نما کمرہ تھا۔فرش پر قالین ڈالا گیا تھا اور ایک سامنے والی بڑی دیوار پر چھت تک لکڑی کی الماریاں بنائی گئی تھیں۔

دوسری بغلی دیوار پر ایک شیشے کا شوکیس بنایا گیا تھا جس کے شیلفس پر امپورٹڈ شراب کی رنگ برنگی بوتلیں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شوکیس میں سجی بوتلیں دیکھتی رہی۔اس بار کے ساتھ ہی ایک قد آدم آئینہ دیوار کے ساتھ نصب تھا۔اس چھوٹے کمرے میں ایک اور چھوٹا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔میں وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ ایک بہت ہی اعلیٰ معیار کا باتھ روم تھا۔پھر میں باتھ روم کا طائرانہ نگاہ سے جائزہ لینے لگی۔جہاں فلیش اور واش بیسن کے علاوہ ایک باتھ ٹب بھی موجود تھا۔

ہر چیز بہت قیمتی اور چمکارے مار رہی تھی۔میں باتھ روم سے واپس بار والے حصے میں آ گئی۔الماری کا وارڈ روب والا حصہ کھولا تو اس میں فیصل کے ہینگر شدہ کپڑے لٹک رہے تھے۔میں نے یہ پٹ بند کر کے اگلے کھولے تو اس میں دس بارہ لیڈیز سوٹ لٹک رہے تھے۔سبھی بہت خوبصورت اور اسٹائلش تھے۔میں ہاتھوں سے ہینگرز کھنگالنے لگی تو ایک سائیڈ پہ تین سلیپنگ ڈریس ہینگر میں ٹنگے دکھائی دیئے۔یہ سفید، سرخ اور بلیک کلر کی بیش قیمتی اور دلکش نائیٹیز تھیں اور جنہیں پہننا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔میں چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی۔ان میں سے ایک کا انتخاب بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔تینوں کا بڑے غور سے معائنہ کر رہی تھی۔میری کوشش تھی کہ کوئی ایسی منتخب کروں جو جسم کو کم سے کم نمایاں کرے مگر یہ تینوں بہت مختصر تھیں۔دل تو چاہ رہا تھا کہ چودھری کی فرمائش ماننے سے صاف انکار کر دوں مگر پھر یہ سوچ کر ریڈ کلر کی نائٹی ہینگر سے کھینچ لی کہ اب وہ میرے لیے نامحرم نہیں ہے۔بلکہ شوہر ہے میرا اور شوہر کا ہر حکم ماننا بیوی کے فرائض میں شامل ہے۔

میں نے وہ گلابی سوٹ اتار کر نائٹی پہن لی اور سامنے لگے دیوار گیر آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو خود سے شرما گئی۔جو لباس اتارا تھا

اسے ہینگر میں لگا کر الماری میں احتیاط سے ٹانگ دیا اور خود باہر نکلنے اور خود کو اس کی نظروں کا سامنا کرنے کے لیے ہمت مجتمع کرنے لگی۔آخر چند منٹ گہری گہری سانسیں لے کر خود کو پرسکون کیا اور پھر باہر نکل آئی۔

فیصل کوٹ اور ٹائی اتار کر جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔اس کی نگاہیں اسی دروازے پر مرتکز تھیں۔ جہاں سے میں نے برآمد ہونا تھا۔ مجھے باہر نکلتا دیکھ کر وہ اشتیاق بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔اس کی نظروں کی تپش مجھے اپنے وجود پر محسوس ہو رہی تھی۔ میں وہیں رک کر اوپر پہنے اس باریک ریشمی گائن سے اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میری اس بوکھلاہٹ کو دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا اور بڑے شاعرانہ انداز میں بولا۔

”ارے گھبرایئے مت! آپ میری منکوحہ پارٹنر ہیں۔ آپ کے نشیب وفراز اور بھول بھلیوں میں ہم ایسا کھوئے کہ آپ کی ذہنی تسلی کے نکاح کے دو بول تک پڑھا لئے۔“

اس کی باتیں سن کر میں نے دل کڑا کیا اور اپنے تئیں خود اعتمادی سے تن کر چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر رک گئی اور اس کوشش میں جیسے سات سمندر پار کر کے آنا پڑا۔

”گڈ گرل! ادھر میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا جو میں نے تھام لیا اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”تم بہت خوبصورت جسم کی مالک ہو۔ میری سوچ سے بھی زیادہ۔“ اس نے ٹکراتی سانس کے ساتھ سرگوشی کی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی اس کی بیباک نگاہوں کا سامنا کرنے کی۔ اس لیے اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کر رہی تھی۔

”اچھا یہ شرمانا اب بند کرو اور کچن سے دو گلاس اور برف لے آؤ۔“ اس کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ اب تحکمانہ رنگ غالب آ گیا تھا۔ میں جھجکتی ہوئی اٹھی۔ کچن سے دو گلاس اور آئس کیوبز ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ گلاس اس کے سامنے رکھی چھوٹی تپائی پر رکھے تو اس نے اگلا حکم صادر کیا۔

”اندر وارڈروب کے پاس بنا ہوا بار تو تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا؟ اس میں سے ایک شیمپئن کی بوتل اٹھا لاؤ۔ اور میرے لیے جام تیار کرو۔“

اس کا یہ اوٹ پٹانگ حکم سن کر میں شاکڈ رہ گئی۔

”جج......ج......جی؟“ میں نے ہکلا کر پوچھا۔

”سمجھ نہیں آئی میری بات کی؟“ اب کی بار اس کی آواز کسی زہریلے سانپ کی پھنکار سے مشابہہ تھی۔ مجھے اپنے جسم میں خوف کی ایک لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ میں لرزیدہ قدموں سے اس دروازے کی طرف چلنے لگی جس کی اوٹ میں وہ خوش رنگ بار سجایا گیا تھا۔

☆......☆......☆

میں بار کے سامنے پہنچی اور ان مختلف کلرز اور ہیت کی بوتلوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ ان پر لکھے گئے نام پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک سبز رنگ کی نسبتاً بڑے سائز کی بوتل کو غور سے دیکھا تو اس پر انگریزی میں لفظ "شیمپئن" لکھا نظر آ گیا۔ شوکیس کھولا اور وہ بوتل باہر نکال لی۔ جا کر فیصل کے سامنے کی تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرا کر داد دی۔

"گڈ گرل! چلو اسے کھولو اور دونوں گلاس بھر دو۔"

میں متذبذب انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے کھولنی نہیں آتی۔"

اس نے چند لمحے میری طرف سنجیدگی سے دیکھا پھر بوتل میرے ہاتھ سے پکڑ کر اس کا ڈھکن کھولا اور پھر سے میری طرف بڑھا دی۔ بوتل کے منہ سے شیمپئن جھاگ کی صورت میں ابل ابل کر باہر نکل رہی تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ایک گلاس بھرا اور بوتل تپائی پر رکھ کے گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اوں ہوں......" اس نے نفی میں سر پھیرا۔ "دوسرا جام بھی تیار کرو۔ پھر دونوں جام سے جام ٹکرائیں گے۔ اور مل کر مے نوشی کا لطف اٹھائیں گے۔"

"مگر میں شراب نہیں پیتی۔"

"جانتا ہوں...... کہ تم شراب نہیں پیتی۔ مگر تھوڑی دیر پہلے ہی تو تمہیں نصیحت کی تھی کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو زندگی میں پہلی بار کرنے پڑتے ہیں۔" وہ مجھے نرم لہجے میں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سوری! یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ میں شراب نہیں پیوں گی۔" میں اٹل لہجے میں بولی۔

وہ حیران نظروں سے تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ یوں جیسے اسے مجھ سے اس ہٹ دھرمی کی امید نہ ہو۔ پھر تھوڑی دیر کچھ سوچنے کی اداکاری کی اور بولا۔

"ہمم! تو تم میرا ساتھ دینے کے لیے بھی شراب نہیں پیئو گی؟"

"نہیں۔" میرے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی در آئی۔

اس کا رویہ اچانک ہی مصالحت آمیز ہو گیا اور اس نے گویا ہتھیار پھینکتے ہوئے گلاس تپائی سے اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ اسے اس طرح پانی کی طرح شراب پیتا دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ بیشک میں نے حقیقی زندگی میں کبھی کسی کو مے نوشی کرتے نہیں دیکھا تھا مگر فلموں وغیرہ میں یہ ہی دیکھا تھا کہ شرابی گھونٹ گھونٹ کر کے اس آتشیں سیال کو حلق سے اتارتے ہیں۔ اس نے خالی گلاس تپائی پر رکھا اور مجھے دوبارہ سے بھرنے کا حکم دیا۔

میں نے کسی روبوٹ کی طرح اس کے حکم کی بجا آوری کی۔ وہ دوسرا گلاس بھی اسی طرح چڑھا گیا اور پھر تیسرا جام تیار کرنے کا حکم دیا۔ میں اب تیسرا گلاس بھرتے ہوئے جھجک کا شکار تھی۔

''سنا نہیں تم نے؟'' وہ پھنکارا۔ اس کی آنکھوں میں خمار کی وجہ سے سرخ ڈورے دکھائی دینے لگے تھے اور آواز بھی قدرے بدل چکی تھی۔

''بس کریں پلیز! آپ پہلے ہی کافی پی چکے ہیں۔'' میں نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

''میری ایک بات یاد رکھنا۔'' اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی وارننگ دینے والے انداز میں کھڑی کی۔ ''کبھی بھی میری بیوی بننے کی کوشش مت کرنا۔ کیونکہ میرے پاس ایک بیوی پہلے سے موجود ہے۔ جو میرے تین بچوں کی ماں بھی ہے۔ مجھے مزید بیوی نہیں چاہیے۔ انڈرسٹینڈ؟'' اس نے تنبیہی انداز میں پوچھا۔

میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ احساس ذلت سے آنکھیں بھر گئیں اور بوتل اٹھا کر تیسرا گلاس بھرنے لگی۔ گلاس اسے تھما کر خود واش روم میں چلی گئی۔ واش بیسن کے سامنے کھڑی آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ بہہ جانے والے کاجل کو دیکھنے لگی۔ جب رو روکر دل کی بھڑاس کافی حد تک نکل گئی تو چہرے کو صابن سے مل مل کر دھونے لگی۔ ٹاول سے چہرہ اور ہاتھ خشک کر رہی تھی۔ جب اس کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

وہ مجھے پکار رہا تھا۔ میں باہر آ گئی۔ اس نے تیسرا گلاس ابھی بھی ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ جس سے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے شراب حلق سے اتار رہا تھا۔

''مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی۔ میرے پاس بیٹھو میری جان۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیڈ پر بٹھا لیا۔

''میری زندگی میں دو چیزوں کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ نمبر ایک شراب اور نمبر دو شباب۔'' وہ ہنسا اور پھر بولا۔ ''یوں سمجھ لو کہ ان دونوں کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔''

فیصل کے ساتھ وہ رات گزارنا، زندگی کے تلخ تجربوں میں ایک اور تجربے کا اضافہ ثابت ہوئی۔ وہ مجھے اپنے آہنی حصار میں لے کر تمام تر مزاحمت کے باوجود اپنی ضد پوری کرتے ہوئے کڑوا سیال میرے حلق میں اتار چکا تھا۔ اس نے شراب پی کر ایک درندے کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے منہ سے گالیوں اور مغلظات کا ایک سیلاب بہہ نکلا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو سر بھاری اور جسم جیسے کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس کی رات والی بدسلوکی یاد آئی اور ساتھ میں وہ غلیظ ترین گالیاں تو دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اپنے شکستہ وجود اور ریزہ ریزہ سوچ کو سمیٹا اور بیڈ سے نیچے اتر آئی۔

ایک اچٹتی نگاہ اس کم ظرف پر ڈالی جو سوتا ہوا بہت معصوم اور بے ضرر سا لگ رہا تھا۔ وارڈروب سے ایک سادہ سا کاٹن کا سوٹ کھینچا

اور ہاتھ لینے کے لیے باتھ روم کا رخ کیا۔ واش بیسن کے اوپر لگے کنگ سائز کے آئینے میں اپنے سراپے پر نظر پڑی تو دل کٹ کر رہ گیا۔

جسم اور چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑ چکے تھے۔ نچلا ہونٹ ایک جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ آنکھیں پھر سے ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح برسنے لگیں۔ شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑی ہوئی تو اس کے پانی کے ساتھ آنکھوں سے نکلنے والا نمکین پانی بھی بہنے لگا۔

''واہ مہر بانو! زندگی کی بساط پر ایک اور چال چلنے کی کوشش کی تم نے مگر یہاں بھی شکست ہی تمہارا مقدر ٹھہری۔ تم صرف ہارنے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہو۔ جیت تمہارے مقدر میں نہیں۔''

کتنی ہی دیر تک روتی رہی اور نہاتی رہی۔ جب تھک گئی تو ہاتھ بڑھا کر شاور بند کر دیا۔

☆......☆......☆

نہا کر وہ کاٹن کا سوٹ پہنا اور واش روم سے باہر آ گئی۔ فیصل ابھی تک بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔ اس درندے کی موجودگی میرے ذہنی تناؤ میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں دبے پاؤں چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ عقب سے دروازہ بند کر کے چند گہری سانسیں لے کر خود کو متعدل کرنے کی کوشش کی اور پھر کچن کا رخ کیا۔

چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ فریج کھولا تو اس میں انواع واقسام کا فروٹ بھرا ہونے کے علاوہ دودھ کے ڈبے بھی قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ میں نے ایک دودھ کا ڈبہ نکالا اور شیلف پر چولہے کے پاس رکھ لیا۔ ٹی پین میں تھوڑا پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ چائے تیار کر کے ایک مگ میں انڈیلی اور لاؤنج میں رکھے صوفے پر آ بیٹھی۔

چائے کا مگ سامنے میز پر رکھ دیا اور اس میں سے نکلنے والی بھاپ کو غور سے دیکھنے لگی۔ اور پھر زندگی کے اس نئے رخ پر غور کرنے لگی۔ جو بہت مکروہ اور ناقابل برداشت ثابت ہوا تھا۔ اپنی اس مختصر سی حیاتی میں مردوں کے کتنے روپ میں دیکھ چکی تھی۔

پہلا روپ سیٹھ ناصر کا، جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی صرف اپنی کنجوسی کے باعث فقیرانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ زندگی کی آسائشیں اور راحتیں اپنے اوپر اس نے حرام کر رکھی تھیں۔ دولت کو تجوری میں بند کر کے اس کی پرستش کرنے والا اور اپنی فیملی کو چھوٹی چھوٹی خواہشات کیلئے ترسانے والا ناعاقبت اندیش سیٹھ ناصر۔

پھر بابر ایک خوشگوار جھونکے کی طرح آیا۔ جس کی محبت میرے لیے ایک انوکھا اور روح افزا تجربہ ثابت ہوئی۔ اس نے تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، مگر زندگی بھر کی خوشیاں میری جھولی میں ڈال دیں۔ مگر وہاں بھی میری بدنصیبی ہی آڑے آئی۔ اسے اولاد چاہیے تھی جبکہ میں اسے یہ خوشی کبھی بھی نہیں دے سکتی تھی۔ آخر کب تک وہ بھی میرے ناکارہ وجود کو برداشت کرتا۔

جیسے ہی اس کی زندگی میں کوئی اور آئی۔ اس نے ایک ایسے جرم کی پاداش میں مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ جو میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ بس انجانے میں مجھ سے سرزد ہو گیا تھا۔ بابر کی یادوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ بابر کی محبت، اس کے پیار کرنے کا انداز۔

وہ ایک نرم مزاج انسان تھا مگر میری بدقسمتی نے اسے بھی نرم نہ رہنے دیا۔ پھر سر جھٹک کر ماضی سے پیچھا چھڑانا چاہا اور چائے کا مگ اٹھالیا۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔ اس وقت یہ چائے میری جسمانی اور روحانی تکلیفوں میں مرہم کا کام دے رہی تھی۔

چائے پیتے ہوئے بھی اپنی آئندہ زندگی کے متعلق سوچتی رہی۔ فیصل کے ناروا سلوک نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیسے چھٹکارہ حاصل کروں کیونکہ اس کی قربت کا تصور بھی مجھے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی مگ میز پر رکھا ہی تھا کہ وہ کمرے سے باہر آتا دکھائی دیا۔

وہ ابھی تک شب خوابی کے گاؤن میں ملبوس تھا۔ مجھے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر وہ ادھر ہی چلا آیا۔ میرے پاس بیٹھ گیا اور ہاتھ پکڑنا چاہا۔ میں تیزی سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

''ناراض ہو؟'' اس نے بے تکا سا سوال کیا۔ میں خاموش بیٹھی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو دیکھتی رہی۔

''جانتا ہوں، تم مجھ سے بہت ناراض ہو۔ رات کو میرا رویہ شاید بہت خراب تھا تمہارے ساتھ مگر کیا کروں۔ یہ کم بخت مجھے انسان رہنے ہی کہاں دیتی ہے۔ شاید اسی لیے اسے ام الخبائث کا لقب دیا گیا ہے'' وہ تاسف سے سر جھکائے بول رہا تھا۔ یوں جیسے اسے اپنی کی گئی زیادتی پر ازحد افسوس ہو رہا ہو۔

''ہونہہ! ڈرامے باز کہیں کا۔'' نفرت کی ایک تند لہر میرے دماغ میں اٹھی۔

''سوری بانو! مجھے واقعی بہت افسوس ہو رہا ہے تمہاری یہ ابتر حالت دیکھ کر۔'' اس نے اپنی آواز میں حتی المقدور مسکینی بھرنے کی کوشش کی۔

''بند کرو اپنا یہ ڈرامہ......'' میرے صبر کی حد ختم ہوگئی تو چلا اٹھی۔ ''تم انسان نہیں ایک وحشی درندے ہو۔ دولت کے بل بوتے پر عورتوں کو خریدتے ہو اور پھر انہیں اپنی ہوس اور درندگی کا نشانہ بنانے کے لیے مشق ستم ڈھاتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ایک پل بھی مزید نہیں رہ سکتی۔ آزاد کر دو مجھے۔'' چلاتے چلاتے میری آواز رندھ گئی۔ گلے کی رگیں ابھر آئیں اور میں دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ وہ اپنی ساری ایکٹنگ بھول کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ اسے شاید مجھ سے اس قدر جارحانہ رویے کی امید نہ تھی۔ چند لمحے مجھے بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اس کے اگلے قدم نے مجھے شاکڈ کر دیا۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قدموں میں آن بیٹھا۔

''مجھے چھوڑ کر مت جانا بانو! میں بالکل تنہا رہ جاؤں گا۔ پلیز میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' اس نے دونوں جوڑ کر میرے سامنے کر دیئے۔

میں جو عجیب وغریب اور مضحکہ خیز صورت حال کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ اس کے اس طرح اچانک پینترا بدلنے پر دنگ رہ گئی۔ اپنا رونا دھونا بھول کر ہونق چہرہ لیے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ جو میرے قدموں میں بیٹھا مجھ سے میری رفاقت کی بھیک مانگ رہا تھا۔

عجیب آدمی ہے۔گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔اب تو مجھے سچ میں یقین ہو چلا تھا کہ یہ ایک اعلیٰ درجے کا ایکٹر تھا۔میں اس کی اداکاری کو دل ہی دل میں داد دینے لگی۔میری خاموشی کو وہ میری رضا مندی سمجھ رہا تھا جبکہ میں اس ڈرامائی صورت حال سے نمٹنے کے لیے، ایک لائحہ عمل ذہن میں ترتیب دے رہی تھی۔آخر میں نے بھی اس کی مکاری کا جواب مکاری کے ساتھ ہی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ویسے بھی میرے واپس لوٹنے کی ہر راہ مسدود ہو چکی تھی۔میں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے الگ کیے اور بولی۔

''پلیز ایسا مت کہیں اور اوپر بیٹھ جائیں۔اگر آپ وعدہ کریں کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے تو میں بھی وعدہ کرتی ہوں۔آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔''

''سچ کہہ رہی ہو نا؟''اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔

''جی ہاں!اگر آپ سدھر جائیں تو میں بھلا کیوں آپ کو چھوڑ کے جاؤں گی۔''میں نے نرم لہجے میں جواب دیا تو وہ مسکرانے لگا۔اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ مچھلی اتنی جلدی جال میں آ گئی۔وہ فٹ سے زمین سے اٹھا اور پھر سے میرے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا۔

''بانو!تم سچ مچ بہت اچھی ہو۔تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟''وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں کر دیا!مگر اس کے بعد کبھی نہیں کروں گی۔''میں نے دوٹوک انداز میں کہا تو وہ فوراً بولا۔

''اوکے!مجھے منظور ہے۔''

پھر اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور کسی کا نمبر ملا کر ناشتہ لانے کا آرڈر دینے لگا جبکہ میں پرسوچ نگاہوں سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔

☆......☆......☆

ناشتہ آنے تک وہ نہا دھو کر سفید کاٹن کا سوٹ زیب تن کیے تیار بیٹھا تھا۔ناشتہ لے کر وہی کل والا ڈرائیور اوپر آیا۔

''بانو!شکور کے ہاتھ سے ناشتے کی چیزیں پکڑو اور انہیں کچن میں لے جا کر برتنوں میں ڈال کر لے آؤ۔بڑی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔''فیصل نے مجھے کہا۔میں اٹھی،شکور کے ہاتھ سے شاپرز پکڑے جن سے کھانے کی چیزوں کی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔میں شاپرز پکڑ کے کچن کی جانب مڑ گئی جبکہ شکور پھر سے نیچے چلا گیا۔چند منٹوں کے اندر اندر میں نے وہ تمام لوازمات لاؤنج میں رکھے ٹیبل پر سجا دیئے۔ان میں حلوہ پوری اور پائے نان شامل تھے۔

ناشتہ کرنے کے دوران بھی چودھری فیصل نرم لہجے میں چھوٹی موٹی باتیں کرتا رہا۔بلکہ سمجھاتا رہا۔اس کا رویہ رات والے رویے سے یکسر مختلف تھا۔اس کا دھیما لہجہ اور مہربان چہرہ دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بندہ کبھی ایک خطرناک درندے کا روپ بھی دھار سکتا ہے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے اس کا پل پل روپ بدلنا اچنبھے میں مبتلا کر رہا تھا۔اور نجانے کیوں مجھے اسکے وعدوں اور تسلیوں پر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا۔ نیا رشتہ استوار ہوتے ہی ایک بدگمانی اور بداعتمادی کی دیوار سی کھڑی ہوگئی تھی ہمارے درمیان۔

''شکور گاڑی کے ساتھ ہمیشہ نیچے موجود رہا کرے گا۔تمہیں جہاں بھی جانا ہو یا کوئی بھی چیز منگوانی ہو،تم شکور کو فون کر کے اوپر بلوا لیا کرنا۔یوں سمجھو یہ سارا دن تمہیں دستیاب ہوگا۔البتہ رات کو میرے آنے کے بعد اس کی ڈیوٹی ختم ہو جایا کرے گی۔اس کے بعد یہ خادم تمہاری ہر قسم کی خدمت کے لیے تمہیں تیار ملے گا۔'' ناشتے کے ساتھ ساتھ اس کی ہدایات متواتر جاری رہیں۔

میں کوئی بھی جواب دیئے بنا ہی اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ناشتے کے بعد اس نے چائے کی فرمائش کی۔میں نے پھر سے اپنا کپ بھی ساتھ تیار کر لیا۔چائے کے ساتھ بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

''مجھ سے پہلے کتنی آئیں آپ کی زندگی میں؟'' میں نے چائے کا گھونٹ بھر کے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''تم پانچویں ہو......فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نکاح نہیں پڑھایا۔نکاح کرنے میں سو قباحتیں ہیں۔'' وہ ایک ہاتھ کی انگلی سے سر کھجاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''اچھا جی! تو پھر میری دفعہ کیسے مان گئے؟ انکار کر دیتے۔آپ کے پاس عورتوں کی کیا کمی تھی بھلا؟'' میرے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوگیا۔

''ہمم! بات تو تمہاری بھی کسی حد تک صحیح ہے۔پیسہ پاس ہو تو عورتوں کی بھلا کیا کمی۔مگر تم سے نکاح کرنے کے پیچھے بھی میری ایک غرض چھپی بیٹھی ہے۔میں کوئی بھی کام بلاوجہ نہیں کرتا۔'' وہ مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

مجھے اس کی یہ بات الجھن میں مبتلا کر گئی۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسی کون سی غرض تھی جس نے آپ کو مجھ سے نکاح کرنے پر مجبور کر دیا۔''

''بتا دوں گا۔اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' وہ مسکرایا اور خالی کپ میز پر رکھ کے کھڑا ہوگیا۔

''میں فیکٹری جا رہا ہوں۔گاڑی اور ڈرائیور تمہارے پاس ہوں گے۔جو بھی منگوانا چاہو منگوا سکتی ہو۔''

پھر اسے جیسے کچھ یاد آگیا۔

''اوہ ہاں! اپنے بے صبرے پن میں تمہیں منہ دکھائی کا تحفہ دینا بھی یاد نہیں رہا۔''

وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اندر بیڈ روم میں گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں موبائل فون کا ڈبہ تھا۔اس نے ڈبہ کھولا اور اس میں سے معروف انٹرنیشنل کمپنی کا مہنگا ترین فون نکالا۔اسے آن کیا اور میرے پرانے فون سے سم اور کونٹیکٹ نمبرز نکال کر نئے فون میں سیو کر دیئے۔اس نے نیا سیٹ میری طرف بڑھایا۔

''یہ رہا تمہاری منہ دکھائی کا تحفہ۔اس میں شکور کا نمبر بھی سیو کر دیا ہے۔ضرورت پڑنے پر اسے بلا جھجک طلب کر سکتی ہو۔وہ ہمیشہ تمہیں مستعد ملے گا۔''

میں نے کسی بھی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا اور خاموشی سے فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''شکریہ۔''میں نے مدھم آواز میں وضعداری کا تقاضا نبھایا۔

''او کے۔شام کو ملاقات ہوگی۔''

اس نے ایک اسمارٹ سا بریف کیس اٹھایا اور الوداعی کلمات کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔میں دروازے تک اسے رخصت کر کے واپس آئی اور اسی صوفے پر پھر سے ڈھیر ہوگئی۔کافی دیر تک اس تازہ ترین صورت حال پر غور کرتی رہی۔میں بچی نہیں تھی جو یہ سمجھ نہ پاتی کہ شکور میری نگرانی اور نقل وحرکت کا جائزہ لینے کے لیے مامور کیا گیا ہے۔آخر ایک خیال ذہن میں آیا اور میڈم کا سیل نمبر ملانے لگی۔

نئے فون پر مشکل پیش آرہی تھی۔حالانکہ فیصل اس کے اہم اہم فنکشن سمجھا کر گیا تھا مگر مجھے پھر بھی اس کا استعمال مشکل لگ رہا تھا۔میڈم کی طرف بیل جا رہی تھی۔تیسری چوتھی بیل پر میڈم نے کال ریسیو کر لی۔

''جی میری جان! کہو کیسی ہو؟''میڈم نے کھنک دار لہجے میں میری خیریت دریافت کی۔میرے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔

''کیا بتاؤں میڈم! سچ پوچھیں تو دنیا کے ہر مرد سے اعتبار اٹھ گیا۔''

میرا اسلگتا ہوا لہجہ سن کر میڈم چونک گئی۔

''کیوں کیا ہوا؟''میڈم کے لہجے کی شوخی کافور ہو چکی تھی۔

''یہ کم بخت بھی گوشت نوچنے والا بھیڑیا ہی نکلا۔''میں زہرخند لہجے میں بولی۔

''اوہ!''میڈم کی تاسف بھری آواز ابھری۔''مگر وہ تو تمہیں بڑے چاؤ سے بیاہ کر لے گیا تھا۔''

''ہاں جی! بچہ بھی جب کوئی کھلونا خریدتا ہے تو بڑے چاؤ سے رقم خرچ کر کے خریدتا ہے۔اب آگے اس کھیلنے والے کی مرضی ہوتی ہے کہ اپنے کھلونے کے ساتھ کیسے کھیلے۔کچھ بچے کھلونے کے ساتھ بڑی احتیاط سے کھیل کر اسے سنبھال کر رکھ لیتے ہیں کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے جبکہ کچھ بگڑے ہوئے بچے اپنے کھلونے کو کھیلنے کے دوران توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ٹوٹ بھی گیا تو پھر سے رقم خرچ کر کے نیا خرید لیں گے۔''بات کرتے کرتے میری آواز میں نمی گھل گئی۔چند لمحوں تک تو دوسری طرف گہری خاموشی چھائی رہی۔میڈم کو یقیناً فیصل سے اس قسم کے رویے کی توقع نہ تھی۔

آخر میڈم بولی تو اس کا لہجہ اور آواز یکسر بدلی ہوئی تھی۔

''تم نے اس سے بات کی؟''

''جی کی......''میں نے مختصر جواب دیا۔

''کیا کہتا ہے؟''

''اس نے اپنے ناروا سلوک کے لیے معافی مانگی اور آئندہ کے لیے بھی باز رہنے کا وعدہ کیا مگر مجھے اس کے کسی وعدے پر یقین نہیں۔''میں دل میں دبا اندیشہ زبان پر لے آئی۔

''ہم! ابھی دیکھو کہ کیا کرتا ہے۔ اگر اس نے اپنے وعدے کی پاسداری نہ کی تو کوئی حل سوچ لیں گے۔'' میڈم کا لہجہ گہری سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

''تو کیا پھر سے طلاق؟ نہیں۔ میں تھک گئی ننگے پاؤں کانٹوں پہ چلتے چلتے۔ اب کسی شجر سایہ دار کے نیچے بیٹھ کر سستانا چاہتی ہوں۔''میں سسکنے لگی۔

''اس کہانی کا اینڈ طلاق پر نہیں ہوگا۔ اب کی بار کوئی اور حل سوچنا ہوگا۔''میڈم کے لہجے میں چھپی سفاکی محسوس کر کے میں چونک گئی۔

''آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں میڈم؟''میرے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔ آج کی رات وہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے؟ اس کی رپورٹ مجھے کل تم دو گی۔ اس کے بعد بتاؤں گی کہ میرا اگلا قدم کیا ہوگا۔''

الوداعی کلمات کے بعد میں نے کال ڈراپ کر دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے کافی دیر تک میڈم کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ یہ تو طے تھا کہ میڈم کے تعلقات بہت بڑے بڑے آدمیوں سے تھے۔ جن میں سیاستدانوں سے لے کر پولیس کے اعلیٰ افسران بھی شامل تھے مگر چودھری فیصل بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اس کی پہنچ بھی اوپر تک تھی۔ خود بھی ایم پی اے تھا اور دیگر وزرا سے بھی اچھے روابط تھے۔

آخر سوچ کے گھوڑے دوڑتے دوڑتے تھک گئے تو کندھے اچکا کر کھڑی ہوگئی۔ لاؤنج میں رکھا اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اسے بیڈ روم میں لے گئی۔ اس میں سے کپڑے اور دیگر چیزیں نکال نکال کر الماریوں میں رکھنے لگی۔ کام مکمل کر کے اس حصے کے پٹ بند کر کے فیصل کے حصے والے پٹ کھول کر بلا مقصد سر اندر گھسائے اس کے کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔

کپڑوں کے ہینگرز دائیں بائیں کر رہی تھی جب اچانک ان ٹنگے ہوئے کپڑوں کے پیچھے کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کپڑے ہٹائے تو ان کی اوٹ میں الماری کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک رائفل کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ گولیوں سے بھرا ہوا بیگ بھی رکھا ہوا تھا۔

میں نے وہ بھاری بھرکم رائفل اٹھا لی۔ رائفل ہاتھ میں لیتے ہی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سنسناتی لہر اٹھی۔ چند لمحے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر احتیاط سے اسے واپس رکھ دیا اور الماری بند کر کے ڈریسنگ روم سے باہر آ گئی۔ پھر پورے گھر میں بلا مقصد چکرانے لگی۔

آخر لاؤنج میں بنے ریک سے ایک ناول کھینچا اور وہیں بیٹھ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی مگر اس نے بھی بوریت دور کرنے کی بجائے مزید بڑھا دی۔ آخر اسے بند کر کے پھر سے بیڈروم کا رخ کیا۔ بیڈ پر بکھرے مرجھائے پھولوں کو اکٹھا کر کے ڈسٹ بن میں پھینکا اور بیڈ کی چادر جھاڑ کر پھر سے بچھائی اور خود اس پر دراز ہوگئی۔ تھوڑی دیر بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆......☆......☆

آنکھ فون کی رنگ ٹون کی آواز سے کھلی، نیم غنودگی کے عالم میں پاس پڑا ہوا فون اٹھا کر دیکھا تو سکرین پر فیصل کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا۔

''ہیلو۔'' نیند میں ڈوبی آواز سن کر اس نے پہلا سوال یہی کیا۔

''کیا سو رہی تھی؟''

''ہاں۔''

''پھر تو تمہارے آرام میں مخل ہونے کا جرم کر بیٹھا۔'' اس نے حسب عادت ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''میں نے فون اس لیے کیا تھا کہ سات بجے تک آ جاؤں گا۔ میرے آنے تک تم تیار رہنا۔ کھانا کہیں باہر کھانے چلیں گے۔''

''اوکے!'' میں نے پھر سے مختصر جواب دیا۔

''چلو تم آرام کرو۔ شام کو ملاقات ہوگی۔'' اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ میں نے بے دلی سے فون پرے پھینک دیا اور پھر سے آنکھیں موند لیں۔ دوبارہ نیند تو نہ آئی مگر وجود پر ایک کسلمندی سی ضرور طاری ہوگئی۔ اٹھ کر واش روم میں گئی۔ ہاتھ منہ دھو کر بالوں میں کنگھی کی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

ہلکی پھلکی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ فریج کھولا، کچھ فروٹ پلیٹ میں رکھا اور لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ ٹیبل پر رکھا ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی آن کر لیا۔ اپنی پسند کے چینل پر ہاتھ روک دیا۔ اب ٹی وی کے ساتھ ساتھ فروٹ کاٹ کر کھانے لگی۔

چھ بجے تک ٹی وی دیکھتی رہی۔ پھر ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ اور کمرے کا رخ کیا۔ الماری کھول کر آج پہننے کے لیے سوٹ کا انتخاب کرنے لگی۔ آخر ایک ہلکے پیلے رنگ کا ایمبرائڈری والا سوٹ منتخب کر لیا اور نہانے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔ سات بجنے میں ابھی پانچ منٹ رہتے تھے جب فیصل نے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔

میں اس وقت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ کر رہی تھی۔ جب وہ میرے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ اب وہ شیشے میں سے مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتا پا کر جھینپ گئی اور ہیئر برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگی۔ اس نے اپنے

دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کے ہلکا سا دبایا اور بولا۔

''بہت حسین لگ رہی ہو۔''

میں اس کی گرفت سے نکل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ وہ حیران سا کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔

''آپ کے لیے چائے بنا کر لاؤں؟''

میرا عجلت بھرا انداز اسے پسند آیا۔ مسکرا کر بولا۔

''نہیں، آج فیکٹری میں بھی تین کپ پی چکا ہوں۔ اب مزید طلب نہیں۔ میں بس پانچ منٹ میں ریڈی ہو کر آتا ہوں۔ پھر نکلتے ہیں۔ اوکے؟''

''اوکے! میں باہر لاؤنج میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتی ہوں۔''

میں باہر لاؤنج میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ فریش چہرہ لیے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے صرف چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر بال سنوار لیے تھے۔ کپڑے بدلنے کا تردد نہیں کیا تھا۔ گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ میں اس کے ہمراہ لفٹ میں داخل ہوئی تو اس دفعہ پوری طرح پر اعتماد تھی۔

لفٹ کی خفیف لرزش نے اس دفعہ مجھے بالکل بھی خوفزدہ نہ کیا۔ گراؤنڈ فلور پر لفٹ سے باہر نکلے تو گیٹ پر بیٹھے چوکیدار نے فیصل کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بھی وہ پوری ترنگ میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک معروف فلمی گانے کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ اس کا اتنا خوشگوار موڈ دیکھ کر مجھے بھی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا گیا اور پھر ایک آئس پارلر سے آئس کریم بھی کھائی گئی۔ رات گئے لاہور کی سڑکوں پر مٹر گشتی کر کے واپس گھر لوٹے تو کل رات کا تلخ تجربہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ دل میں ایک خوف سا سرایت کر گیا۔ دونوں بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ میں نے وہ فینسی سوٹ اتار کر دوبارہ وہی کاٹن کا سوٹ پہن لیا جو صبح سے پہنا ہوا تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ فیصل شاید پھر سے شب خوابی کا لباس پہننے کی ضد کرے گا۔ میں ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو وہ بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ہاتھوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں پاس جا کر بولی۔

''چائے پیئیں گے یا دودھ؟''

وہ چند لمحے سوچ کر بولا۔

''جتنا بھاری بھرکم کھانا نوش کر کے آئے ہیں۔ میرے خیال میں چائے ہی بہتر رہے گی۔ البتہ پتی تھوڑی کم ہی رکھنا۔''

''جی بہتر!'' میں نے سعادت مندی سے اثبات میں ہلایا اور کچن کی طرف آتے ہوئے بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ابھی تک تو تہذیب کا

لبادہ نہیں اترا۔شاید اپنی کہی بات پر کاربند ہو کر دکھا ہی دے۔چائے بنا کر واپس آئی تو وہ بدستور لیٹا ہوا تھا۔اس کی آنکھوں کے پپوٹے شاید نیند سے بھاری ہو رہے تھے۔میں ٹرے اٹھائے سامنے آئی تو وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔میں نے ٹرے اس کی آگے رکھی اور خود پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آج ہم صرف باتیں کریں گے۔کروگی نا مجھ سے باتیں؟''اس نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''جی کروں گی۔''میں نے آہستگی سے جواب دیا اور اپنا کپ اٹھالیا۔چند منٹ خاموشی حائل رہی۔فیصل نے چند گھونٹ چائے حلق میں اتاری اور بولا۔

''بانو!تم ایک بہت اچھی عورت ہو۔یعنی جیسا ایک مشرقی عورت کو ہونا چاہیے۔وفا شعار اور صبر و تحمل کی مورت۔مگر افسوس کہ تمہاری زندگی میں جتنے بھی مرد آئے سب ایک نمبر کے چغد اور کمینے۔''وہ حسب عادت اپنی بات پہ خود ہی ہنسنے لگا۔

میری سنجیدگی اور خاموشی برقرار رہی۔

''کوئی بات کرو یار!میں تم سے آج بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''اس نے بے تکلفی سے کہا۔

''آپ کی بیگم کو پتا ہے ہماری اس شادی کا؟''میں نے سوال کیا۔بیگم کے ذکر پر اس نے منہ ایسا بنالیا جیسے اچانک کوئی کڑوی گولی منہ میں گھل گئی ہو۔

''بتایا تو نہیں اسے۔مگر اسے جلدی ہی پتا چل جانا ہے۔کم بخت کی انٹیلی جنس سروس بہت تیز ہے۔''

اس کے جواب نے مجھے مسکرانے پر مجبور کردیا۔

''کیا ذرائع ہیں ان کے،آپ کی جاسوسی کے حوالے سے؟''

''سب سے بڑا ذریعہ تو اس کا بیٹا ہے۔ماں کا چمچہ۔ماں کے اشاروں پر ناچتا ہے۔جو حکم دیتی ہے بجا آوری میں بالکل بھی وقت نہیں لگاتا۔''

''آپ کا بیٹا اتنا بڑا ہے کیا؟کہ جاسوسی کے قابل ہو گیا؟''میں یہ بات سن کر بہت حیران ہوئی۔

''ہاں ہے تو سترہ اٹھارہ کا مگر اٹھان اور قد سے بیس بائیس کا لگتا ہے۔''اس نے ناگواری سے جواب دیا۔

''مگر آپ کو دیکھ کر یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا کہ آپ کا بیٹا بھی جوان ہو چکا ہے۔''میرے لہجے میں حیرانی ہنوز برقرار تھی۔

میری اس بات کو اس نے اپنی تعریف سمجھا اور مسکرانے لگا۔پھر بولا

''جب انیس بیس سال کی عمر میں شادی ہو جائے تو پہلی عمر کی اولاد تو بہن بھائی ہی لگے گی نا۔''اس نے خالی کپ ٹرے میں رکھ کے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

''جی یہ تو صحیح کہا آپ نے۔''میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو اس کا چہرہ چمکنے لگا۔

''کتنے بچے ہیں آپ کے؟'' مجھے اب اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

''تین۔دو بیٹے اور ایک بیٹی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''دوسرے دونوں بچے کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے ان کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟''

''دلاور سے چھوٹا سجاول ہے۔ بہت پیارا بچہ ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ سجاول سے چھوٹی رانیہ ہے۔ میری شہزادی۔ میں ہمیشہ اسے رانی کہہ کر پکارتا ہوں۔'' چھوٹے بچوں سے اس کی والہانہ محبت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''ہمم! یعنی آپ کو شکایت صرف دلاور سے ہے۔''

''اس سے بھی نہ ہوتی اگر وہ ماں کا پٹھو نہ ہوتا اور نہ ہی اس کی خاطر میری جاسوسی کرتا تو۔''

''آپ کی بیوی کیسی ہے؟ کیا بہت خوبصورت ہے؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! بہت خوبصورت ہے۔ ایکدم موم اور مکھن کی بنی ہوئی۔'' وہ آنکھوں میں شرارت بھر کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''اچھا! پھر تو یقیناً بچے بھی بہت پیارے ہوں گے۔'' میرا لہجہ بجھ گیا۔

''بچے تو ابھی اس سے ہوئے نہیں۔ مگر میرا پورا ارادہ ہے اسے ماں بنانے کا۔''

میں چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟'' میں حیرانی سے آنکھیں پھیلائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں تمہاری بات کر رہا تھا۔ کیوں کیا تم میری بیوی نہیں ہو؟'' وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

''بیوی تو ہوں۔ مگر...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کس بیوی کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ اور دوسری بات یہ کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ آپ یہ بات بخوبی جانتے ہیں۔'' میرے لہجے میں زمانے بھر کی افسردگی اتر آئی۔

''تم صرف اتنا بتا دو۔ کیا تم میرے بچے کی ماں بننا چاہو گی؟ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہیں کیسے ماں بنانا ہے یہ میرا کام ہے'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''جو بات ممکن ہی نہیں، اس کا تصور بھی کیوں کیا جائے؟'' میں تلخ لہجے میں بولی۔

''تم صرف اپنے دل کی بات بتاؤ۔ ماں بننے کی خواہش ہے یا نہیں؟''

''ہاں ہے۔ مگر یہ خوشی میرے مقدر میں نہیں ہے۔ دل کو سمجھا لیا کب کا۔'' میری آواز رندھ گئی۔

''مایوسی گناہ ہے میری جان! تم سے جو وعدہ کیا ہے۔ اسے ہر حال میں پورا کروں گا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا تو میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ بالکل ہوش حواس میں دکھائی دینے کے باوجود بھی مجھے اس کی ذہنی حالت مشکوک دکھائی دینے لگی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن فیصل کے جانے کے بعد میں فرنیچر کی ڈسٹنگ وغیرہ کرنے کے علاوہ بکھری چیزوں کو سمیٹ رہی تھی۔حالانکہ فیصل جانے سے پہلے یہ اطلاع دے کر گیا تھا کہ شکور نے ایک ملازمہ ڈھونڈ لی ہے جو گھر کا سارا کام کر دیا کرے گی۔اور آج سے اس ملازمہ کی آمد بھی متوقع تھی مگر پھر بھی مجھے فارغ بیٹھنا دوبھر ہونے لگا تھا۔میں نے اسٹور سے ایک پرانا کپڑا ڈھونڈا اور اس سے چیزوں کی ڈسٹنگ کرنے لگی۔

اسی دوران میرے فون کی رنگ ٹون بجنے لگی۔میں نے ڈسٹر رکھ کے فون اٹھالیا اور میڈم کا نمبر اسکرین پر دیکھ کر وہیں لاؤنج پر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جی میڈم!کیسی ہیں؟''

''تم میری چھوڑو۔اپنی سناؤ۔چودھری کا رویہ رات کو کیسا رہا تمہارے ساتھ؟''میڈم کے لہجے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

''رات کو تو نارمل ہی رہا۔شراب کا بھی بس ایک دو پیگ لگایا۔جیسے پی کر انسانیت کے لبادے سے باہر نہیں نکلا۔''

''ہمم!یعنی جب زیادہ شراب پیتا ہے،تب ایسی حالت ہوتی ہے؟''

''شاید۔ابھی ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔''میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''چلو۔ٹھیک ہے۔آئندہ جب کبھی اس پر وحشت سوار ہو تو مجھ سے رابطہ کرنا۔میرے پاس اس مرض کا بڑا شافعی علاج موجود ہے۔''اب کی بار میڈم کا لہجہ قدرے شوخی لیے ہوئے تھا۔

''اچھا جی!ایسی کیا چیز چھپائے بیٹھی ہیں جس پر اتنا اترا رہی ہیں؟''میں نے بھی شوخ ہو کر پوچھا۔

''وقت آنے پر بتاؤں گی۔بس تم مجھے یاد کر لینا۔اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے وحشی سانڈ سدھار چکی ہوں۔''میڈم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تو میں بھی ہنسنے لگی۔

''اور سنائیں میڈم!شبانہ کیسی ہے؟''

''جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے۔پھر سے اپنی پرانی جون پر واپس پلٹ گئی۔وہی خاموشی اور اداسی۔''میڈم اس کا ذکر کرتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی۔

''اوہ!میں آؤں گی آپ لوگوں سے ملنے۔''

''ضرور آنا!ہم بھی تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے ترس رہے ہیں۔''میڈم قدرے گرم جوشی سے بولیں۔

چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے فون رکھ دیا اور پھر سے ڈسٹنگ کرنے لگی۔اتنے میں ڈور بیل بجنے لگی۔دروازہ کھولا تو سامنے ایک دبلی پتلی اور سانولی سی عورت کھڑی تھی۔اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

''السلام علیکم بی بی جی!مجھے شکور صاحب نے بھیجا ہے،کام کے لیے۔''

''اوہ اچھا! آؤ اندر آجاؤ۔''اس کے اندر آنے کے بعد میں نے دروازہ پھر سے مقفل کر دیا اور اسے کام سمجھانے لگی۔ وہ ایک سمجھدار اور سگھڑ عورت ثابت ہوئی۔ دو گھنٹے میں کام نمٹا کر چلی گئی۔ میں نے فون کر کے فیصل سے کھانے کے متعلق پوچھا۔

''رہنے دو یار! پکانے کا تردد کیوں کرتی ہو؟ میں لے آؤں گا راستے سے کچھ پکا پکایا۔'' وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''مگر ہر روز باہر سے کھانا تو اچھی بات نہیں۔''میں بھی ایک ادا سے بولی۔

''ہر روز تو نہیں ابھی ایک ہفتہ آرام کرو۔ پھر گھر میں ہی پکا لیا کرنا۔ آخر کو نئی نویلی دلہن ہو۔ اتنا لاڈ اٹھانا تو تمہارا حق بنتا ہے۔'' وہ شوخ ہو رہا تھا۔

''اوکے! جیسی آپ کی مرضی۔'' میں نے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور فون بند کر دیا۔ اٹھ کر اپنے لیے ایک کپ چائے کا تیار کیا اور لاؤنج میں بنے ہوئے بک ریک سے ایک ناول نکال لیا۔ چائے اور ناول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کب شام ہوئی، پتا ہی نہ چلا۔ چھ بجے ناول بند کیا اور نہانے کے لیے باتھ روم کا رخ کیا۔

نہا کر بال سنوارے اور ہلکا پھلکا میک بھی کر لیا۔ سات بجے فیصل آ گیا۔ اس کے ہمراہ شکور بھی تھا۔ جس نے ہاتھ میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ فروٹس کے شاپرز اٹھا رکھے تھے۔ وہ تمام شاپرز سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر الٹے پاؤں واپس چلا گیا تو فیصل نے میرا بازو کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بہت حسین لگ رہی ہو۔ مگر آج میں حسن کی ان رعنایوں سے محروم رہوں گا۔''

''کیوں؟ خیریت ہے نا؟''میں غیر محسوس انداز میں اس سے الگ ہوگئی۔

''ہاں! آج گاؤں جانے کا ارادہ ہے۔''اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''تم کھانا پلیٹوں میں نکالو۔ میں ابھی فریش ہو کر آیا۔''اس نے بیڈ روم کا رخ کیا اور میں نے وہ شاپرز اٹھائے اور کچن کی طرف چل دی۔

کھانا میز پر لگا رہی تھی۔ جب فیصل آف وائٹ شلوار قمیض زیب تن کیے کمرے سے برآمد ہوا۔ میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور پھر سے اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی بہت شاندار دکھائی دے رہا تھا۔

وہ صوفے پر آ بیٹھا۔ کھانے میں آج صرف باربی کیو پر مشتمل چند چیزیں تھیں۔ ساتھ دہی کا رائتہ اور سلاد تھا۔ کھانے کے دوران چھوٹی موٹی باتیں بھی چلتی رہیں۔

''ابا جی کی طبیعت بہت ناساز رہنے لگی ہے۔ اب تو ان کا زیادہ وقت بستر پر گزرنے لگا ہے۔'' ابا جی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ہلکا سا تشویش کا رنگ اتر آیا تھا۔

مجھے میڈم کی کہی باتیں یاد آنے لگیں جو انہوں نے بڑے چودھری کے متعلق کہی تھیں۔ میڈم کے کہنے کے مطابق کثرت شراب

نوشی اور عیاشی نے بڑے چودھری کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ان کی صحت کو گھن کی طرح چاٹ گئی تھیں یہ چیزیں۔

''ان کو بیماری کیا ہے؟''میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''شوگر تو کافی عرصہ سے تھی جس کی وجہ سے گردے ناکارہ ہو چکے ہیں۔اور اب نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ان کے گردے ہفتے میں دو مرتبہ واش کروانے پڑتے ہیں۔''وہ عام سے لہجے میں بتا رہا تھا۔

''گاؤں میں تو ایسی سہولت موجود نہیں ہو سکتی۔تو کیا شہر میں لایا جاتا ہے انہیں؟''

''ہاں ظاہر ہے۔لاہور لایا جاتا ہے انہیں۔لاہور کے بہترین ہسپتال سے ان کا ٹریٹمنٹ کروایا جاتا ہے۔''اب اس کے لہجے سے تفاخر جھلکنے لگا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟''میں نے ایک چھوٹے سائز کا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''پوچھو۔''

''کیا آپ کے والد بھی شراب نوشی کرتے تھے؟''

میرا غیر متوقع سوال سن کر فیصل کے چلتے ہاتھ رک گئے۔وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''اگر آپ جواب نہ دینا چاہیں تو مت دیں۔''میں اندر سے ڈر گئی تھی اور اوپر سے دلیر بننے کی کوشش کر رہی تھی۔اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر سے کھانے میں مشغول ہو گیا۔

''ہاں!وہ بہت زیادہ شراب نوشی کیا کرتے تھے۔اگر میں یہ کہوں کہ اس قدر شراب نوشی نے ہی انہیں اس حالت تک پہنچایا تو شاید یہ غلط نہ ہوگا۔''اس نے معتدل سے انداز میں میری بات کا جواب دیا اور پھر سے کھانے میں مشغول ہو گیا مگر چند نوالے مزید لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔

''بس؟''

''ہاں!برتن اٹھا کر لے جاؤ۔''اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''مگر آپ نے بہت کم کھایا ہے۔مزید کھائیں نا۔''میں نے زور لگایا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

''بس اتنی ہی طلب تھی۔تم کھاؤ۔''اس کا لہجہ تھکا تھکا سا لگا مجھے۔

مجھ سے بھی مزید نہ کھایا گیا۔میں نے بھی ہاتھ روک لیا اور برتن اٹھا کر کچن میں لے جانے لگی۔باقی کھانا محفوظ کر کے میں پھر سے اس کے پاس آ بیٹھی۔اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آج میں گاؤں جا رہا ہوں۔جب واپس آؤں گا تو ایک سرپرائز دوں گا تمہیں۔''اس کے لہجے کی اداسی کہیں معدوم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ خوشگواریت لوٹ آئی تھی۔

''کیسا سرپرائز؟''میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''دوبئی چلیں گے۔گھومنے پھرنے۔گاؤں سے کل واپس آجاؤں گا۔پرسوں پاسپورٹ کے دفتر چلیں گے۔تمہارا پاسپورٹ بننے کے لیے دوں گا۔''

میں نے کوئی بھی ردعمل ظاہر نہ کیا۔نہ خوشی کا اور نہ افسردگی کا۔

''کیوں تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''میرے رویے نے اسے حیران کیا۔

''کچھ خاص نہیں!میرے لیے ہر جگہ ایک سی ہے۔''میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کمال کرتی ہو کبھی کبھی۔بہرحال جب جاؤ گی تو تمہاری یہ سوچ بھی بدل جائے گی کہ ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔پاگل ہیں وہ لوگ جو دوبئی یا دوسرے ممالک میں گھومنے پھرنے کے لیے جاتے ہیں؟''وہ تاسف بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

اس کی اس طرح کی افسوس ناک گھوری پر مجھے اپنی ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''اچھا میں اب چلتا ہوں۔اور ہاں جن دنوں میں گاؤں جایا کروں گا ان دنوں شکور رات کو بھی ادھر ہی ڈیوٹی دیا کرے گا۔تاکہ تم خود کو غیر محفوظ تصور نہ کرو۔''وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔میں شکور کی موجودگی کا مقصد اچھی طرح سمجھ رہی تھی مگر فیصل کو کچھ بھی محسوس کرائے بنا جواباً مسکرا دی۔وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

وہ سارا دن میں نے کتابیں پڑھتے ہوئے یا فون کالز پر میڈم اور شبانہ سے باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ان سے اگلے دن ملنے کے لیے آنے کا وعدہ بھی کرلیا۔شبانہ نے فیکٹری سے چھٹی کرنے کا اعلان کردیا اور ساتھ ہی دوپہر کے کھانے پر بھی مدعو کرلیا۔میں نے حامی بھر لی۔

رات کو اپنے لیے دو انڈوں کا آملیٹ بنا کر بریڈ کے ساتھ کھا لیا۔اوپر سے چائے کا بڑا مگ دودھ پتی کا تیار کرلیا۔حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے آج بہت آزادی اور مسرت سی محسوس ہو رہی تھی اور میں اس آزادی کو بھرپور طریقے سے منانا چاہ رہی تھی۔

دل چاہ رہا تھا کہ اونچی آواز میں قہقہے لگاؤں یا پھر میوزک لگا کر رقص کرنا شروع کردوں۔آج میں اس شاندار فلیٹ کی بلاشرکت وغیرے مالک تھی۔چائے کا مگ اٹھا کر بیڈروم میں چلی آئی۔ایل ای ڈی آن کی اور ایک انڈین فلم دیکھنے لگی۔رات گئے تک جاگتی رہی اور دن چڑھے تک سوتی رہی۔

صبح آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔فوراً یاد آیا کہ بارہ بجے تو مجھے ہوسٹل پہنچنا ہے۔آج دوپہر کا کھانا میڈم اور شبانہ کے ہمراہ کھانا ہے۔اس خیال نے جسم میں ایک توانائی سی بھر دی۔بستر کو ایک طرف پھینکا اور چھلانگ لگا کر بیڈ سے نیچے اتر آئی۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک خوبصورت سا سوٹ الماری سے نکال کر زیب تن کیا، ہلکا پھلکا میک اپ کر کے آئینے میں خود کا تنقیدی جائزہ لیا اور سراہے بنا نہ رہ سکی۔ میری شخصیت میں وہ وقار اور تمکنت کسی حد تک پیدا ہو چکے تھے جو کسی بھی متمول گھرانے کی عورتوں کے چہروں پر جھلکا کرتی ہے۔

ہینڈ بیگ اٹھایا، اس میں اپنا نیا موبائل فون رکھا، ساتھ کچھ کیش رکھا اور بیگ کندھے پر لٹکا لیا۔ باہر لاؤنج میں آ کر فون نکالا اور شکور کا نمبر ملانے لگی۔ اس نے تیسری بیل پر کال پک کر لی۔

''شکور! گاڑی نکالو۔ مجھے ہوسٹل جانا ہے۔'' میں نے اپنی آواز میں تحکمانہ رنگ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔

''جی بیگم صاحبہ! آپ نیچے تشریف لے آئیں۔ گاڑی زیادہ دور نہیں ہے۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا تو میں نے ایک انجانی سی خوشی رگ رگ میں سرائیت کرتی محسوس کی۔ میں نے فلیٹ کے بیرونی دروازے کی چابیاں کی اسٹینڈ سے اتاریں جو وہیں لاؤنج کی ایک دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ بیرونی دروازہ لاک کیا اور چابیوں کے گچھے کو بیگ میں رکھ لیا۔

لفٹ میں داخل ہوئی، گراؤنڈ فلور کا بٹن پش کیا اور اطمینان سے کھڑی لفٹ کے رکنے کا انتظار کرنے لگی۔ لفٹ ایک ہلکے سے جھٹکے سے رکی۔ خودکار دروازہ کھلا تو میں باہر آ گئی۔ گیٹ پر حسب معمول ایک چوکیدار بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سر کے خفیف اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اپنی خود اعتمادی اور بے نیازی دیکھ کر خود بھی حیران ہو رہی تھی۔

سچ کہتے ہیں لوگ۔ دولت انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ میری شخصیت کو بھی خوشحالی اور آسودگی نے چند دن میں ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ میں باہر آئی تو شکور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیے منتظر نظروں سے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھرتی سے گاڑی سے باہر نکلا اور پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھول دیا۔

میں ایک شان سے اندر بیٹھی تو اس نے دروازہ بند کر کے جا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گیئر لگا کر گاڑی آگے بڑھائی اور پوچھا۔

''ویمن ہوسٹل جانا ہے نا؟'' اس نے دوبارہ سے تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔

''ہاں! وہیں جانا ہے۔''

''چودھری صاحب کو یقیناً پتا ہی ہوگا کہ آپ وہاں جا رہی ہیں؟'' اس نے عقب نما آئینے سے میری طرف دیکھا۔

اس کے اس اچانک سوال پر میں گڑبڑا گئی۔ مگر پھر اچانک ہی خود کو سنبھال لیا اور بولی۔

''ہاں! ان کو بتا دیا تھا کہ میں کل وہاں جاؤں گی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔''

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر دل میں یہ خوف جاگزیں ہو گیا کہ اگر شکور نے فون کر کے فیصل سے اس بات کی تصدیق کرنا چاہی تو......فیصل کا ردعمل کیا ہوگا میرے بارے میں۔'' یہ سوچتے ہی ایک گھبراہٹ سی طاری ہو گئی اور بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔

دل چاہا کہ ابھی فیصل کو فون کر کے اطلاع دے دوں کہ میں ہوسٹل جا رہی ہوں مگر اگلے ہی لمحے یہ خیال آ گیا کہ شکور کے سامنے جو جھوٹ بول چکی ہوں۔اس کا کیا ہوگا۔وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔اب خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

پندرہ منٹ بعد میں گاڑی سے اتر کر ہوسٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔اندر جانے سے پہلے میں شکور کو بتا چکی تھی کہ مجھے تین سے چار گھنٹے لگ سکتے ہیں۔اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

سب سے پہلے میں میڈم کے آفس میں داخل ہوئی۔میڈم مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے گلے لگ گئی۔معانقے کے بعد اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی جا کر بیٹھ گئی۔میڈم بڑے غور سے میرے چہرے کو تک رہی تھی۔اس کے اس طرح دیکھنے پر میں جھینپ سی گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں میڈم؟''میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تم تو ایک ہفتے کے اندر ہی چودھرانی بن گئی۔''ان کی نگاہوں میں ایک ستائش تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے میڈم! آپ کی نظروں کا قصور ہے شاید۔''میں نے بھی شرارت بھرے انداز میں جواب دیا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''یہ شان و شوکت، یہ پر تمکنت چہرہ۔یہ سب میری نظروں کا فتور ہے؟''وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''اچھا چھوڑیں نا یہ فضول باتیں! کچھ اپنے بارے میں کہیں۔طبیعت کیسی رہتی ہے۔صحت کیسی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔''

''بس بانو یار! طبیعت اور صحت تو اب نخرے ہی دکھاتی رہتی ہیں۔''اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں یاد آیا! تمہیں کچھ چیزیں دینی تھیں۔''میڈم نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے ایک چھوٹے سائز کی ڈبی نکالی۔ جیسی عموماً ادویات وغیرہ کے لیے ہوتی ہیں۔اس نے وہ ڈبی میرے سامنے پھینکی۔

''اسے اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لو۔''اس نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔

''مگر اس کے اندر کیا ہے میڈم؟''میں نے وہ ڈبی اٹھا کر کھولنے کی کوشش کی۔

''اس کے اندر تمہارے مسئلے کا حل ہے۔اس مسئلے کا حل، جس نے تمہیں اس دن پریشانی اور اذیت میں مبتلا کر کے رکھ دیا تھا۔'' میڈم پر سکون لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''میں اب بھی نہیں سمجھی۔''میں ڈبی کھول کر اس میں رکھے دو پتے باہر نکال کر دیکھ رہی تھی۔جن کے اندر بہت چھوٹے سائز کی گولیاں بند نظر آ رہی تھیں۔''یہ کیسی گولیاں ہیں میڈم؟''

''یہ نیند کی گولیاں ہیں۔جب سمجھو کہ چودھری زیادہ شراب پی رہا ہے اور اس کے تیور خطرناک ہیں تو اس کے پیگ میں دو گولیاں

ڈال دینا نظر بچا کر۔ گولیاں اس کے معدے میں پہنچیں گی تو اس کے ٹھیک آدھے گھنٹے کے اندر اندر انٹا غفیل ہو جائے گا۔''

''کیا واقعی؟'' میں بے یقینی سے ان ننھی منھی گولیوں کو دیکھ رہی تھی جن کے کارنامے یقیناً بڑے بڑے تھے۔

''ایک بات بتائیں میڈم! کیا آپ کو بھی، ان گولیوں کے سہارے کی کبھی ضرورت پیش آئی؟'' میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں استفسار کیا تو میڈم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''بالکل! کئی بار ضرورت پڑی ہے اور جب بھی ضرورت محسوس ہوئی ان کا بلا دریغ استعمال کیا۔ بھئی عورت کوئی ربڑ کی گڑیا تھوڑی ہے کہ اس سے کھیلتے ہوئے اسے توڑ مروڑ کر چیک کیا جائے کہ اس میں کتنی لچک ہے۔'' میڈم کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ میں نے وہ گولیاں اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لیں۔

''میڈم! شبانہ یقیناً اپنے روم میں ہوگی۔ اب میں اس سے ملنا چاہوں گی۔'' میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

''بیٹھو ابھی۔ باتوں باتوں میں کچھ ایسی کھوئی کہ تمہیں چائے پانی کا پوچھا ہی نہیں۔ اس بات کے لیے سوری...... چودھرانی صاحبہ۔'' میڈم خوشدلی سے بولیں اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

میں اپنی جگہ پر پھر سے بیٹھ گئی اور میڈم نے اپنے سامنے رکھا بزر بجایا جو باہر بیٹھی آیا کو اندر بلانے کے لیے بجایا جاتا تھا۔ آیا اندر آئی تو میڈم نے اسے دو چائے لانے کا آرڈر دیا۔

''نہیں میڈم! چائے پی لی تو بھوک مر جائے گی جبکہ شبانہ ہمارا کھانے پر انتظار کر رہی ہے۔ ایسا کریں کولڈ ڈرنکس یا جوس منگوالیں۔''

میڈم نے میری بات مانتے ہوئے اسے دو جوس لانے کا آرڈر دیا۔ وہ چلی گئی تو ہم پھر سے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئیں۔ میڈم کے پاس بیٹھی جوس پی رہی تھی جب شبانہ کا فون آیا۔ وہ مجھے روم میں آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں نے جوس ختم کیا اور میڈم سے اجازت چاہی۔

''ہاں تم چلو! میں بھی تمہارے پیچھے آرہی ہوں۔ بھئی آج میں بھی شبانہ کی مہمان ہوں۔'' میڈم نے فخر سے بتایا۔

''او کے۔ آپ آجائیے گا۔ میں جا رہی ہوں۔'' میں میڈم کے آفس سے نکلی اور شاداں و فرحاں شبانہ کے روم کی طرف چل دی۔

دروزے پر ہلکی سی دستک دی اور پھر جواب کا انتظار کیے بنا ہی اندر چلی آئی۔ کمرہ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ اس وقت زمین پر دستر خوان سجا رہی تھی۔ کھانے کے برتن لگا رہی تھی۔ مجھے سامنے دیکھا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میری طرف لپکی۔ گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ تھوڑی دیر ہم یونہی ایک دوسرے سے لپٹیں کھڑی رہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے برسوں بعد ملیں ہوں۔ آخر وہ مجھ سے الگ ہوئی اور ایک بھرپور نظر میرے سراپا پر ڈالی اور بولی۔

''بانو! تم تو سچ مچ کی بیگم صاحبہ لگ رہی ہے قسم سے۔ ایک ہفتے میں تم تو بالکل بدل گئی۔'' اس کی خوشی دیدنی تھی۔

پھر ہم دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ برتن لگانے لگیں۔ شبانہ نے کھانے پر کافی اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے میڈم کو فون کیا۔ چند منٹ بعد میڈم ہمارے ہمراہ بیٹھی کھانا تناول کر رہی تھی۔ کھانے کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی چہلیں بھی چلتی رہیں۔ کھانے کے بعد آئس کریم کا دور چلا۔ میڈم چلی گئی تو ہم پھر سے باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

''بانو! تم سے ایک مشورہ کرنا تھا۔'' اس کا انداز ہچکچاہٹ آمیز تھا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟ کھل کر کہو نا۔ مجھ سے کیسا پردہ؟'' مجھے اس کا رویہ اچنبھے میں مبتلا کر رہا تھا۔

''بات یہ ہے کہ میں نے بھی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ارے واہ! کون ہے وہ خوش نصیب؟'' میں الرٹ ہو کر بیٹھ گئی اور اس کی طرف متجسس نظروں سے دیکھنے لگی۔

''سپروائزر ریاض نے مجھے پروپوز کیا ہے۔''

''اوہ! تو یہ بات تھی۔ میں بھی کہوں، تم پر آخر اتنا مہربان کیوں رہتا ہے۔'' میں شرارت سے بولی تو وہ بھی مسکرانے لگی۔

''مگر وہ تو شادی شدہ نہیں؟ دیکھنے میں تو پکی عمر کا لگتا ہے۔'' میں نے مشکوک انداز میں کہا۔

''ہاں شادی شدہ ہے۔ تین بچوں کا باپ ہے۔ بیوی دو سال پہلے وفات پا چکی ہے۔ بچوں کو اور گھر کو سنبھالنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ اسی لیے مجھے شادی کی پیشکش کی۔''

''ہمم! تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''سوچ رہی ہوں۔ کب تک اکیلی دھکے کھاتی پھروں گی۔ اس کا سہارا قبول کر کے اس کے بچوں کا سہارا بن جاؤں۔ تم بتاؤ۔ تمہارا کیا مشورہ ہے؟'' وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے تو تمہارا فیصلہ اچھا لگا۔ اکیلی عورت کا زندگی گزارنا، کانٹوں بھرے راستے پر ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے۔'' میں نے مربیانہ انداز میں نصیحت کی۔

''ویسے میڈم سے رائے لی؟ وہ کیا کہتی ہیں؟''

''انہوں نے بھی میری بات کی حمایت کی۔''

''تو بس پھر ٹھیک ہے۔ اللہ پر ڈروری پھینک دو۔ وہ یقیناً بہتر کرے گا۔''

تھوڑی دیر مزید بیٹھنے کے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔ راہداری میں چلتے چلتے، شکور کو فون کیا اور اسے گاڑی گیٹ کے سامنے لانے کے لیے کہا۔

☆......☆......☆

گھر پہنچی، بیگ صوفے پر پھینکا اور کپڑے بدل کر کچن میں گھس گئی۔فریج سے چکن کا پیکٹ نکالا اور چکن کڑاہی بنانے کی تیاری کرنے لگی۔آج میرا موڈ بہت خوشگوار تھا۔بڑی دلجمعی سے کھانا تیار کر رہی تھی۔فیصل آج پہلی بار میرے ہاتھوں کا بنا کچھ کھانے جا رہا تھا۔

میری خواہش تھی کہ وہ کھانا کھائے تو اسے بہت پسند آئے اور وہ میری دل کھول کر تعریف کرے۔چکن کڑاہی بنا کر اسے دم پر لگایا اور خود باہر آ کر ہاتھ منہ دھو کر بال سنوارے اور ہلکا پھلکا بناؤ سنگھار بھی کر لیا۔وقت دیکھا تو شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔میں نے فیصل کا نمبر ملایا۔اس نے فون اٹھایا۔

''السلام علیکم!''میں نے کھنکتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام''اس نے نارمل سے لہجے میں جواب دیا۔

''گھر کب آ رہے ہیں آپ؟''میں نے شوخ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سات بجے تک''اس کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھا۔

میں نے اس کے سرد مہر رویے پر زیادہ غور نہ کیا۔فون بند کر کے شکور کو فون کر کے روٹیاں لانے کا آرڈر دیا اور خود فیصل کے آنے تک ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی۔شکور روٹیاں لایا تو انہیں ہاٹ پاٹ میں رکھ لیا۔

سات بج کر پانچ منٹ پر فیصل گھر میں داخل ہوا۔مجھے فیصل کی بہت سی ناگوار عادات کے ہجوم میں ایک یہ عادت بہت پسند تھی کہ ہمیشہ وقت کی پابندی کرتا تھا۔جو بھی وقت دیتا ٹھیک اسی وقت آ جاتا۔میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بریف کیس پکڑا اور مسکراتے ہوئے ایک انداز دلربائی سے بولی۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں۔تم ذرا بیڈ روم میں آؤ۔''اس نے تحکمانہ انداز میں کہا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا بیڈ روم میں چلا گیا۔میرا ماتھا ٹھنکا۔چند لمحے اس کے عجیب وغریب رویے پر غور کرتی رہی پھر اس کی پریشانی کو اس کے باپ کی خرابی طبیعت پر مجمول کرتے ہوئے کندھے اچکائے اور اس کے پیچھے چل دی۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ٹائی گردن سے اتار رہا تھا۔میں اس کے پیچھے جا کر اس کا کوٹ اتارتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''کیسا گزرا آج کا دن؟''

''کچھ خاص نہیں۔بہت ہی بوریت بھرا۔''اس کا لہجہ دھیما اور بجھا بجھا سا تھا۔

میں نے الماری سے ایک ہینگر کھینچ کر کوٹ کو اس میں ڈال کر الماری میں لٹکا دیا۔واپس آئی تو وہ ابھی تک اسی پوزیشن میں ایک

مجسمے کی مانند کھڑا تھا۔

”تم سناؤ! تمہارا دن کیسا گزرا؟ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کافی سیر سپاٹے کرتی رہی ہو۔“ اس کا لہجہ زہرناک ہو گیا تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سوری فیصل! تمہیں بتانا یاد ہی نہ رہا۔“ ابھی یہ جملہ میرے منہ سے پورا ادا بھی نہ ہوا تھا۔ جب اس نے اپنی پینٹ سے بیلٹ کھینچ کر مجھ پر برسانا شروع کر دیا۔ میں اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھی۔ تکلیف سے میری چیخیں نکلنے لگیں۔ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ اس کے سر پر گویا کوئی وحشت سوار تھی۔ چند منٹ میں مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

شاید میری ہذیانی چیخوں کا اثر اس پر ہوا یا پھر پڑوس تک میری آواز سن لیے جانے کا ڈر، کہ اس نے جلدی ہی ہاتھ روک دیا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا بیلٹ ایک طرف پھینک دیا۔ نیچے جھک کر میرے بکھرے ہوئے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر میرا سر زمین سے اٹھا لیا اور اپنا چہرہ پاس لاتے ہوئے پھنکارا۔

”کس کی اجازت سے تم نے پاؤں گھر سے باہر نکالا؟ جواب دو میری بات کا۔ تمہاری اتنی جرأت بھی کیسے ہوئی؟“

میں سہمی ہوئی نظروں سے اس کے دہشت بھرے چہرے کو تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

میرا پورا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس نے بالوں سے پکڑے پکڑے مجھے اوپر اٹھایا۔ تکلیف کی شدت سے میں چلا اٹھی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”چلو اٹھو! میرے لیے پیگ تیار کرو۔ آج خود بھی جی بھر کے پیؤں گا اور تمہیں بھی پلاؤں گا۔ پینے سے تمہیں اپنی تکلیف کا احساس بھی کافی حد تک کم ہو جائے گا۔“ اس نے قہقہہ لگایا اور مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ جہاں جہاں بیلٹ لگے تھے وہاں یوں محسوس ہو رہا تا جیسے کھال ادھڑ گئی ہو۔ حد درجہ جلن اور اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ فیصل سے انتہائی درجے کی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ الماری سے اس کی رائفل نکالوں اور اس کے ناپاک وجود کو گولیوں سے بھون ڈالوں۔

میں نے کچن میں جا کر دو گلاس ٹرے میں رکھے۔ کیبنٹ سے میڈم کی دی ہوئی گولیوں کا پتا نکالا۔ اس میں سے تین گولیاں نکال کر انہیں ایک کھانے والے چیچ پر رکھا، اوپر چند قطرے پانی کے ٹکائے تو وہ گولیاں پانی میں فوراً حل ہو گئیں۔ وہ حل شدہ محلول ایک گلاس میں ڈال دیا اور گولیوں کا پتا پھر سے بحفاظت برتنوں کے پیچھے چھپا کر کیبنٹ کا دروازہ بند کر دیا۔

فریج سے برف والے کیوبز نکالے اور دونوں گلاسوں میں دو دو کیوبز ڈال دیئے۔ٹرے اٹھائے واپس بیڈروم میں آئی تو وہ بیڈ پر لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا۔میں نے وہ خالی گلاسوں والی ٹرے بیڈ کے پاس رکھی تپائی پر رکھ دی اور پوچھنے لگی۔

''کون سی بوتل لے کر آؤں؟'' میرے جسم کے ساتھ ساتھ آواز بھی کانپ رہی تھی۔اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''آج وہسکی لے آؤ۔تمہیں اس کی ہولنا کیوں کا اندازہ بھی تو ہونا چاہیے۔'' وہ خباثت سے ہنسا تو میرا رواں رواں سلگنے لگا۔

میں خاموشی سے گئی اور بار روم سے وہسکی کی بوتل اٹھا لائی۔لرزتے ہاتھوں سے شراب گلاسوں میں انڈیلنے لگی۔پھر وہ گولیوں والا گلاس اٹھایا اور اس کی طرف بڑھایا۔دل میں یہ خدشہ بھی بدستور موجود تھا کہ اگر اس کو میری اس حرکت کی خبر ہوگئی تو میرا انجام کیا ہوگا اور اگر گولیاں نہ ملاتی تو پھر بھی ایک بھیانک اور متوقع انجام میرے سامنے موجود تھا۔اس نے گلاس پکڑا اور فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔پھر ایک ہی سانس میں پورا گلاس چڑھا گیا۔

''تم نے اپنا پیگ تیار نہیں کیا؟ کیوں؟'' وہ اب خالی گلاس ہاتھ میں پکڑے مصنوعی حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں نہیں پی سکتی۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے جوب دیا۔

''مگر کیوں نہیں پی سکتی میری جان! پیئو۔پینے سے تکلیف کا احساس ایک دم زائل ہو جائے گا اور اگلی تکالیف کا سامنا کرنے کے لیے بھی کے لیے بھی خود کو تیار پاؤ گی۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے خالی گلاس پکڑا اور پھر سے بھر کر اسے تھما دیا۔اس نے گلاس پکڑ لیا مگر اصرار بھری نگاہوں سے میری طرف ہی دیکھتا رہا۔میں نے اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے گلاس میں چند گھونٹ انڈیلے اور گلاس ہونٹوں کے پاس لے گئی۔

اب وہ دوسرا گلاس بھی بڑے بڑے گھونٹ بھر کے تیزی سے خالی کر رہا تھا۔میں نے دل کڑا کر کے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا تو ابکائی آتے آتے رہ گئی۔بہت ہی ناگوار ذائقہ تھا۔وہ گھونٹ جہاں سے گزرتا گیا۔آری کی طرح حلق کو کاٹتا چلا گیا۔میری نظریں بار بار وال کلاک کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

فیصل کے معدے میں گولیوں کو پہنچے پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔دس پندرہ منٹ تک اسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا۔اگر ان گولیوں کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو......اس سے آگے سوچنے کی ہمت نہ پڑی۔میں اب دل ہی دل میں اس کے جلدی جلدی بے ہوش ہونے کی دعائیں کرنے لگی۔آخر وقت گزارنے کے لیے ایک ترکیب ذہن میں آئی۔

''اگر آپ کہیں تو کپڑے چینج کر لوں؟'' میں نے اجازت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔وہ اپنی بند ہوتی ہوئی مخمور آنکھوں کو زبردستی کھولنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔میری بات سن کر میری طرف بھاری پپوٹے اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''ہاں ہاں! نائٹی پہن کر آ جاؤ۔'' اس کی زبان اب لڑکھڑا رہی تھی۔

میں ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی۔ اب مجھے اس کے سونے کا انتظار تھا۔ جسم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ قالین پر بیٹھے بیٹھے وجود اینٹھنے لگا تو اٹھ کر الماری کھول کر اس کی رائفل باہر نکال لی۔ اگر اس میگزین کی ساری گولیاں اس کے جسم میں اتار دوں تو...... کیا ہوگا بھلا؟ اس ہولناک تصور نے ہی مجھے لرزا دیا۔ رائفل واپس اس کی جگہ پر رکھی اور ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر بیڈروم میں جھانکا۔

وہ بے سدھ ہو چکا تھا۔ جھجکتے ہوئے پاس آئی تو وہ ہوش وحواس سے بیگانہ نظر آیا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا مگر اس کی پتلیوں میں کوئی جنبش دکھائی نہ دی تو پاس رکھے صوفے پر گر سی گئی۔ آنکھوں سے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ کتنی خوش تھی میں آج۔ کتنی چاہت سے اس کم ظرف کے لیے کھانا تیار کیا تھا مگر اس نے کھانے کی بجائے، میرا ابھر کس نکال دیا تھا۔ میرے پیٹ میں بھوک کی وجہ سے اینٹھن محسوس ہونے لگی تھی مگر اٹھ کر باہر جانے اور کچھ کھانے کو دل نہ چاہ رہا تھا مگر خالی پیٹ کوئی درد کش دوا بھی نہیں لے سکتی تھی۔ اس کیلئے چند نوالے زہر مار کرنے ضروری تھے۔

میں نے ہمت مجتمع کی اور کمرے سے باہر نکل کر کچن کا رخ کیا۔ ہاٹ پاٹ سے ایک روٹی لی۔ پلیٹ میں تھوڑا سالن لیا اور لاؤنج میں آن بیٹھی۔ چند لقمے زہر مار کیے اور ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانے والے برتن اندر کچن میں رکھے اور ایک کپ چائے کے لیے پانی چولہے پر چڑھا دیا۔ چائے تیار کر کے ساتھ دو گولی پین کلرز کی لیں اور پھر سے لاؤنج میں آ بیٹھی۔

چائے کے ساتھ گولیاں نگل کر وہیں صوفے پر سمٹ کر لیٹ گئی۔ اپنی آنے والی زندگی کے متعلق سوچ سوچ کر آنکھیں پھر سے سلگنے لگیں۔ یہ تو بہرحال طے تھا کہ ایسے مار کھا کھا کر زندگی نہیں گزرنے والی تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے والی ہو گئیں مگر کوئی بھی واضح حل سمجھ میں نہ آیا۔ تھک ہار کر آنکھیں موند لیں اور بالآخر نیند کی وادی میں جا اتری۔

☆......☆......☆

صبح میری آنکھ کسی انجانے لمس کو محسوس کر کے کھلی۔ مجھے لگا جیسے میری پیشانی پر کسی نے اپنے جلتے لب رکھ دیئے ہوں۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو فیصل میرے چہرے پر جھکا مجھے ترحم آمیز نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

''تم......؟'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹی رہو۔'' اس نے اپنے ہاتھ سے میرے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور میں پھر سے سر پھینک کر لیٹ گئی۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔

''ناراض ہو مجھ سے؟''

دل تو چاہا کہ اس کے اس بے تکے سوال پر اس کا منہ نوچ لوں مگر اپنی نازک پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے چپ پڑی رہی۔

''جانتا ہوں کہ مجھ سے بہت ناراض ہو۔ مگر تم بھی تو دیکھو نا...... تم نے غلطی تو کی نا۔ بنا مجھے بتائے تمہیں کہیں نہیں جانا چاہیے نا۔'' وہ لجاجت سے جیسے مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں خاموش لیٹی چھت کو گھورتی رہی مگر آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر کانوں کی لوؤں کو بھگونے لگے۔ وہ ابھی تک میرا ہاتھ سہلا رہا تھا اور میں مردوں کی طرح بے حس و حرکت اس کے سامنے پڑی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھ کر وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔

''مت رو میری جان! تم نہیں جانتی تجھے روتا دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔'' وہ اپنے ہاتھ کی پوروں سے میرے آنسو پونچھنے لگا اور اس وقت میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ گرگٹ زیادہ تیزی سے اپنا رنگ بدلتا ہوگا یا میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ آدمی۔

''مجھے معاف کر دو مہر بانو! پلیز مجھے چھوڑ کے مت جانا۔ میں بالکل تنہا رہ جاؤں گا۔'' اس نے کسی چھوٹے بچے کی طرح بلکتے ہوئے میرے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی اس جذباتی اداکاری کا بھی مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا اور میں بے جان وجود اور پتھرائی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی تو اس نے ایک نیا پینترا بدلا۔ بجلی کی اسپیڈ سے اٹھا اور بیڈ روم میں چلا گیا۔ میرا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا۔

''پتا نہیں یہ ذہنی مریض اب کیا کرنے جا رہا ہے۔'' میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

یہ نہ ہو اندر سے اپنی رائفل اٹھا لائے اور میرا کام تمام کر دے۔ کاش رات کو میں ہی دل کڑا کر کے اس کا کام ختم کر دیتی۔ میں گومگو کی حالت میں بیٹھی خوابگاہ کے دروازے کو گھور رہی تھی کہ وہ کسی چھلاوے کی طرح اس دروازے سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل کی بجائے کچھ کاغذات تھے۔ سکون بھری گہری سانس میرے حلق سے خارج ہوئی اور تنے ہوئے اعصاب قدرے ریلیکس ہو گئے۔ وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ میرے پاس بیٹھ کر کاغذات میری طرف بڑھائے۔

''یہ دیکھو بانو! انہیں پڑھو ذرا......''

میں نے وہ پیپرز پکڑ لیے مگر کھول کر نہ دیکھا۔

''کیا ہے ان کے اندر؟'' میرے حلق سے پہلی بار آواز نکلی۔ ورنہ تو اب تک وہی بول رہا تھا اور میں خاموشی سے سن رہی تھی۔

''میں نے سوا کروڑ کا یہ فلیٹ تمہارے نام لگوا دیا۔ تم مالکن ہو اس کی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تم مجھے کسی بھی وقت دھکے دے کر یہاں سے نکال سکتی ہو مگر تمہیں یہاں سے کوئی بھی بے دخل نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں۔'' وہ خوشامدانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس کی بات سن کر یقین نہ آیا بلکہ حیرت کا ایک زوردار جھٹکا سا لگا۔ میں وہ کاغذات کھول کر پڑھنے لگی۔

فیصل سچ کہہ رہا تھا۔ ان پیپرز کی رو سے میں اس فلیٹ کی بلا شرکت غیرے مالک تھی اور اسے کبھی بھی سیل کرنے کا حق رکھتی تھی۔

کاغذات پر لکھی تحریر کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا ہر زخم جیسے ایکدم مندمل ہوتا چلا گیا۔ ہر فکر اور بے چینی کو سکون مل گیا۔ تحفظ کا احساس بہت طاقتور ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہ اس وقت ادراک ہوا۔ میں نے کاغذات کے اس پلندے کو رول کر کے مضبوطی سے پکڑ لیا اور جب بولی تو میرا لہجہ بھی چٹانوں سی سختی اور مضبوطی لیے ہوئے تھا۔

''تو گویا اب میں اس فلیٹ کی مالک ہوں؟''

''ہاں بالکل! تم اس فلیٹ کی مالک ہو اور مجھے جب جی چاہے کان سے پکڑ کر باہر پھینک سکتی ہو۔ مگر میں تم سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔ آخری بار معاف کر دو۔ آئندہ ہاتھ اٹھاؤں تو جو دل چاہے سزا تجویز کر لینا۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''رات کو جب تم مجھے بیلٹ سے پیٹ رہے تھے۔ مالکن تو میں تب بھی تھی۔ تب تم نے کیا لحاظ کیا میرا؟'' میں زہرناک نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مالکن تو تھی تم۔ مگر اپنے حق ملکیت سے آگاہ نہ تھی اور جب تک کسی کو اپنے حقوق سے متعلق مکمل آگاہی نہ ہو وہ اپنے حق کے لیے بھی نہیں لڑ سکتا۔'' اس نے کسی فلسفی کی طرح فلسفہ بگھارا۔ میں نے پھر سے اس کی بات پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہ تھا۔ میں سمجھ چکی تھی کہ یہاں رہنا ہے تو خود کو مضبوط رکھنا پڑے گا اور ایک مختلف حکمت عملی کو بھی اپنانا پڑے گا۔ ذہن میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دے کر اور ایک فیصلے پر پہنچ کر میں نے لب کھولے۔

''اوکے! یہ آخری موقع میں تمہیں دے رہی ہوں۔ آئندہ اگر تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا یا کوئی بھی ناروا رویہ اختیار کیا تو پھر کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' میرا دوٹوک رویہ دیکھ کر وہ پہلے تو تھوڑا حیران ہوا پھر خوش ہو گیا۔

''آئندہ کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ بس تم مجھے چھوڑنے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔''

''نکال دیا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو وہ کھل اٹھا۔

''تھینکیو سوچ میری جان! میں ابھی شکور کے ہاتھ ناشتہ منگواتا ہوں۔ دونوں مل کر ناشتہ کریں گے اور پھر پاسپورٹ کے دفتر چلیں گے۔'' اس نے میرا ہاتھ دبایا اور موبائل جیب سے نکال کر شکور کا نمبر ملانے لگا۔

☆......☆......☆

پاسپورٹ کے دفتر میں بس آنا جانا ہوا۔ فیصل نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے، ہر کام جلد از جلد نمٹا لیا اور کہیں بھی بلاوجہ قطاروں میں کھڑا نہیں ہونا پڑا۔

ایک ہفتے بعد پاسپورٹ مل گئے اور یہ ایک ہفتہ بغیر کسی ہنگامے کے خیر خیریت سے گزر گیا۔ جب بھی دیکھتی کہ وہ معمول سے زیادہ شراب نوشی کر رہا ہے۔ اسی دن اس کے گلاس میں دو یا تین سلیپنگ پلز ڈال دیتی۔ وہ دنیا جہان سے بے گانہ ہو کر دن چڑھے تک سوتا

رہتا۔ پاسپورٹ مل گئے تو اس نے دو ٹکٹ او کے کروا لیے۔

جانے سے دو دن پہلے اس نے پھر سے کافی شاپنگ کروائی مجھے۔ وہ فروری کا ایک سہانا دن تھا۔ جب ہم دوبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے لیے یہ سب کچھ بہت نیا اور انوکھا تھا۔ لاہور کے علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے لے کر دوبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ تک، جابجا کئی حیرت کدے میرے منتظر تھے۔

☆......☆......☆

سب سے پہلا عجوبہ تو لاہور کے ایئرپورٹ پر ہی دیکھ لیا جہاں ایک چائنیز لڑکی اپنے ہمسفر کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، منی اسکرٹ پہنے ادھر سے ادھر گھوم رہی تھی۔ میری نظریں اس کی دودھیا سڈول ٹانگوں پر جم کر رہ گئیں۔ جدھر جدھر لڑکی جاتی، میری نظروں کا زاویہ بھی اس کے ساتھ ہی بدلتا رہا۔

مجھے یوں احمقوں کی طرح گھورتا دیکھ کر فیصل نے مجھے کہنی مار کر متوجہ کیا۔ میں ادھ کھلے منہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ایسے نظارے تمہیں ہر جگہ بار بار دیکھنے کو ملیں گے۔ خود پر کنٹرول رکھو۔ اگر کسی کو دیکھنا بھی ہو تو سرسری انداز میں دیکھتے ہیں۔ یوں پوری آنکھیں کھول کر ایک بندے کو، پلک جھپکائے بغیر ٹکٹکی لگا کر دیکھنا، مہذب دنیا میں بڑی معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ سمجھ گئی؟'' میں نے ہونقوں کی طرح من بھر کا سر اثبات میں ہلا دیا اور اس لڑکی کے سراپا سے نظر ہٹا لی۔ مگر چند لحوں بعد پھر سے بھٹکتی ہوئی نگاہ وہیں جا کر رکی۔

امیگریشن کے مراحل سے فارغ ہو کر اب سارے مسافر اندر لاؤنج میں کرسیوں پر بیٹھے اپنی فلائٹ کی روانگی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ لڑکی بھی ہمارے سامنے والی قطار میں بیٹھی تھی اور اپنے ساتھی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

میں بڑی حسرت سے ان کو پھر سے دیکھ رہی تھی۔ لڑکے نے میری محویت کو محسوس کیا اور لڑکی کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ وہ لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں جھینپ کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ اتنے میں ہماری فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ تمام مسافروں سے جہاز میں جا کر بیٹھنے کی درخواست کی جانے لگی۔

فیصل نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم اس دروازے کی طرف چلنے لگے۔ جہاں دوسری طرف پلین کھڑا تھا۔ وہ چائنیز جوڑا ابھی ہمارے آگے چل رہا تھا۔ جہاز کو دیکھنا اور اس میں بیٹھنا بھی میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ جب ہم اپنی سیٹوں پر نمبرز کے حساب سے بیٹھ چکے تو وہ چائنیز لڑکی اپنے ساتھی کے ہمراہ ہمارے برابر والی سیٹوں پر براجمان ہو چکی تھی۔ درمیان میں گزرنے کے لیے تنگ سا راستہ تھا۔ جہاں سے لوگ اور ایئر ہوسٹس وغیرہ گزر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب سب لوگ اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تو سیٹ بیلٹ باندھنے کا اعلان کیا جانے لگا۔ مجھے سیٹ بیلٹ باندھنا نہیں آتا تھا۔فیصل نے پہلے میری بیلٹ باندھی اور بعد میں اپنی۔ جہاز کے اڑان بھرنے کے تصور سے میری جان خطا ہو رہی تھی۔

''تم ڈر رہی ہو؟'' فیصل نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

''نہیں تو۔'' میں نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنے کی کوشش کی۔

اچانک پلین میں گھپ اندھیرا ہو گیا اور ساتھ ہی فلائٹ کے ٹیک آف کرنے کا اعلان ہونے لگا۔ اسی اثنا میں مجھے محسوس ہوا کہ جہاز نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا ہے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے فیصل کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

وہ اپنے بازو پر رکھے میرے ہاتھ کو تھپکنے لگا اور دوسرا بازو میرے کندھے پر رکھ کے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ سست روی سے رینگنے والا جہاز اب گولی کی اسپیڈ سے دوڑنے لگا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے زیر لب درود شریف پڑھنے لگی۔

سبک رفتاری سے دوڑتے ہوئے جہاز نے اچانک اپنا اگلا حصہ اٹھا کر فضا میں اڑان بھری تو ایک خفیف سا جھٹکا لگا تو میری ہلکی سی چیخ نکل گئی۔فیصل نے تنبیہہ بھرے انداز میں میرا کندھا دبایا تو میں شرمندہ سی ہو گئی۔ جب پلین اپنی مطلوبہ بلندی پر پہنچ گیا اور اس کا لیول ہموار ہو گیا تو جہاز کی لائٹس آن ہو گئیں۔

میں دائیں بائیں دیکھنے لگی۔۔ وہ چائنیز لڑکی اور اس کا ساتھی لڑکا میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میرا ڈر اور خوف ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہا تھا۔ وہ میری حالت سے پوری طرح محظوظ ہو رہے تھے۔ میں انہیں یوں مسکراتا دیکھ کر جھینپ گئی۔ فوراً فیصل سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

میری دائیں جانب فیصل جبکہ بائیں جانب ایک معمر شخص بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنے دبیز عدسوں کے پیچھے سے میری طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے تئیں دلیر بننے کی پوری کوشش کرنے لگی۔



ناول ''تہی دامن'' ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 5

اس کے بعد باقی سفر خیر وعافیت سے کٹ گیا۔دوبئی ائر پورٹ پر اترے تو، رنگ ونور کا ایک سیلاب امنڈا پڑ رہا تھا۔تیز جگماتی روشنیوں میں ہر چیز اجلی اور دلفریب دکھائی دے رہی تھی۔یہاں غیر ملکی خصوصا یورپین کی بہتات تھی۔غیر ملکی عورتوں کے مختصر پیراہن کے ساتھ بے باک انداز میں اچھل اچھل کر چلنا پھرنا، میرے لیے باعث حیرانی بلکہ پشیمانی تھا۔

ہوٹل میں پہنچے تو وہاں کچھ ایسا نظارہ دیکھا جس نے شاکڈ کر دیا۔فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئمنگ پول میں چند مرد اور خواتین اکٹھے ایک ساتھ سوئمنگ کر رہے تھے۔عورتوں نے سوئمنگ کاسٹیوم پہن رکھے تھے جو ان کے جسموں کو چھپانے کی بجائے مزید نمایاں کر رہے تھے۔

جب ہم پول کے پاس سے گزر رہے تھے۔ایک خاتون پول سے باہر نکل رہی تھی۔بلیک کلر کے کاسٹیوم میں اس کی سپید اور بے داغ جلد تیز روشنیوں میں مزید اجلی اور چمک دار دکھائی دے رہی تھی۔اسے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔دل چاہ رہا تھا کہ اپنے دوپٹے سے اس کے عریاں جسم کی عریانی کو ڈھک دوں اور اسے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ کر دوں۔مگر اس فتنہ مجسم کو اپنی عریانی کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں تھی۔

وہاں اسے میرے علاوہ گھور گھور کر دیکھنے والا بھی کوئی اور موجود نہ تھا۔سب اپنے آپ میں مگن اور مست تھے۔اس نے ایک سلیپنگ گاؤن پہنا اور اپنے ساتھی کے ساتھ ہنستی اور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ایک جانب چل دی۔

ہم اپنے روم میں آئے۔سامان رکھا۔کمرے کو لاک کیا اور ہوٹل کے ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔وہاں کھانا کھایا اور گھومنے کے لیے پاس ہی بنے شاپنگ مال میں گھس گئے۔فیصل نے شاپنگ کے لیے کہا مگر میں نے ضرورت نہ سمجھتے ہوئے انکار کر دیا۔پھر اس کے زیادہ اصرار کرنے پر چند کاسمیٹکس کی چیزیں خرید لیں۔رات کافی بھیگ چکی تھی۔

ہم نے اپنے ہوٹل کا رخ کیا۔اور سونے کیلئے بستر پر گر گئے۔فیصل نے پینے پلانے کا شغل کرنا چاہا مگر میں پیار اور کچھ منت سماجت سے اسے روکنے میں کامیاب رہی۔

اگلے دن ڈیزرٹ سفاری جانے کا پروگرام تھا۔وہ بھی میرے لیے ایک سنسنی خیز اور شاندار تجربہ تھا۔صحرا میں ریت اڑاتی اور ہچکولے کھاتی جیپ کی سواری کرنا اور صحرا کے بیچوں بیچ نصب خیموں میں ایک بہت بڑے اور شاندار خیمے میں ایک انتہائی خوبصورت رقاصہ کے بیلے ڈانس سے محظوظ ہونا۔یہ سب بہت انوکھا اور شاندار لگا مجھے۔

اگلے دن بیچ پر گئے۔جہاں کچھ مزید حیرت زدہ کرنے والے مناظر دکھائی دیئے۔ساحل سمندر کی ریت پر غیر ملکی اور غیر مسلم خواتین ٹو پیس بکنی پہنے آرام دہ حالت میں آنکھوں پر چشمے چڑھائے سکون فرما رہی تھیں جبکہ مرد بھی مختصر لباس زیب تن کیے وافر مقدار میں موجود تھے۔

مجھے جس منظر نے سب سے زیادہ مسحور کیا۔ وہ تھا ڈانسنگ فاؤنٹین کا نظارہ۔ رنگ برنگی ناچتی ہوئی روشنیوں کے ساتھ ساتھ محو رقص فوارے، بہت ہی روح افزا منظر پیش کرتے تھے۔

ایک ہفتے کے سٹے میں کوئی بھی ایسا قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ ہاں البتہ پاکستان واپسی پر کئی غیر معمولی حادثات و واقعات میری آمد کے منتظر تھے۔ سب سے پہلا دھماکہ تو فیصل نے میری گود میں چھ ماہ کے گوہر کو ڈال کر دیا۔

مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ دوبئی سے آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ میں اپنے موبائل فون پر گوہر کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ وہی گوہر جو بابر اور فوزیہ کا بچہ تھا۔ جسے ہمیشہ اپنے دل سے لگا کر رکھتی رہی۔ جس کی معصوم کلکاریوں کو دیکھ کر اپنے دکھ بھول جایا کرتی تھی۔ جس کے چاند چہرے میں اپنے گم گشتہ بچوں کے چہرے تلاشا کرتی تھی۔

گوہر کی تصاویر دیکھتے ہوئے کب آنکھیں نم ہوئیں اور پھر چھلکنے لگیں۔ قطعاً احساس نہ ہوا۔ وہ تو پیچھے کھڑے فیصل نے میرے ہاتھ سے فون اچک لیا تو ہوش میں آئی۔ اس کا یوں پیچھے کھڑے ہو کر میری تنہائی میں مخل ہونا اور پھر بلا میری اجازت کے میرے ہاتھ سے فون اچک لینا مجھے بہت ناگوار گزرا۔

میں اس کی طرف گھوم کر پلٹی اور فون واپس لینا چاہا تو اس نے فون والا ہاتھ مزید پیچھے کر لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم تو ایسے گھبرا رہی ہو، جیسے میں نے تمہارے کسی پرانے عاشق کی تصویر تمہارے ہاتھ سے چھین لی ہو۔ ویسے یہ بچہ کون ہے؟''

''یہ گوہر ہے۔'' میں آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ پھر سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''تمہارا بچہ ہے نا؟ ویسے بہت ہی پیارا بچہ ہے۔'' وہ بھی اب گوہر کی تصویر کو ستائش بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

''میرا نہیں تھا۔ مگر اپنی جان سے بڑھ کر پیارا تھا مجھے۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''تمہارا نہیں تھا؟ میں سمجھا نہیں۔ تو پھر کس کا بچہ ہے یہ؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ بابر کا بیٹا تھا۔ اسی کی حادثاتی موت ہی تو بابر سے علیحدگی کا باعث بنی تھی۔'' میں نے مغموم لہجے میں جواب دیا تو اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے فون ٹیبل پر رکھا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ پکڑا اور بولا۔

''بانو! اگر میں تمہیں تمہارا گوہر واپس لا دوں تو؟''

میں حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر یوں اس کی طرف دیکھنے لگی جیسے اس کی ذہنی حالت مشکوک ہو۔

''گوہر میرے سامنے چھت سے گر کر مر چکا ہے فیصل۔ اور جو مر جاتے ہیں وہ کبھی زندہ نہیں ہوتے۔ تم شاید میرے جذبات کا مذاق اڑانا چاہ رہے ہو۔'' میری آواز دکھ سے کپکپا رہی تھی۔

''نہیں میری جان! میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں تمہیں اولاد کی خوشی دینا چاہتا ہوں۔ ایسی خوشی جو کوئی تم سے چھین نہ سکے گا۔'' اس

کی گہری سنجیدگی نے مجھے چونک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

’’مگر کیسے؟ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی؟‘‘ میں اب بھی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

’’میں ابھی آتا ہوں، تھوڑی دیر تک، واپس آ کر تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔‘‘

وہ گھر سے باہر نکل گیا اور میں اس کے پیچھے اس بند دروازے کو کافی دیر تک تکتی رہی۔ جس کی آڑ یقیناً کوئی نیا بھید چھپائے بیٹھی تھی۔

دو گھنٹے انتظار اور تجسس کی سولی پر لٹکائے رکھنے کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں چھ سات ماہ کا ایک بہت ہی خوبصورت اور گول مٹول سا بچہ تھا۔ اس نے وہ بچہ میری گود میں ڈال دیا۔ میں جو ابھی تک لاؤنج میں اسی صوفے پر بت بنی بیٹھی تھی، بچے کو گود میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

’’کس کا ہے یہ بچہ؟ کہاں سے لائے اسے؟‘‘ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

’’یہ بچہ میرا ہے۔ اور اب یہ ہمیشہ یہیں رہے گا۔ ہمارے پاس۔‘‘ اس نے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

’’فیصل! میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔‘‘ میں نے اس مرتبہ قدرے سخت لہجہ اختیار کیا۔ ’’یہ بچہ جس کسی کا بھی ہے۔ اسے واپس دے آئیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرے جذبات کا مذاق اڑانے کے لیے اس معصوم جان کا استعمال کریں۔‘‘ میری آواز آنسوؤں سے رندھ گئی اور گود میں بیٹھا ہوا وہ بچہ بھی ہمکنے لگا۔ میں اس بچے کو بہلانے کے لیے اسے لیے کھڑی ہو گئی۔

’’میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ بچہ میرا ہے۔‘‘ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

’’اسکی ماں کہاں ہے؟‘‘ میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

’’وہ اس کو پیدا کرتے ہی دنیا چھوڑ گئی۔‘‘ اس نے افسردگی سے جواب دیا۔

’’مگر......تم اپنی خاندانی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کے بطن سے بچہ پیدا نہیں کر سکتے۔ یہی اصول اور قانون بتایا تھا مجھے۔ تو پھر یہ بچہ......؟‘‘ میں اب بچے کو اپنے کندھے سے لگائے تھپک رہی تھی۔

’’یہ اصول اس کی ماں کو بھی بتایا تھا بلکہ رٹایا تھا مگر کم ذات اور کم ظرف نکلی۔ بچہ پیدا کر کے، جائیداد ہتھیانے اور حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگی۔ جب تک مجھے اس کے مذموم مقاصد سے آگاہی ہوئی، تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ابارشن کا وقت گزر چکا تھا۔ یہ بچہ پیدا کرنا مجبوری ٹھہرا۔ سوچا تو یہی تھا کہ بچہ دنیا میں آئے گا تو کسی بے اولاد کی جھولی آباد کر کے اس کی ماں کو دھکے دے کر اپنی زندگی سے نکال باہر کروں گا مگر قدرت کی مہربانی سے مجھے یہ قدم اٹھانے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ اسے پیدا کرتے ہی کچھ گھنٹوں کے اندر اندر چل بسی۔‘‘

اس نے بات مکمل کر کے گہری سانس لی اور ایک ٹانگ کے اوپر دوسری ٹانگ رکھ لی۔

میں جو تھوڑی دیر پہلے تک اس کی ہر بات کو غیر سنجیدگی سے لے رہی تھی، اس کی مفصل اور مدلل وضاحت سن کر یقین کیے بغیر چارہ نہ رہا۔

کندھے سے لگا بچہ بے حس و حرکت محسوس ہونے پر اندازہ لگایا کہ وہ سو چکا ہے۔ میں اپنے بیڈ روم میں گئی۔ بچے کو آہستگی کے ساتھ خود سے الگ کیا۔ بیڈ پر لٹا کر اس کے اوپر کمبل اوڑھا کر پھر سے باہر چلی آئی۔ فیصل ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں پھر سے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

''فیصل! یہ اتنا بڑا بھید مجھ سے کیوں چھپائے رکھا؟ دیکھو، اگر تم مجھ سے کوئی مذاق کر رہے ہو تو پلیز۔ مجھ میں اب ایسا کوئی بھی مذاق سہنے کی سکت نہیں رہی۔ پہلے بھی کسی کے بچے کو جان سے زیادہ پیار کیا۔ مگر......'' میں سسکنے لگی۔

''میں مانتا ہوں۔ بہت برا ہوں۔ مجھ میں ہزاروں برائیاں ہیں مگر ان ہزاروں برائیوں کے درمیان ایک اچھائی بھی موجود ہے۔ اور وہ اچھائی یہ ہے کہ میں جھوٹ بہت کم بولتا ہوں۔ بلا مقصد اور بنا کسی ٹھوس جواز کے تو بالکل نہیں۔ تمہارے سامنے جتنی بھی باتیں کی ہیں سچی کی ہیں۔ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔''

''ہمم! یہ بچہ اب تک کہاں تھا؟''

''یہ میری ایک پرانی ملازمہ کے پاس بطور امانت رہ رہا تھا۔ اسے ایک خطیر رقم اس کی نگہداشت اور خوراک کی مد میں پہنچاتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ہفتے میں ایک دو چکر خود بھی لگاتا تھا۔''

''مگر......تم نے تو اس بچے کو پیدائش کے بعد کسی بے اولاد جوڑے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا نا؟'' میرے ذہن میں اچانک آنے والے خیال نے الفاظ کا روپ دھارا۔

''ہاں سوچا تو یہی تھا مگر جب نرس نے اسے سفید تولیے میں لپیٹ کر میرے حوالے کیا تو خود سے جدا کرنے کی ہمت نہ کر پایا۔ خون کی کشش نے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے بچے کو خود پالنے کا فیصلہ کر لیا۔'' اس نے متانت سے جواب دیا تو میں کچھ دیر خاموش بیٹھی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

''مگر آپ نے تو کہا تھا کہ میں نہ تو کسی دوسری عورت سے نکاح کر سکتا ہوں اور نہ ہی کسی دوسری عورت سے اولاد پیدا کر سکتا ہوں۔ ان باتوں کو مدنظر رکھیں تو آپ نے اپنے خاندان کے بنائے ہوئے دونوں قوانین توڑ دیئے۔ نکاح بھی کر لیا اور اولاد بھی پیدا کر لی۔'' میری نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں اور وہ سگریٹ کے دھوئیں میں سے نجانے کون سی شبیہہ تراش رہا تھا۔

''جانتا ہوں۔ بڑے بزرگوں کے بنائے ہوئے قوانین توڑ کر غداری کا مرتکب ٹھہرا ہوں مگر پہلے قانون کی خلاف ورزی ہونے

کے بعد، دوسری روگردانی لازم تھی۔ میں اپنے بچے کیلئے کسی نیک اور شریف عورت کو اس کی ماں کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ جو بغیر کسی غرض یا لالچ کے اسے اپنی اولاد کی طرح پالتی۔''

''مگر آپ کو اس بات کا یقین کیوں ہے کہ میں اس کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک نہیں کروں گی اور اس کی اپنی اولاد کی طرح ہی پرورش کروں گی؟'' میں نے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے ایک تیکھا سوال کیا۔

''اس بات کا اتنا ہی یقین ہے۔ جتنا اپنی موت کا۔'' وہ مسکرایا۔'' بانو! تم بہت اچھی عورت ہو۔ بہت نرم دل اور نیک فطرت۔ تم کسی کے ساتھ برا کر ہی نہیں سکتی۔ اور پھر اولاد کی خوشیوں کو ترسی ہوئی مامتا، کیسے ایک معصوم بچے سے کوئی زیادتی کر سکتی ہے۔''

''اب میں سمجھی کہ تم نے میری نکاح والی شرط، اتنی آسانی سے کیوں مان لی تھی۔ تو اس کے پیچھے یہ ریزن کارفرما تھا۔''

''ہاں! بالکل صحیح سمجھی ہو۔ مجھے اپنے بچے کے لیے ہر صورت تمہاری گود ہی چاہیے تھی۔ اور اس کے لیے مجھے تمہاری ہر شرط بھی ماننا منظور تھی۔'' وہ اب آنکھوں میں شرارت بھرے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ بچہ مجھے مالکانہ حقوق کے ساتھ مل رہا ہے۔ کل کلاں کو تم مجھ سے چھین کر مجھے گھر سے باہر نکال کر دو تو......؟'' میں اپنے تئیں بڑی دور کی کوڑی لائی۔ میری بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ میں اسے یوں دیوانوں کی طرح قہقہے لگا تا دیکھ کر خفت سی محسوس کرنے لگی۔

''میری بھولی بانو! تم جتنی بھی کوشش کر لو چالاک بننے کی۔ مگر ہمیشہ بھولی ہی رہو گی۔ اور اسی بھولپن پہ تو ہم مر مٹے ہیں۔'' اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کے سر کو جھکایا تو میں جھنجھلا کر بولی۔

''میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔ مجھے میری بات کا جواب چاہیے۔''

''ریلیکس مائی ڈیئر! پہلی بات تو یہ کہ تم میری قانونی اور شرعی بیوی ہو۔ اور اس بچے کے برتھ سرٹیفکیٹ میں بحیثیت ماں تمہارے نام کا ہی اندراج ہو گا۔ اور دوسری بات یہ کہ یہ ڈیڑھ دو کروڑ کی مالیت کا فلیٹ تمہارے نام ہے۔ جب چاہو مجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال سکتی ہو۔''

اس کے دلائل سن کر میرے سر سے گویا کوئی بوجھ اتر گیا۔ اپنا آپ ایکدم ارفع واعلیٰ سا محسوس ہونے لگا۔ میں مسکرانے لگی۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگا۔

''میرے بیٹے کا نام کیا ہے؟'' میرے لہجے سے ایک انوکھا تفاخر جھلکنے لگا۔

''جو تم رکھنا چاہو۔ میں نے ابھی اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔'' اس نے بڑی لگاوٹ سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں اپنے بیٹے کا نام ''گوہر'' رکھوں گی۔ یہ میرا گوہر ہو گا۔ اس کو مجھ سے کبھی کوئی چھین نہ سکے گا۔'' شدت جذبات

سے میری آواز بھرا گئی۔

''اوکے! ایک دو دن میں ہی اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بنواتا ہوں۔''

اتنے میں بچے کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں بے تابی سے یہ کہتے ہوئے اندر کی طرف لپکی۔

''لگتا ہے گوہر جاگ گیا۔''

☆......☆......☆

شام تک ''گوہر'' مجھ سے کسی حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ مجھے تو اس کے روپ میں جیسے جینے کی وجہ مل گئی تھی۔ بار بار اس کا چہرہ چومتی اور سینے سے لگا لیتی۔ فیصل میری وارفتگی دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے فیصل کے ہاتھ میں گوہر سے متعلقہ چیزوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھما دی۔ جس پر اس کے لیے خشک دودھ، دلیا، فیڈر اور ملبوسات کے علاوہ چند دوسری چیزوں کے نام درج تھے۔

اب میری مصروفیت میں گونا گوں اضافہ ہو چکا تھا۔ میں جو فیصل کے جانے کے بعد سارا سارا دن بولائی بولائی پورے فلیٹ میں چکراتی رہتی تھی۔ اب گوہر کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ وقت گذرنے کا مطلق احساس نہ ہوتا۔

وہ بے حد خوبصورت اور ہنس مکھ بچہ تھا۔ جب مسکراتا تو اس کے گال پہ پڑنے والا ننھا سا ڈمپل بھی مسکرانے لگتا۔ بلاشبہ اس کے چہرے میں فیصل کے نقوش کی واضح جھلک دکھائی دیتی تھی۔

زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگی اور اس سے سارے گلے شکوے بھی جیسے یک لخت ختم ہو گئے۔ گوہر کے آنے کے بعد اب فیصل کے رویئے میں بھی ایک واضح بدلاؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اب میں اس کے لیے صرف ایک عیاشی کا ذریعہ نہیں رہی تھی بلکہ اس کے بچے کی ماں ہونے کے ناطے ایک بارعب اور قابل احترام حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

اگلے چند دنوں کے اندر اندر اس نے گوہر کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی تیار کروا لیا جس کی رو سے میں گوہر کی حقیقی ماں ثابت ہو رہی تھی۔ جس دن اس کی پیدائش پرچی بن کر آئی، فیصل نے وہ سلپ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو پڑھو اپنے بیٹے کا برتھ سرٹیفیکیٹ۔ اس کی رو سے تم اس کی قانونی ماں بن چکی ہو۔ اب میں بھی اسے تم سے چھین نہیں سکتا۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔

میں جو گوہر کو گود میں لٹائے اس سے لاڈ کر رہی تھی، وہ سلپ پکڑ لی اور مسکراتے ہوئے فیصل کا شکریہ ادا کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے آج تک مجھے جتنی بھی اذیتیں دی تھیں۔ اس سے کہیں بڑھ کر خوشیاں اور آسائشیں بھی میری جھولی میں ڈال دی تھیں۔ اب مجھے اس سے کوئی بھی شکوہ نہ رہا تھا۔

آج رات کو بھی سونے کے لیے لیٹے تو فیصل نے آنکھوں میں پیار بھر کے پوچھا۔

''بانو! اب خوش ہونا؟''

وہ اپنا چہرہ کہنی پر ٹکائے بڑی محویت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک نظر بیڈ کے پاس رکھے ہوئے بے بی کاٹ پر ڈالی، جہاں ننھا گوہر کمبل اوڑھے پرسکون نیند کے مزے لے رہا تھا اور پھر فیصل کی طرف دیکھ کر بڑی لگاوٹ سے جواب دیا۔

''ہاں، اب میں بہت خوش ہوں کیونکہ اب میں بے اولاد اور بانجھ نہیں رہی۔ تم نے گوہر کی شکل میں ایک قیمتی لعل میری گود میں ڈال کر بہت بڑا احسان کر دیا مجھ پر۔ مجھے زندہ رہنے کا ایک مضبوط جواز فراہم کر دیا۔ اس کے لیے جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گال پر رکھ لیا۔

''تمہیں گوہر کی صورت میں بڑھاپے کا سہارا مل گیا اور گوہر کو تمہاری شکل میں ایک شفیق ماں مل گئی۔ میرے سر سے بھی گویا بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔''

''مگر ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' میں نے اپنا رخ اس کی طرف پھیر لیا۔

''کیا؟''

''سرکاری اندراج کے مطابق گوہر چند دن پہلے دنیا میں تشریف لایا ہے۔ یعنی تھوڑے دن پہلے پیدا ہوا ہے جبکہ ہماری شادی کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے ہیں۔ جبکہ بچے کو پیدا ہونے کے لیے شادی کے بعد کم از کم بھی نو دس ماہ کا وقت تو چاہیے ہی ہوتا ہے۔''

میری بات سن کر وہ مسکرانے لگا۔

''یہ پوائنٹ میرے ذہن میں بھی موجود تھا اس لیے اس کی منصوبہ بندی پہلے سے کر لی تھی۔ تم نے شاید اپنا نکاح نامہ غور سے دیکھا نہیں۔ اس پر نکاح کی تاریخ ایک سال پیچھے کر کے لکھوائی تھی میں نے۔''

اس کی بات سن کر میں بھونچکی رہ گئی۔

''کس قدر شاطر ذہن رکھتے ہو تم۔ یعنی سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت کرتے رہے۔ مجھ سے نکاح کرتے وقت یہ سب کچھ تمہارے ذہن میں پہلے سے موجود تھا؟''

''ہاں نا۔ میری جان! میں ٹھہرا ایک سیاستدان۔ منصوبہ سازی اور شاطرانہ چالیں تو میری گھٹی میں بھری پڑی ہیں۔'' وہ ہلکی آواز میں ہنسنے لگا مگر مجھے اس وقت اس کی ہنسی سے کچھ خطرہ سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔

''کیا ہوا؟'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ نیند آ رہی ہے۔'' میں نے بہانہ تراشا۔

''چلو ٹھیک ہے میڈم! ویسے ایک بات میں محسوس کر رہا ہوں کافی دنوں سے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''کیا؟''میں نے مڑے بغیر پوچھا۔

''تم بدل گئی ہو یار۔اب میری بیوی کم اور گوہر کی ماں زیادہ نظر آتی ہو۔''اس نے دبا دبا احتجاج کیا جسے سن کر میں مسکرانے لگی۔

''اچھا اس وقت تو بڑے زوروں کی نیند آرہی ہے۔کل آپ کے احتجاج پر غور کروں گی۔''

''اگر آج کرلو تو؟''اس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

''نہیں،آج تو میں غور کرنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں ہوں۔دماغ پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔''میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پیچھے ہو کر لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

گوہر کو لے کر ہوسٹل گئی۔میڈم فرح اور شبانہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ساری کہانی سن کر شاکڈ رہ گئیں دونوں۔فیصل کی دوراندیشی اور چالاکی نے انہیں بھی مبہوت کر دیا۔میں میڈم کے بیڈروم میں اس کے بیڈ پر بیٹھی تھی۔میڈم آج ناسازی طبیعت کی وجہ سے آفس نہیں گئی تھی۔شبانہ کو بھی آج جمعہ کی چھٹی تھی۔اسے بھی یہیں بلا لیا تھا۔

میں اور شبانہ گوہر کو سامنے بٹھائے اس سے لاڈ کر رہی تھیں جبکہ میڈم بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بڑی محبت اور لگاوٹ سے گوہر کو تک رہی تھی۔

''ماشاللہ۔بہت پیارا بچہ ہے۔''وہ لہجے میں شفقت سمو کر بولی۔

''آخر بیٹا کس کا ہے؟''میں نے اترا کر پوچھا تو وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

''چل بانو!اب تو تمہاری زندگی میں کوئی خلا باقی نہیں رہا۔اللہ تجھے یونہی شاد و آباد رکھے۔''

''آمین۔''شبانہ نے صدق دل سے دعا دی تو میں نے اور میڈم نے بیک آواز میں آمین کہا۔

''تم سناؤ!کب کر رہی ہو سپروائزر ریاض کے ساتھ شادی؟''میں نے شرارت بھرے انداز میں پوچھا تو مسکرا کر بولی۔

''اگلے ماہ کی چودہ تاریخ کو۔''

''اچھا جی!مجھے بلاؤ گی نا،اپنی شادی پر؟''

''شادی کیسی یار؟بس سر چھپانے کا آسرا کرنے جا رہی ہوں۔''اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔''سادگی سے نکاح ہوگا۔''

''مگر میں تمہارے نکاح میں شامل ہونا چاہوں گی شبانہ۔''میں نے زور دے کر کہا۔

''او کے میری جان!آجانا۔اگر تمہارے چودھری کو اعتراض نہ ہوا تو......''

''اعتراض سے یاد آیا بانو......آج تو چودھری سے اجازت لے کر آئی تھی نا؟''میڈم نے پرتشویش لہجے میں استفسار کیا۔

''جی میڈم! ابھی پہلا تجربہ بھولی نہیں تھی۔ با قاعدہ اجازت لے آئی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے میڈم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔ میری بات سن کر میڈم کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

''بانو! کبھی پہلے بچے یاد نہیں آئے؟'' شبانہ کے اچانک پوچھے جانے سوال نے مجھے گنگ کر دیا۔ آنکھوں کے سامنے شیراز اور ارباز کے چہرے گھومنے لگے۔ دل جیسے ایک دم کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

''آتے ہیں یاد...... بہت آتے ہیں۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''دل نہیں چاہتا ان سے ملنے کو؟'' اس نے اگلا سوال داغ دیا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں کے نم گوشے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''دل چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جانتی ہوں کہ یہ ممکن نہیں تو دل کو جھوٹی تسلیاں بھی نہیں دیتی۔ لیکن جب کبھی زندگی نے موقع دیا تو اپنے جگر گوشوں کو ملنے ضرور جاؤں گی۔'' میرے لہجے میں چٹانوں کا سا عزم در آیا۔

''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔'' شبانہ نے زیرِ لب دعا دی۔

تھوڑا وقت ان کے ساتھ گزار کر اور دوپہر کا کھانا ان کے ہمراہ کھا کر واپس گھر آ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے لیے اب میڈم کا یہ ہوسٹل ہی میکہ تھا۔

☆......☆......☆

رات کو سونے کے لیے لیٹے تو آج بہت دنوں کے بعد فیصل اپنی پرانی جون میں دکھائی دیا۔ گوہر کے سونے کے بعد اس نے مجھے شراب لانے اور نائٹی پہننے کا حکم دیا۔ میں نے اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو گھبرا گئی۔ میں جو دل میں سوچ رہی تھی کہ اب گوہر کے آنے سے فیصل بدل چکا ہے، میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ اس کی فرمائشیں میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجانے لگیں۔

''شراب پی کر کیا کرنا آپ نے۔ اب تو بہت کم پیتے ہیں نا۔'' میں نے لگاوٹ سے اترا کر کہا تو وہ بولا۔

''تمہیں شروع دن سے بتا چکا ہوں کہ میری دو کمزوریاں ہیں۔ ایک شراب اور دوسری عورت۔ ان دونوں کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میرے حکم سے روگردانی کرنے کا مت سوچا کرو۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے انکار کا تم پر کیا سائیڈ ایفیکٹ ہوتا ہے؟'' اس نے مونچھ کو تاؤ دیا تو مجھے گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ دل چاہا اپنی عقل پر ماتم کروں کیونکہ پچھلی نیند کی گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میڈم سے نئی کھیپ لانا یاد نہیں رہا تھا حالانکہ گھر سے یہ بات ذہن نشین کر کے گئی تھی کہ میڈم سے مزید سلیپنگ پلز لانی ہیں مگر وہاں جا کر باتوں میں کچھ ایسی مصروف ہوئی کہ یہ بات ذہن سے بالکل محو ہو گئی۔

اب جب مصیبت سر پہ منڈلانے لگی تو اپنی کوتاہی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ شراب پی کر فیصل ایک ایسے درندے کا

روپ اختیار کر لیتا تھا جو اپنے ہی سدھانے والے کو کاٹ کھا لینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بچاؤ کی خاطر ایک کمزور سی کوشش کرنا چاہی۔

''دیکھو فیصل! اب تو ہمارا بچہ بھی ہمارے ساتھ ایک کمرے میں سوتا ہے۔ اب تمہیں اپنی پرانی روش کو ترک کر دینا چاہیے۔'' میں نے پیار بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی جہاں اس وقت خباثت رقصاں تھی۔

''میں تجھے بارہا یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ مجھے بیوی کی ضرورت نہیں ہے۔ بیوی میرے پاس آل ریڈی موجود ہے۔ تم صرف محبوبہ بن کر رہا کرو میرے سامنے۔ باقی رہی گوہر کی بات تو یہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اس کی فکر مت کرو۔ ابھی اسے کسی بات کی سمجھ نہیں۔ اور سمجھ آنے سے پہلے ہی اس کے لیے الگ کمرہ تیار کروا دوں گا۔ اور ویسے بھی میں نے اپنی عیش وعشرت میں کبھی اپنی اولاد کو اپنے پیروں کی بیڑی نہیں بننے دیا۔ اب تم بھی یہ بہانے بازیاں بند کرو اور میرے حکم کی فوری تعمیل کرو۔'' آخری فقرہ اس نے قدرے تمکنت سے ادا کیا تھا۔

میں مرے مرے قدموں سے وارڈ روب کے سامنے گئی۔ ایک نائٹی کھینچی۔ نائٹی پہن کر ہاتھ میں ایک وہسکی کی بوتل اٹھائے واپس کمرے میں آئی تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ کے سوٹے لگا رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ آج میرا موڈ وہسکی پینے کو کر رہا ہے؟ شاید اسے ہی کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

میں نے بوتل اس کے پاس پڑی تپائی پر رکھی اور خود کچن سے گلاس اور برف لینے کے لیے چل پڑی۔ گوہر کی کاٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک نظر اس کے صبیح چہرے پر ڈالی اور کمرے سے باہر آ گئی۔ اب کچن میں کھڑی پھر سے اس عفریت سے چھٹکارہ پانے کا کوئی حل سوچ رہی تھی۔

''کاش فیصل، تم میں یہ خرابی نہ ہوتی تو تم اچھے بھلے قابل برداشت اور معقول انسان ہو۔''

میں نے ٹرے میں دو گلاس رکھے۔ آئس کیوبز کا باؤل ساتھ رکھا اور بیڈروم میں چلی آئی۔ ایک پیگ تیار کر کے اس کی طرف بڑھایا۔

''تم اپنا پیگ تیار کر کے میرے ساتھ پیو نا۔'' اس نے گلاس میرے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اگلی فرمائش کی۔

''میرا آج موڈ نہیں پینے کا۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

''بالکل نہیں! آج تمہارا کوئی عذر نہیں سنوں گا۔ اور ویسے بھی موقع بھی ہے، دستور بھی ہے اور رسم دنیا بھی ہے۔'' اس نے پھر سے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا اور ایک ہی سانس میں گلاس چڑھا گیا۔

''چلو شاباش! اب دو جام ایک ساتھ تیار کرو۔''

میں نے دو جام تیار کیے۔ ایک اسے پکڑایا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ بھرا۔ اب شراب میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ کئی بار فیصل کی ضد کے سامنے ہار مانتے ہوئے پی چکی تھی مگر ابھی تک اس کے ذائقے اور کڑواہٹ سے دوستی نہ ہو سکی تھی۔ اب بھی بحالت مجبوری یہ آتشیں سیال چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے حلق سے اتار رہی تھی۔

میں نے ابھی آدھا گلاس بھی ختم نہیں کیا تھا کہ اس نے دوسرا ختم کر لیا۔گلاس ختم کرتے ہی اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔میں بمشکل اپنا گلاس ٹیبل پر رکھ پائی۔اس کے بعد اس پر وحشت اور درندگی کا دورہ پڑ گیا۔میری بھرپور مزاحمت کے باوجود اس نے مجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔ساتھ زبان سے مغلظات کا ایک طوفان بھی برپا تھا۔

"دو ٹکے کی عورت تو کیا سمجھتی ہے کہ نکاح کرنے سے تیری حیثیت بدل جائے گی۔تو داشتہ کی بجائے کوئی مہارانی بن جائے گی مگر یہ کیوں بھول گئی کہ تم میرے لیے ایک داشتہ ہی ہو۔دو کلمے پڑھ لینے سے تمہاری حیثیت تھوڑی بدل جانی۔" وہ مجھے بھنبھوڑتے ہوئے جتنا زہر میرے کانوں میں انڈیل سکتا تھا۔ اتنا انڈیلتا رہا۔ پھر وہ نڈھال اور مدہوش ہو کر گر گیا تو میں نے اپنا ریزہ ریزہ وجود سمیٹا اور ڈریسنگ روم کے قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

جسم اور چہرے پر جا بجا کاٹنے اور نوچنے کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔زیریں ہونٹ کے ایک گوشے سے خون رس رہا تھا۔میں نے نائٹی اتار کر نفرت سے دور پھینکی اور اپنا لباس پہن کر بیڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔تھوڑی دیر بے سدھ سوئے ہوئے فیصل کو نفرت سے دیکھتی رہی۔

میرا پورا جسم اس وقت ایک جوار بھاٹا کی مانند دہک رہا تھا۔پھر بیڈ پر لیٹ گئی مگر نیند کے آنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔چت لیٹی چھت کو گھورتی رہی اور آئندہ کے لیے ایک لائحہ عمل دماغ میں ترتیب دینے لگی۔

بہت بن چکی مردوں کے ہاتھ کا کھلونا۔اب مجھے اپنی بقا اور عزت نفس کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھانا ہوگا۔ اب میں ایک کمزور عورت بن کے زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔جو ہمیشہ سمجھوتوں کے سامنے اپنا سر جھکاتی آئی تھی۔سوچتی رہی اور سلگتی رہی۔

اب مجھے ایک نیا جنم لینا ہوگا۔اس کمزور اور روتی بسورتی بانو کو کہیں دفن کرنا ہوگا۔میں ایک انتہائی فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئی مگر یہ اطمینان بھی مجھے نیند کی وادی تک پہنچانے میں ناکام رہا۔تھوڑی دیر بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

پاس سوئے ہوئے فیصل پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر سے الماری کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔اس کا پٹ کھولا۔اندرونی دراز کھینچا تو اس کے اندر رکھا ریوالور نظروں کے سامنے آ گیا۔میں نے کانپتے ہاتھوں سے ریوالور اٹھایا۔گولیوں سے بھری میگزین اس کے اندر موجود تھی۔اسے اٹھائے باہر آ گئی۔

فیصل کے پاس آ کر اس کے سینے کا نشانہ لیا۔میرا ہاتھ کانپ رہا تھا اور جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔میں آج اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھی۔چند لمحے کانپتے ہاتھوں سے ریوالور پکڑے کھڑی رہی۔پھر کچھ سوچ کر ہاتھ نیچے کر لیا اور اسے جا کر اپنے کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔

☆......☆......☆

میں لاؤنج کے صوفے پر قدرے مطمئن انداز میں بیٹھی فیصل کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب انسان الجھنوں کی منجدھار میں چکراتے چکراتے کسی کنارے کے ساتھ آ لگتا ہے تو شاید ایسے ہی پرسکون اور بے فکر سا ہو جاتا ہے۔ جیسا اطمینان اس وقت میں محسوس کر رہی تھی۔

سامنے لگا دیوار گیر کلاک صبح کے دس بجا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فیصل اس وقت تک بیدار ہو چکا ہوگا اور شاید واش روم میں بھی جا چکا ہوگا کیونکہ اسے گیارہ بجے تک فیکٹری پہنچنا ہوتا تھا۔

میں نے ایک نظر فرش پر بیٹھے گوہر پر ڈالی جو اپنے آگے رکھے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ اور پھر سے آنے والے وقت کا سوچنے لگی۔ جو انتہائی قدم میں اٹھانے جا رہی تھی۔ اس کے متوقع اثرات پر نظر ثانی کرنے لگی۔ میں اس وقت اس سمندر کی مانند پرسکون تھی جو اپنے جلو میں بہت بڑا طوفان چھپائے شانت دکھائی دیتا ہے۔

میری نظریں پھر سے بیڈروم کے دروازے پر مرکوز ہو گئیں۔ جو کسی بھی وقت کھل سکتا تھا اور جہاں سے کسی بھی وقت فیصل کی آمد متوقع تھی۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ باہر آتا دکھائی دیا۔ میں چوکس ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ نہا دھو کر اجلا کاٹن کا سوٹ پہنے بڑا فریش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف ہی آ رہا تھا۔

''رک جاؤ! میرے قریب مت آنا۔'' میری آواز اس وقت کسی زہریلے سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔ وہ میرا رویہ دیکھ کر ٹھٹک کے رک گیا۔

''سوری بانو! رات کو پھر سے شاید میں اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھا تھا۔'' اس نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔

''ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر چلے جاؤ۔'' میرا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔ اسے شاید اپنے کانوں پر یقین نہ آیا پھر سے دہرا کر پوچھنے لگا۔

''کیا کہہ رہی بانو؟ کہہ دیا نا سوری۔ غصہ تھوک دو نا یار۔ آئندہ ایسی کوئی بھی کمینگی دکھاؤں تو جو چور کی سزا وہ میری۔'' اس نے پھر سے قدم آگے بڑھایا۔

مجھے اس ساری صورت حال کا اندازہ پہلے سے تھا اور اس سے نمٹنے کے لیے بھی بالکل تیار تھی۔ میں نے اپنے پہلو میں، کشن کے نیچے رکھا ہوا ریوالور نکال کر اس پر تان لیا۔

''ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' میرا لہجہ بدستور زہر انگیز تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کے قدم اچانک تھم گئے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''یہ گن تم نے کہاں سے لی؟ پلیز اسے ہاتھ سے رکھ دو۔ لوڈڈ ہے۔ چل جائے گی۔'' وہ منت سماجت کرنے لگا۔

مگر مجھے اس کی ایکٹنگ بلکہ اوور ایکٹنگ سے انتہا درجے کی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔اس کا وجود اب میرے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا اور اسی نفرت نے مجھ سے یہ انتہائی قدم اٹھوانے کی قوت بھی مہیا کر دی تھی۔

میں نے سنا تھا کہ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے مگر آج اندازہ ہوا کہ نفرت میں محبت سے بھی کہیں زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ایک چیونٹی بھی نفرت کی انتہا پر جا کر ایک ہاتھی سے ٹکر لینے کے متعلق سوچنے لگتی ہے۔

''یار یہ کھلونا نہیں ہے۔سچ مچ کا ہے۔گولی چل جائے گی۔لاؤ مجھے دو۔''اس نے پھر سے آگے آنے کے لیے قدم اٹھانا چاہا تو میں نے اس کے ساتھ ہی ایک سائیڈ پہ رکھے ہوئے چینی کے قدآور گلدان کو گولی سے اڑا دیا۔

ایک زوردار دھماکہ ہوا۔فائر کی مہیب آواز فلیٹ میں گونج اٹھی۔ایک لمحے کے لیے میں بھی کانپ گئی مگر خود کو مضبوط کیے اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

گلدان کے پرخچے اڑ کر اس کے جسم پر لگے تو وہ رک گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر کانوں کے پاس لے گیا۔دھماکے کی آواز سن کر گوہر بھی دہشت زدہ ہو کر رونے لگا۔فیصل اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف لپکا تو میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کر لیا اور غرا کر بولی۔

''خبردار!اسے ہاتھ مت لگانا۔''

وہ اپنی جگہ پہ رک گیا اور پھر سے ہاتھ اٹھا لیے۔

''کیا چاہتی ہو؟''اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''تم سے علیحدگی۔''میں نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔''کیونکہ مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہو چکی ہے۔ایک منٹ بھی تمہارا یہ کریہہ وجود برداشت نہیں کر سکتی۔یہ گھر میرے نام ہے۔اس لیے میں یہاں سے نہیں نکلوں گی بلکہ تم نکلو گے۔''میں نے پستول سیدھی کر کے اس کا نشانہ باندھا تو فٹ سے بول اٹھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔میں جا رہا ہوں۔اس کو نیچے کر لو۔اس وقت تمہارا دماغ ہل گیا ہے۔تم یقیناً اپنے حواس میں نہیں ہو''

''جلدی نکلو۔اور دوبارہ کبھی ادھر کا رخ مت کرنا۔''میں پھنکاری تو وہ دروازے کی طرف چلنے لگا۔بیرونی دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور پلٹے بغیر بولا۔

''اپنا اور گوہر کا بہت خیال رکھنا۔شکور گاڑی سمیت نیچے ہر وقت موجود رہا کرے گا۔کسی چیز کی ضرورت پڑے اس سے منگوا لیا کرنا۔''

''اوکے۔''میرے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ڈرامے باز کہیں کا۔''میں زیر لب بڑبڑائی اور بلند آواز میں بولی۔

''خدا حافظ چودھری فیصل۔''

وہ بنا جواب دیئے باہر نکل گیا اور میں تقریبا دوڑتے ہوئے، دروازے کے پاس گئی اور اسے اندر سے لاک کر دیا۔

تھوڑی دیر دروازے کی پشت سے کمر ٹکائے گہرے سانس لیتی رہی پھر دیوانہ وار روتے ہوئے گوہر کی طرف لپکی۔ اسے بہلا پھسلا کر چپ کرایا اور اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے گئی۔ اسے زمین پر بٹھا کر اس کے آگے کھلونے رکھے۔ وہ کھیلنے لگا تو لاؤنج میں رکھی گن اٹھا کر اندر لائی۔ گولیوں سے بھری میگزین باہر نکالی۔ الماری کھولی اسے بحفاظت دراز میں رکھا اور دراز بند کر دیا۔

اچانک نظر شیشے کے شوکیس میں رکھی رنگ برنگی شراب کی بوتلوں پر پڑی تو آتش غضب مزید بھڑک اٹھی۔

''یہ شراب پی کر ہی فیصل درندے کا روپ دھارتا ہے نا۔ میں آج یہ قصہ ہی ختم کر دوں گی۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔''

میں نے شوکیس کا ڈور دھکیلا اور شراب کی بوتلیں نکال نکال کر واش روم کے اندر بنے کموڈ میں انڈیلنے لگی۔ دس پندرہ منٹ کے اندر ساری بوتلیں خالی ہو کر فرش پر پڑی تھیں۔ میرے ذہن میں اچانک گوہر کا خیال آیا تو میں باہر آ گئی۔

باررو م سے باہر آئی۔ گوہر ابھی تک کھلونوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھ کر اس سے کھیلنے لگی۔ اس سے توتلی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ شاید اپنی توجہ بٹانا چاہ رہی تھی مگر دل میں کئی اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔

جو سلوک میں نے فیصل کے ساتھ کیا تھا، کیا وہ چپ چاپ سہہ جائے گا؟ کوئی جوابی کارروائی نہیں کرے گا؟ اور اگر کرے گا تو کس حد تک جائے گا؟۔ ایسے ہی ان گنت سوالات دماغ کو پریشان کر رہے تھے۔

جوش اور غصے میں آ کر میں نے اسے اسلحہ کے زور پر ایک بار گھر سے باہر نکال تو دیا تھا مگر یہ بات بھی بخوبی جانتی تھی کہ اس جیسے زور آور اور دولت مند انسان کے لیے میں ایک چیونٹی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ میرے جیسے لوگوں کو وہ ایک مکھی کی طرح مسل سکتا تھا۔

جوش اترا تو اب کئی اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کمان سے نکلا تیر واپس کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور اپنے لیے ناشتہ تیار کر کے ساتھ چائے کا مگ بنا لیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد گوہر کو فیڈر دودھ کا پلایا تو وہ دودھ پی کر سو گیا۔ اسے بیڈ پر لٹا کر اوپر کمبل اوڑھا دیا اور خود اس کے پاس بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے سوچوں کے تانے بانے بننے لگی۔

جو میں نے فیصل کے ساتھ کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مجھے جوابی وار کے لیے خود کو ذہنی طور پہ تیار رکھنا چاہیے۔ اچانک میڈم کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ ایک زمانہ شناس اور زیرک عورت ہے۔ یقیناً ہمیشہ کی طرح اس معاملے میں بھی رہنمائی کرے گی۔ میں نے پاس رکھا ہوا اپنا سیل فون اٹھایا اور میڈم کا نمبر ملانے لگی۔

میڈم نے فون اٹھایا تو میں نے منتشر لہجے میں بات شروع کی۔

ہیلو میڈم! غضب ہو گیا۔"

"کیوں اب کیا ہو گیا؟" میڈم فکر مند ہو چکی تھی۔

"میں نے فیصل کو گھر سے نکال دیا۔" میں نے بنا تمہید کے سیدھی بات کی۔

"کیا؟" میڈم کے سر پر گویا کوئی بم پھٹ گیا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ تم ہوش میں تو ہو؟"

"یس میڈم! میں بالکل ہوش میں ہوں۔ کیا کرتی۔ اس نے میرا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ جانور بن جاتا تھا۔ بہت مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا۔" میری آواز میں اب خوف کی آمیزش بھی شامل ہو چکی تھی۔

"مگر......تم نے اسے گھر سے کیسے نکال دیا؟ وہ کوئی سیدھا سادہ یا معصوم انسان نہیں تھا کہ تم نے بازو سے پکڑ کر باہر نکال دیا اور وہ شرافت سے نکل گیا۔"

"میں نے کب کہا کہ اسے بازو سے پکڑ کر باہر نکالا۔" اتنی بات کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔

"پھر؟" میڈم نے بیتابی سے پوچھا۔

"پھر کیا؟ پستول دکھا کر، بلکہ ایک گولی چلا کر اسے ہراساں کیا اور پھر اسے گھر سے باہر جانے پر مجبور کیا۔" میں نے جھجکتے ہوئے پوری رام کہانی سنا ڈالی۔

"اوہ مائی گاڈ!" میڈم کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ "یہ کیا کر دیا لڑکی؟ رکو، میں تمہارے پاس آتی ہوں۔" یہ کہہ کر میڈم نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں میڈم کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت میڈم کی موجودگی سے واقعی بہت ڈھارس ملتی۔ میں اکیلی اتنے بڑے فلیٹ میں خوف محسوس کر رہی تھی۔

ٹھیک بیس منٹ کے بعد میڈم میرے سامنے بیٹھی مجھے متوحش نظروں سے گھور رہی تھی۔ آخر اس نے لب کھول کر ماحول میں مسلط سکوت کو توڑا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، اسے اس فلیٹ سے نکالنا اتنا ہی آسان تھا۔ جتنا تم نے سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک مگرمچھ ہے۔ تمہارے جیسی چھوٹی موٹی مچھلیاں تو اس کی روزمرہ کی خوراک ہیں۔"

"اس وقت بہت غصہ تھا۔ عقل نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب کیا ہو گا میڈم؟" میں نے استفہامیہ انداز میں میڈم کی طرف دیکھا۔

"یہ تو پہلے سوچنا تھا نا۔ کم از کم مجھ سے مشورہ تو کر سکتی تھی نا؟ ویسے تو ہر چھوٹی سے چھوٹی بات مجھ سے شیئر کر لیتی ہو تو پھر یہ اتنا بڑا فیصلہ تم اکیلی نے کیسے کر لیا؟" میڈم اب کڑوے تیور دکھا رہی تھی۔

"سوری میڈم۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ فیصل کوئی انتقامی کارروائی کرے گا میرے خلاف۔"

''اچھا جی! اور یہ نادر خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا بھلا؟'' میڈم کا لہجہ اب قدرے طنز لیے ہوئے تھا۔

''وہ ایسے کہ گھر سے نکلتے وقت اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ 'اپنا اور گوہر کا بہت خیال رکھنا اور جو بھی کام ہو، شکور سے کہہ دیا کرنا۔ شکور ہر وقت نیچے موجود رہا کرے گا۔''

میڈم نے میری بات بہت حیرانی سے سنی۔

''سچ کہہ رہی ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''حیرت انگیز یار! فیصل جیسے سفاک انسان سے ایسے ہمدردانہ رویے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ کہیں اسے تم سے محبت وغیرہ تو نہیں ہوگئی؟'' اب کی بار میڈم کا لہجہ شرارت لیے ہوا تھا۔

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔ محبت کرنے والے یوں اذیت نہیں دیتے۔'' میں نے سلگ کر جواب دیا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے ہر حکم کی بجا آوری کے لیے نیچے شکور موجود ہے؟''

''معلوم نہیں۔ میں نے رابطہ نہیں کیا اس سے۔'' میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''تم ایسا کرو۔ شکور کو طلب کرو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ فیصل کس حد تک تم سے مخلص ہے۔ اور کیا اسے واقعی تمہاری اتنی ہی فکر ہے؟''

''اوکے۔'' میں نے موبائل اٹھایا اور شکور کا نمبر ڈائل کیا۔

''یس میڈم؟'' فون کے اسپیکر سے اس کی آواز ابھری۔

''شکور! تم اوپر آؤ۔'' میں نے اسے یہ آرڈر دے کر فون بند کر دیا۔ پانچ منٹ بعد ڈور بیل کی آواز سنائی دینے لگی۔

''لگتا ہے، وہ آ گیا۔'' میں میڈم کی طرف دیکھ کر زیر لب بڑبڑائی۔

''چلو باہر لاؤنج میں چلتے ہیں۔ یہاں ہماری باتوں سے گوہر کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ رہے گا۔'' میڈم یہ کہتے ہوئے کر میرے ساتھ ہی باہر لاؤنج میں آ گئی۔ میں نے بیرونی دروازہ کھولا تو شکور مؤدبانہ انداز میں نظریں جھکائے اندر آ گیا۔

''جی بیگم صاحبہ؟'' اس نے نظریں اٹھائے بغیر مجھے مخاطب کیا۔

''تمہارے صاحب کہاں گئے ہیں؟ تمہیں کچھ بتا کر گئے ہیں اس متعلق؟'' میری بجائے میڈم نے سوال کیا۔

''جی مجھ سے تو یہی کہا کہ دفتر جا رہے ہیں۔ ہاں جاتے ہوئے دس ہزار روپیہ مجھے تھمایا اور کہا کہ بیگم صاحبہ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ان کا حکم فوراً بجا لانا۔''

میڈم نے میری طرف دیکھا تو میں بھی ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''اچھا تم ایسا کرو۔ کچھ فروٹ لے آؤ اور دوپہر کے کھانے کیلئے چکن برگر لے آو۔''میں نے تحکمانہ انداز میں حکم دیا۔

''جی بیگم صاحبہ! ابھی لے کر آتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میڈم میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''ایک بات کی تو تسلی ہوگئی کہ معاملہ اتنا سنگین اور گمبھیر نہیں ہے جتنا ہم دونوں سوچ رہی تھیں۔''

''میں نے تو آپ کو کہا تھا کہ گھر سے نکلنے سے پہلے اس کا موڈ بالکل نارمل سا لگا تھا مجھے۔''اب میں بھی قدرے ریلیکس ہو کر بات کررہی تھی۔ خطرے کی لٹکتی تلوار ہٹ چکی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے۔فیصل اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''میں نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

آدھے گھنٹے کے بعد شکور ہمارا مطلوبہ سامان دے گیا۔ہم دونوں نے برگرز اور کولڈ ڈرنکس سے پیٹ پوجا کی۔

''مہربانو! اب ایک کپ چائے کا پلا دو۔ بڑی طلب محسوس ہو رہی ہے۔''میڈم کا لہجہ اب خوشگوار ہو چکا تھا۔

''ابھی لائی میڈم۔''میں نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے چٹکی بجائی اور کچن کی طرف چلدی۔

چائے پیتے ہوئے میڈم نے پھر سے وہی موضوع چھیڑ دیا۔

''تم کہو تو میں چودھری فیصل سے بات کروں؟''میڈم نے چائے کا سپ بھر کے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ سمجھے گا کہ میں ڈر گئی اور اب آپ کی آڑ میں مفاہمت کی راہ تلاش کر رہی ہوں۔''میں نے بھی چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''تو کیا اب یونہی بیٹھ کر زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتی ہو؟''میڈم نے حیرانی سے پوچھا

''ہاں شاید۔''

''پاگل مت بنو۔ چودھری فیصل کے بنا تم کچھ بھی نہیں۔ دو ٹکے کی حیثیت نہیں تمہاری۔ تمہیں تو اس کا بدمعاش بیٹا ہی نکال باہر پھینکے گا۔''

میڈم نے حالات کی کچھ اس طرح تصویر کھینچی کہ مجھے جھرجھری آ گئی۔

''تو پھر اب کیا کیا جائے؟''اب میرے لہجے سے فکرمندی جھلکنے لگی تھی۔

''اس سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔''

''مگر اس سے کہہ دیجیے گا کہ اس گھر میں واپس آنا ہے تو شراب پینے سے توبہ کرنی ہوگی۔ یا پھر کہہ دیں کہ باہر شراب نوشی کیا

کرے۔ میں یہاں اسے اس شغل میلے کی اجازت نہیں دوں گی ہاں۔"

میری بات سن کر میڈم چند لمحے حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"بانو! تم واقعی اتنی معصوم ہو یا پھر معصوم بننے کی ایکٹنگ کرتی ہو؟"

"کیوں؟ اب ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔" میں نے تنک کر پوچھا۔

"اللہ کی بندی۔ دعا کرو کہ اس نے تمہارے اس تضحیک آمیز سلوک کو دل پر نہ لگایا ہو۔ اور ہنسی خوشی واپس گھر آ جائے۔ اور تم اپنی شرطیں منوانا چاہ رہی ہو اس سے؟ صدقے جاؤں تمہارے کنفیڈینس بلکہ اوور کنفیڈینس کے۔"

میڈم کا مدلل لیکچر سن کر میں خجالت سی محسوس کرنے لگی۔

"ویسے اگر وہ گھر آ بھی گیا تو لڑائی تو پھر بھی ہونی ہی ہونی ہے۔" میں نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" میڈم کا ماتھا ٹھنکا۔ "تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کر سکتی ہو؟"

"کیونکہ میں نے بیڈ روم میں بنا ہوا اس کا بار ختم کر دیا۔ شوکیس کے اندر رکھی ہوئی تمام شراب کی بوتلیں ٹوائلٹ کے فلیش میں بہا دیں۔"

میری بات سن کر میڈم کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ والی کاروائی کب عمل میں لائی مہارانی صاحبہ نے؟" اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"اسے گھر سے نکالنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔" میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے جواب دیا۔

میڈم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"بانو! تم اپنی لٹیا ڈبونے پر کیوں تلی رہتی ہو۔ کوئی تمہیں بچائے تو آخر کب تک اور کہاں تک؟" میڈم اب نڈھال اور افسردہ سی دکھائی دینے لگی۔" وہ بہت مہنگی شراب تھی۔ ایک ایک بوتل ہزاروں کی ہوگی۔"

"وہ شراب پی کر اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" میں نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ میڈم نے بے چارگی سے ایک ترحم آمیز نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"اور تمہیں یقین ہے کہ وہ تماری یہ شرط باآسانی مان جائے گا؟"

"تو مت مانے۔ بس یہاں دوبارہ آنے کی زحمت مت کرے۔"

اتنے میں گوہر کے رونے کی آواز سنائی دی تو میں دوڑ کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ گوہر کو اٹھائے باہر آئی تو میڈم فیصل سے فون پر بات کر رہی تھی۔ میں نے کن سوئیاں لینے کی بہت کوشش کی مگر میڈم کے ڈپلومیٹک فقرے اور غیر مبہم باتوں سے کچھ بھی اندازہ نہ کر

پائی۔بس اتنا اندازہ ہوگیا کہ فیصل بڑے اچھے طریقے سے میڈم سے بات کر رہا ہے اور میڈم بھی بڑے دلربا انداز میں اس سے گفتگو کر رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد میڈم نے کال بند کی تو میں مارے تجسس کے منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ کیا کہتا ہے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''اسے اپنی غلطی کا احساس ہے۔بلکہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے۔کہہ رہا تھا کہ ایک بار بانو اسے معاف کر کے گھر میں داخل کر لے۔آئندہ کبھی ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی اس کو مجھ سے۔''

''ہونہہ! ہر بار یہی کہتا ہے۔فراڈ اور جھوٹا کہیں کا۔آپ نے دوسری بات کی اس سے؟'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ابھی میں نے دوسری بات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔موقع محل اور اس کا موڈ دیکھ کر خود ہی کر لینا۔'' میڈم نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''او کے۔'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا مگر دل میں فیصل کے متوقع رویے کو سوچ کر ڈر رہی تھی۔میڈم مجھے ڈھارس اور چند ہدایات گوش گزار کر کے رخصت ہوگئی۔

☆......☆......☆

میں شام تک خود کو فیصل کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر چکی تھی اور دل میں یہ تہیہ بھی کر چکی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے۔اس کے سامنے سر نہیں جھکانا۔اس کے مفاہمت بھرے انداز نے مجھے گویا شیر کر دیا تھا۔میں نے شکور کو بلا کر وہ بوتلیں وہاں سے ہٹا دی تھیں۔وہ خالی بوتلوں کو ایک توڑے میں ڈال کر شہر سے دور کہیں پھینک آیا تھا۔

اب بار روم ختم ہوگیا تھا اس کی جگہ ایک سادہ شیشے کا دیوار گیر شوکیس منہ چڑا رہا تھا۔میں نے کھانے کی تیاری سے فارغ ہو کر گوہر کے کپڑے تبدیل کیے اور پھر خود بھی نہا کر نیا سوٹ پہن لیا۔چہرے اور جسم پر ابھی تک نیل نظر آ رہے تھے۔

میں لاؤنج میں بیٹھی ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔کتاب کا تو بہانہ تھا ورنہ کان تو فیصل کے قدموں کی متوقع چاپ پر لگے تھے جو کسی بھی لمحے سنائی دینے والی تھی۔دیوار پر لٹکے گھڑیال کو دیکھا تو رات کے آٹھ بجا رہا تھا۔ عموماً فیصل سات بجے تک آجایا کرتا تھا۔ہوسکتا ہے آج گاؤں کا رخ کر لیا ہو۔یہاں آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔میں اکیلی کھانا کھانے کا سوچ کر اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ لاؤنج کا دروازہ کھلا اور وہ شرمندہ شرمندہ سا اندر آ گیا۔

مجھے سلام کیا مگر میں نے جواب دینے کی بجائے بے رخی سے چہرہ پھیر لیا۔وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے پاس آ رکا۔

''کیسی ہو چودھرانی؟'' وہ حلاوٹ بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ہوں۔'' میں اس کی طرف دیکھ کر پھٹ پڑی۔''یہ دیکھو میرا چہرہ۔یہ دیکھو میری گردن۔نوچنے

کھسوٹنے کے نشانات جوں کے توں موجود ہیں۔"

میرے اس اچانک جارحانہ رویے سے وہ بوکھلا گیا۔

"آئی ایم رئیلی سوری میری جان! اب معاف بھی کردو۔" اس نے آگے بڑھ کر مجھے چھونا چاہا۔

"ہاتھ مت لگانا مجھے۔ یہ تو میڈم نے سفارش اتنی کی کہ تمہیں پھر سے گھر کے اندر آنے کی اجازت دینی پڑی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔" میں نے پھنکارتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

برتن اٹھائے باہر آئی تو وہ ابھی تک اسی جگہ حیران پریشان کھڑا تھا۔ میرے بدلے ہوئے رویے نے اسے شاکڈ کر دیا تھا۔ اسے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے بریف کیس کو بھی رکھنے کا ہوش نہیں رہا تھا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ایک گونا گوں سکون سا محسوس ہو رہا تھا اور ساتھ میں اس کی مضحکہ خیز شکل دیکھ کر دل میں ہنسی بھی آ رہی تھی۔ کھانا میز پر لگاتے ہوئے میں نے پھر سے ایک نشتر چبھویا۔

"اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں ہمیشہ کی طرح تمہارے ہاتھ سے یہ بریف کیس پکڑ کر یہ کہوں گی کہ "آپ ہاتھ دھو آیئے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تو یہ فقط آپ کی خام خیالی ہے۔"

میں نے کچن میں جا کر دروازے کی اوٹ سے دیکھا تو بریف کیس اٹھائے وہ بیڈروم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا سر اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میرا دل اندیشوں سے لرز اٹھا۔

"اب یہ یقیناً واش روم میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے جائے گا اور وہاں اس کی نظر خالی شوکیس پر بھی ضرور پڑے گی۔ اور پھر......"

"اس سے آگے سوچنے کی ہمت نہ پڑی۔ تھوڑی دیر پہلے والی ساری اکڑ فوں ہوا ہو گئی۔

مرے مرے قدموں سے پانی والا جگ اور گلاس میز پر رکھے اور خود بھی ایک صوفے پر ٹک گئی۔ کھانے کے تمام لوازمات پورے ہو چکے تھے۔ مجھے اب اس کے باہر آنے اور ردعمل دیکھنے کا انتظار تھا۔

"یا الٰہی خیر کرنا۔" میرے دل سے بے اختیار یہ دعا نکلی۔

دس منٹ بعد وہ باہر نکلا۔ اس کا دھلا ہوا چہرہ چمک رہا تھا۔ بالوں کو پھر سے کنگھی کر کے سلیقے سے جما رکھا تھا۔ وہ پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنا چاہتا ہو۔ فیصل نے خاموشی سے سالن والے ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا اور پلیٹ میں اپنے لیے سالن نکالنے لگا۔ پھر ایک روٹی اٹھائی اور چپ چاپ کھانے لگا۔ اس کا رویہ مجھے اچنبھے میں مبتلا کر رہا تھا۔ شاید کھانا کھانے کے بعد میری کلاس لے گا۔

مجھے بھی مار کھانے سے پہلے تھوڑا کھانا تو معدے تک پہنچا لینا چاہیے۔ بھوکے پیٹ تو مار بھی نہیں کھائی جائے گی۔ یہ سوچ کر میں بھی کھانے میں شامل ہو گئی۔ چند لقمے زہر مار کرنے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا جبکہ وہ پوری رغبت سے کھا رہا تھا۔ میں دکھاوے کے لیے تھوڑے

چاول پلیٹ میں ڈال کر انہیں چمچ کے ساتھ الٹ پلٹ کرنے لگی جبکہ وہ کھانا کھا کر اب اپنے ہاتھ نیپکن سے پونچھنے لگا۔

میرا دل پھر سے بے قابو ہونے لگا۔ اب تو یہ کھانے سے فارغ ہو گیا۔ اب لازمی پوچھے گا کیونکہ وہ مجھے متعدد بار بتا چکا تھا کہ شراب اور عورت دونوں اس کی بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔ ان دونوں کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو پھر میں نے تو اس کی کمزوری پر ہاتھ ڈال کر بہت بڑی جرأت اور بغاوت کا مظاہرہ کر ڈالا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب میں بھی اس انتہائی قدم پر دل میں پچھتا رہی تھی۔ کیا ضرورت تھی بلاوجہ شیر کی کچھار میں ہاتھ دینے کی۔ اس نے کون سا باز آ جانا ہے پینے سے، آج نہ پیئے گا مگر کل سے پھر نئی لے آئے گا۔

''اگر کھانا کھا لیا ہے تو میرے لیے ایک کپ چائے کا بنا دو۔'' اس نے نارمل سے لہجے میں بات کی تو میں احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''جی۔'' میرے منہ سے بے اختیار یہ لفظ پھسل پڑا۔

''کیا چائے بنانے میں کوئی مسئلہ ہے؟ اگر کوئی پرابلم ہے تو رہنے دو۔ میں گزارہ کر لوں گا۔'' اب کی بار اس نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا تو میں مزید ہراساں ہو گئی۔

''نہیں نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی بنا کر لاتی ہوں۔'' میں برتن سمیٹ کر کچن میں لے آئی۔ برتن سنک میں رکھے۔ چائے کا پانی کیٹل میں ڈال کر چولہے پر رکھا تو پھر سے فیصل کے رویے کو لے کر سوچنے لگی۔

اب تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی نظر اس شوکیس پر نہیں پڑی ورنہ وہ اپنا اتنا بڑا نقصان ہوتا دیکھ کر کبھی بھی خود پر کنٹرول نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کا یہی مطلب نکلتا تھا کہ اس کی نظر ابھی تک اس اجڑے ہوئے بار پر نہیں پڑی مگر یہ بات بھی ناقابل یقین تھی کہ کوئی واش روم میں جائے اور اس کی نظر بار پر نہ پڑے۔

اسی کشمکش میں چائے تیار ہو گئی۔ دو کپوں میں انڈیلی اور باہر لے آئی۔ وہ ٹی وی پر خبریں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اس کے ہمراہ بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

''گوہر کب سے سو رہا ہے؟'' اس نے نارمل سے لہجے میں پوچھا۔

''دو گھنٹے ہونے کو آ رہے ہیں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''ہمم! اسے اٹھا کر کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ اتنا زیادہ سونا بھی مناسب نہیں۔'' اس نے ناصحانہ انداز میں نصیحت کی۔

میں خاموش رہی تو پھر بولا۔

''بار میں رکھی ہوئی شراب کی بوتلیں کہاں گئیں؟'' یہ سوال بھی اس نے نارمل انداز میں کیا۔

اس کی بات سن کر میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ لڑکھڑایا جسے میں نے فوراً سنبھال لیا اور سراسیمگی سے اس کی طرف

دیکھنے لگی مگر وہ بے نیازی سے ٹی وی کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے سوچا کہ اگر آج ڈر گئی تو ہمیشہ کے لیے اس کے جوتے کھانا پڑیں گے۔ اس لیے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

''وہ ساری بوتلیں میں نے فلش میں بہا کر خالی کیں۔ اور پھر باہر پھینک دیں۔ میڈم کی صلح والی بات میں نے اسی شرط پر مانی تھی کہ آپ اس گھر میں شراب نہیں پئیں گے۔'' میں نے دل کڑا کرکے یہ بات کہہ تو دی مگر اب اس کے ممکنہ اثرات کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

میری بات سن کر وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ یوں جیسے اسے مجھ سے اتنی بہادری کی توقع نہ ہو مگر میں اس کے اس طرح دیکھنے پر بجائے خوفزدہ ہونے کے گردن اکڑائے بیٹھی رہی تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس سینے سے خارج کی۔

''یعنی تم بھی بالآخر ایک بیوی ہی نکلی۔ اب مجھے دو دو بیویوں کے زیرِ عتاب باقی زندگی گزارنی پڑے گی۔'' وہ متاسفانہ انداز میں سر کو ہلا رہا تھا اب۔

''جو مرضی سمجھیں۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں اپنے بچے کے ساتھ اس غلیظ ماحول میں نہیں رہوں گی۔''

اس کے بعد فیصل نے مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی۔ تھوڑی دیر تک ریموٹ اٹھائے مختلف چینل بدلتا رہا۔ پھر ریموٹ صوفے پر پھینک کر کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے طمانیت بھری گہری سانس لی۔ دل خوشی سے جھومنے کو کر رہا تھا۔

''ہرا۔''

آج میں نے ایک عظیم قلعہ فتح کر لیا۔ ایک سرکش گھوڑے کو لگام ڈال دی۔ اب بہت جلد اس کی پیٹھ پر سواری بھی کر کے دکھاؤں گی۔ مارے خوشی کے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ پھر سوچنے لگی کہ دیکھوں تو سہی اندر جا کر کیا کر رہا ہے۔ یہ نہ ہو، پستول میں گولیوں سے بھری میگزین ڈال رہا ہو۔ اس جیسے نفسیاتی مریض سے کچھ بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں بجلی کی سی سرعت سے بیڈ روم کی طرف لپکی۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو وہ بیڈ پر لیٹا گوہر کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ گوہر باپ کے چہرے پر اپنے ننھے ہاتھوں سے طمانچے رسید کر رہا تھا اور فیصل آگے سے ہنس رہا تھا۔ ان دونوں کو مشغول دیکھ کر میں بھی مسکرانے لگی۔

☆......☆......☆

رات کو سونے کے لیے لیٹے تو فیصل میری طرف پشت پھیر کر لیٹ گیا۔ میں نے بھی بلانے یا منانے کی کوشش نہ کی۔

اگلے دن بھی وہ ناشتہ کر کے فیکٹری چلا گیا۔ اب میرا دل اس کی طرف سے نرم ہو رہا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ اگر آج رات کو بھی اس کا رویہ سرد رہا تو میں پہل کر لوں گی۔ اسے منا لوں گی۔ آخر اس کی زندگی کی سب سے بڑی خرافات چھڑانے جا رہی تھی تو اس کے لیے مجھے اپنے رویے میں لچک پیدا کرنا ہو گی۔

میں نے شام کا کھانا تیار کیا اور خود بھی اس کے والہانہ استقبال کے لیے خود کو تیار کر لیا۔ اپنے بناؤ سنگھار پر خصوصی توجہ دی۔ کھانے کے برتن میز پر لگا رہی تھی۔ جب وہ نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اسے اس ابتر حالت میں دیکھ جی بہت برا ہوا۔

''تو کیا سمجھتی ہے کہ میری شراب کی بوتلیں توڑ کر تم مجھ سے شراب چھڑوا لے گی۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا مگر شراب کبھی نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ جھومتا جھامتا میرے روبرو کھڑا تھا اور اب قہرناک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

مجھے فیصل کی شکل سے حد درجہ کراہیت محسوس ہو رہی تھی اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس شخص کو سدھارنے کے لیے اپنی سی ہر کوشش کر ڈالی تھی مگر یہ کتے کی ٹیڑھی دم ثابت ہو رہا تھا۔ میں جو بڑے ارمانوں سے اس کے لیے سجی سنوری تھی۔ اب آنسو بہا رہی تھی۔ بھوک بھی مر چکی تھی۔

وہ واہی تباہی بکتا ہوا ایک صوفے پر لڑھک گیا اور میں چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے برتن سمیٹنے لگی۔ وہ غنودگی کے عالم میں تھوڑی دیر تک بڑبڑاتا رہا پھر نشے کے زیر اثر ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا۔

میں نے گوہر کو اٹھایا اور کمرے میں چلی آئی۔ اسے سلا کر خود بھی پاس لیٹ گئی۔ لیٹنے سے پہلے دروازے کو لاک کرنا نہیں بھولی تھی۔ روتے روتے نجانے کب آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ گوہر کے رونے کی آواز سن کر کھلی۔ اٹھ کر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تو وہ ابھی تک صوفے پر آڑھا ترچھا بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔

میں کچن میں گئی۔ گوہر کے فیڈر میں دودھ بھرا اور پھر سے کمرے میں چلی آئی۔ پہلے سوچا کہ فیصل کو جگاتی ہوں۔ اس کا فیکٹری جانے کا وقت ہو رہا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر پڑی رہی۔ گوہر دودھ پیتے پیتے پھر سے سو گیا تو کچن میں جا کر اپنے لیے چائے کا مگ تیار کیا اور فیصل کے پاس سے گزرتی ہوئی پھر سے کمرے میں چلی آئی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے میں چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔ جب وہ اٹھ کر اندر آیا۔ ایک اچٹتی نظر مجھ پر ڈال کر واش روم میں چلا گیا۔ باہر آیا تو میری طرف دیکھ کر کھسیانہ انداز میں مسکرایا۔

''گڈ مارننگ بیگم۔''

جب میری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو مزید بولا۔

''لگتا ہے۔ ہماری بیگم کا موڈ آج پھر خراب ہو گیا۔ سوری بیگم۔'' وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا تو میں نے اپنی ہنسی بمشکل کنٹرول کی۔ عجیب انسان ہے۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔

''پلیز معاف کردو۔میری پیاری بیگم۔میرے گوہر کی اماں۔تمہیں تمہارے گوہر کی قسم۔''

''ناشتے میں کیا لینا ہے؟''میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''جو تم پیار سے کھلا دو۔''وہ شہد آگیں لہجے میں بولا۔

☆......☆......☆

''ہفتے والے دن شبانہ کا نکاح ہے۔''وہ ناشتہ کرر ہا تھا۔جب میں نے بات چھیڑی۔

''اچھا۔یہ تو اچھی بات ہے۔کس سے کر رہی ہے؟''اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''جس فیکٹری میں کام کرتی تھی۔اسی میں سپروائزر کے عہدے پر کام کرتا ہے۔ریاض نام ہے اس کا۔''میں نے جواب دیا۔

''تمہیں تو ضرور جانا چاہیے۔آخر کو تمہاری سہیلی کی شادی ہے۔''

''ہاں جاؤں گی مگر مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔''میں جلدی ہی اپنے مدعے پر آ گئی۔اسی غرض نے مجھے اس سے جھگڑا کرنے سے باز رکھا ہوا تھا۔

''اچھا جی! کتنے پیسے چاہئیں؟''

''پچاس ہزار۔میں اپنی طرف سے اسے سونے کا بریسلٹ تحفے میں دوں گی۔''میں نے نارمل سے لہجے میں اس طرح بات کی جیسے پچاس ہزار نہیں بلکہ پانچ ہزار کی بات کی ہو۔

''مل جائیں گے۔اور کچھ؟''اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

''تھینکس۔فی الحال اتنا ہی چاہیے۔جب مزید ضرورت پڑے گی، مانگ لوں گی۔''میں نے رکھائی سے جواب دیا اور اس کے آگے سے برتن اٹھانے لگی۔

''بس خوش رہا کرو۔ماتھے پر ہر وقت یہ چوڑیاں مت چڑھائے رکھا کرو۔''وہ شرارت سے مسکرایا۔

''تمہارے جیتے جی، میں کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔''میں تلخی سے بولی۔

''باپ رے۔تو کیا اب تمہیں خوش دیکھنے کے لیے مجھے مرنا پڑے گا مگر میرے مرنے کے بعد تم خوش ہو بھی گئی تو میں کیسے دیکھوں گا۔''اس نے کچھ اس معصومیت اور بھولپن سے بات کی کہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔وہ بھی میرے ساتھ ہم آواز ہو کر ہنسنے لگا۔پھر بولا۔

''سوری بانو! اب تو یہ لفظ کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔''وہ سنجیدہ ہو گیا۔

''شرم اور وہ بھی آپ کو۔خدا کا خوف کھائیں چودھری صاحب۔''میں نے طنزیہ انداز میں جواب دیا تو پھر سے ہنسنے لگا۔

''ویسے ایک بات ہے بانو، میرے ساتھ رہ رہ کے تم بھی کافی تیز طرار ہوتی جا رہی ہو۔اب تو مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''فیکٹری نہیں جانا آج ؟''میں نے موضوع بدلنے کو بات بدلی۔

''نہیں۔آج نہیں جانا۔آج اپنی بیگم کو ڈھیر ساری شاپنگ کروانی ہے اور اس کے بعد کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اٹھ کے کچن میں چلی گئی۔میں نے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا۔چھ،سات ماہ ہوگئے تھے فیصل کے ساتھ رہتے ہوئے۔اور ان چھ سات ماہ میں اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ شراب چھوڑنا اس کے بس میں نہیں تھا۔مجھے اسے ایسے ہی قبول کرنا تھا۔اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت۔

اگر اس میں چند ایک خامیاں تھیں تو خوبیاں بھی ان گنت تھیں۔جب میں نے دل کو سمجھا کر سمجھوتے پر آمادہ کرلیا تو زندگی بھی جیسے سہل اور پرسکون ہوتی چلی گئی۔گھر سے بار ختم کرنے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ روز پینے کی بجائے تیسرے چوتھے دن پینے لگا۔اب وہ باہر سے پی کر گھر آتا۔تھوڑی دیر تک بکتا جھکتا اور پھر بے سدھ ہوجاتا۔

شبانہ کی ریاض سے شادی ہوگئی۔وہ بھی ہوسٹل سے رخصت ہوکر ریاض کے آنگن میں جا اتری۔

ایک دن میں لاؤنج میں بیٹھی گوہر سے کھیل رہی تھی کہ فیصل ایک معمر شخص کے ساتھ آیا۔وہ بوڑھا آدمی اس عمر میں بھی بارعب اور پروقار شخصیت کا مالک تھا۔اس کی شکل میں فیصل کی شباہت باآسانی نظر آرہی تھی۔میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔پھر فیصل نے میرے شک پر یقین کی مہر ثبت کردی یہ کہہ کر۔

''مہربانو!یہ اباجی ہیں۔ان سے ملو۔''

اباجی،جو بڑے کروفر سے کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔میں نے پاس جاکر ان کے سامنے سر جھکایا تو انہوں نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔

مجھے اپنے سر پر بزرگوار کے ہاتھ کا دباؤ کچھ زیادہ محسوس ہوا تو نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔وہ گہری نظروں سے میرا ناقدانہ انداز میں جائزہ لے رہے تھے۔مجھے اس طرح لال لال آنکھوں سے ان کا گھورنا بہت ناگوار گزرا۔

''ہمم!تو اس لڑکی کو تم میری نونہہ بنا کر لائے ہو۔''

''جی اباجی!یہ آپ کی بہو ہے۔''فیصل نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔

''اور یہ بچہ؟...... یہ بچہ کس کا ہے؟''بڑے چودھری کا اشارہ گوہر کی جانب تھا۔میں ان کا عجیب وغریب رویہ دیکھ کر اب ایک طرف خاموشی سے کھڑی ہوگئی۔

''یہ بچہ اس کا ہے اباجی۔میرا مطلب ہے اس کے پہلے شوہر سے ہے۔بیوہ ہوگئی اور یہ بچہ یتیم ہوگیا تو خدا ترسی کر کے اپنا لیا۔''

وہ چہرے پر زمانے بھر کی لاچاری سجا کر بولا۔

میں اس کے اس قدر ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے پر بھونچکی رہ گئی۔کیا غضب کا اداکار ہے کم بخت۔ابا جی نے ایک لمبا ہنکارہ بھرا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئے۔فیصل بھی پاس بیٹھ گیا۔میں ابھی تک سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔سچ تو یہ تھا کہ مجھے فیصل کے ابا جی بھی فیصل کی طرح ایک عجیب وغریب کردار محسوس ہو رہے تھے۔

''مہربانو! کھڑی کیوں ہو؟ جاؤ جا کر ابا جی کے لیے چائے بنا کر لے آؤ۔''اس نے مجھے کہا تو میں کچن کی طرف چلدی۔گوہران کے پاس زمین پر بچھے قالین پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔

چائے بناتے ہوئے بھی بڑے میاں کی بارعب آواز مسلسل میرے کانوں میں پڑتی رہی۔وہ اب فیصل سے کڑے تیوروں میں باز پرس کر رہے تھے۔

''کب کی تم نے اس لڑکی سے شادی؟''

''سات آٹھ ماہ تو ہو ہی گئے ابا جی۔''اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

''ہمم! اور یہ بچہ کتنی دیر کا ہے؟''

''یہ بھی سال کا ہو رہا ہے۔''فیصل ابا جی کے تابڑتوڑ سوالوں سے اب بوکھلانے لگا تھا۔اس لیے بنا سوچے سمجھے جواب دے دیا۔

''اچھا جی! یعنی جب تم نے اس کڑی سے شادی کہ تو یہ بچہ چار ماہ کا تھا؟''

''ہاں جی۔شاید۔''اس نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''اور جب اس بچے کا باپ فوت ہوا تب بچہ کتنی عمر کا تھا؟''بڑے چودھری کے تیور ہر سوال کے بعد کڑے سے کڑے ہوتے جا رہے تھے۔

''شاید دو تین ماہ کا۔''فیصل نے پیشانی پر آیا پسینہ اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔میں نے اس کا یہ بے تکا جواب سن کر اپنا ہاتھ سر پر مارا۔

''کسی کھوتے کے پتر۔پچھلے پندرہ بیس منٹ سے مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بولے چلا جا رہا ہے۔میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید کیے ہیں؟۔یہ بتا ذرا؟۔''

ابا جی کی گھن گرج سن کر فیصل کے اوسان خطا ہونے لگے۔میں چائے کپوں میں انڈیل رہی تھی۔جب اس کی گھگھیائی ہوئی آواز سنی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں ابا جی؟۔میں بھلا کیوں جھوٹ بولوں گا آپ سے؟''

''اگر یہ بچہ اپنے باپ کی وفات پر تین چار ماہ کا تھا تو اس کی ماں نے اپنے خاوند کی موت پر عدت پوری کر کے ہی تجھ سے نکاح پڑھوایا ہوگا نا۔اور عدت کی مدت ہوتی ہے چار ماہ دس دن۔یعنی تم سے نکاح کے وقت اس بچے کی عمر سات آٹھ ماہ ہو چکی تھی۔اب جب کہ

نکاح کو ہوئے بھی آٹھ ماہ ہو چکے ہیں۔اب تو اس بچے کی عمر ڈیڑھ سال کے لگ بھگ ہو جانی چاہیے تھی۔''

میں چائے والے کپ میز پر رکھنے لگی تو ابا جی خاموش ہو گئے۔فیصل کن انکھیوں سے میرے چہرے پر چھائی ناگواری کے آثار ملاحظہ کر رہا تھا۔میں نے چائے پیش کرنے کے بعد گوہر کو اٹھایا اور بیڈ روم میں چلی گئی۔دروازہ جان بوجھ کر ادھ کھلا رہنے دیا۔سسر کی مزید گل افشانی گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔

میرے کمرے میں جاتے ہی بزرگوار پھر سے شروع ہو گئے۔

''مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس لڑکی سے نکاح کرنے کے جھنجھٹ میں کیوں پڑے۔تم اپنے بزرگوں کے برسوں پرانے وضع کیے ہوئے قانون کو کیسے توڑ سکتے ہو؟''

فیصل نے اس بات کے جواب میں خاموشی برقرار رکھی تو اس کے باپ کی بارعب آواز نے پھر سے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔

''سیدھی سی بات ہے۔۔تم جھوٹ پہ جھوٹ بولنے کے باوجود بھی مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے اس لڑکی کے ساتھ ناجائز تعلق بنا رکھا ہوگا۔جب تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوئی تو نکاح کا طوق گلے میں ڈال کر اسے بدنامی سے بچانا چاہا۔یہ بچہ تمہارا ہے۔اسے دیکھ کر کوئی اندھا بھی بتا سکتا ہے کہ اس کے باپ تم ہو۔چلو نکاح سے پہلے بچہ بھی پیدا کر لیا۔بعد میں اس بچے کو اپنا نام دینے کے لیے نکاح بھی کر لیا۔اب آگے کی سوچو۔تمہارے پہلے سے موجود بچوں کو اور ان کی ماں کو اس ساری حقیقت کا جب پتا چلے گا،تب تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔اس بات کے لیے بھی تیار رہنا۔''

''ابا جی! آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟''فیصل نے بیزاری بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اوئے عقل کے دشمن۔میں تمہیں دھمکی کیوں دوں گا۔کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا بڑا بیٹا اور اس کی ماں تمہارا کیا حال کرتے ہیں۔ان کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے تو تم نے اس گھونسلے میں پناہ لے رکھی ہے۔جہاں نت نئی فاختاؤں کا شکار کر کے لاتے رہتے ہو۔اور اب تو خیر سے ان فاختاؤں کے انڈوں سے بچے بھی نکلنے لگے۔''ابا جی کا لہجہ اینڈ پر استہزائیہ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔صرف چائے کی چسکیوں کی ہلکی آواز سنائی دیتی رہی۔آخر خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے ابا جی کی آواز پھر سے ابھری۔

''اپنی ووہٹی کو آواز دے کر باہر بلا۔مجھ سے پردہ کرنا اس پر واجب نہیں۔''

چند منٹ بعد فیصل کمرے میں آیا۔

''بانو! پلیز باہر آؤ۔ابا جی تمہیں بلا رہے ہیں۔''

''مجھے ابا جی سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔''میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔''وہ تو تم سے بھی بڑے نمونے نکلے۔''

''جو بھی کہنا بعد میں کہنا۔فی الحال باہر جا کر ان کی بات سن لو۔ مجھے لگتا ہے۔وہ رخصت ہونا چاہ رہے ہیں۔'' وہ لجاجت سے بولا تو میں دوپٹہ سر پر درست کرتی ہوئی اس کی ہمراہی میں چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ ابا جی اب کتابوں کے ریک کے پاس کھڑے اندر رکھی کتابوں پر نظر جمائے کھڑے تھے۔

''ابا جی! مہر بانو آ گئی۔'' فیصل نے گویا میرے آنے کی اطلاع دی۔ ابا جی گھوم کر میری طرف متوجہ ہوئے اور ایک چیک میری طرف بڑھایا۔

''یہ چیک رکھ لو۔تمہاری منہ دکھائی میری طرف سے۔'' یہ بات بھی انہوں نے بڑے کروفر سے گردن اکڑا کر کی۔

''مجھے نہیں چاہیے۔'' میں چاہنے کے باوجود اپنی ناگواری کو چھپانے میں ناکام رہی۔فرط حیرت واستعجاب سے بڑے چودھری کی آنکھیں پھیل گئیں۔انہیں شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع نہیں تھی۔

''پکڑ لو بانو۔ابا جی اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔'' فیصل منمنایا۔

''جتنی خوشی انہیں مجھے دیکھ کر ہو رہی ہے۔اس کا اظہار وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے کر تو رہے ہیں۔'' میرا لہجہ طنز کی آمیزش لیے ہوئے تھا۔

''بڑی لمبی زبان ہے تیری ووہٹی کی۔فاختہ ہو کر شاہینوں سے مقابلے بازی کرتی ہے۔'' ابا جی ہنسنے لگے۔

''ابا جی۔مہر بانو بہت اچھی ہے۔آپ اسے غلط مت سمجھیں۔'' فیصل فوراً بولا۔

''مہر بانو۔'' ابا جی کے قہقہوں میں شدت پیدا ہو گئی۔پھر قہقہوں کا طوفان تھما تو بولے۔

''بھئی مجھے مڈل کلاس طبقے سے ایک یہ بہت بڑی شکایت ہے۔اپنی مفلسی اور بے چارگی کا ازالہ اپنے بچوں کے نام رکھ کے کرنا چاہتے ہیں۔مہر بانو، شاہ جہاں، اورنگ زیب، نور جہاں وغیرہ وغیرہ۔بھلا بادشاہوں کے نام رکھنے سے بھی کبھی اوقات بدلتی ہے یا حالات بدلتے ہیں۔تو ہوتا یہ ہے کہ حالات تو نہیں بدلتے البتہ بچوں کے دماغ ضرور خراب ہو جاتے ہیں۔وہ سچ مچ خود کو مغلیہ خاندان کے بھولے بسرے چشم و چراغ سمجھنے لگتے ہیں۔''

بڑے چودھری کے تضحیک آمیز رویے سے میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔فیصل نے ابا جی کے ہاتھ میں دبا ہوا وہ چیک اچک لیا۔

''لائیے ابا جی! میں اسے بعد میں دے دوں گا۔''

''بعد میں اسے دو گے یا اس رقم سے سبزی خرید و گے۔کیا پتا۔'' ابا جی نے فلیٹ کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔جاتے جاتے رکے، پلٹے اور میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''فاختہ کا بچہ عقاب کے پنجوں کی دسترس سے زیادہ دور نہیں۔اللہ خیر کرے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

ان کے اس فقرے سے میرا دل ہول اٹھا۔ میں بھاگ کر واپس کمرے میں گئی جہاں گوہر زمین پر بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ اسے اٹھایا اور اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

دس پندرہ منٹ بعد فیصل کمرے میں داخل ہوا اور صوفے پر گر سا گیا۔ میں گوہر کے ساتھ لیٹی اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''شکر ہے۔ ابا جی بنا کوئی بدمزگی پیدا کیے رخصت ہو گئے۔'' اس نے آسودگی بھری سانس سینے سے خارج کی۔

''ابا جی کو کس نے بتایا ہماری شادی کے متعلق؟'' میں نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''ایسی باتیں زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتیں۔ چل گیا ہوگا کہیں سے پتا۔'' وہ لاپرواہی سے بولا۔

''اور پھر وہ اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے اسپیشل یہاں چلے آئے۔''

''اسپیشل تو خیر نہیں کہہ سکتی۔ مہینے میں دو دفعہ گردے واش کروانے کے لیے لاہور آتے ہیں۔ آج بھی اسی سلسلے میں آئے تھے۔ واپسی پر یہاں آ گئے۔''

''تمہیں کہاں سے مل گئے؟''

''مجھے فون کیا تھا۔ کہہ رہے تھے۔ تمہارے گھر جانا چاہتا ہوں۔ تمہاری فیملی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''جب انہوں نے ایسا کہا تو تم یقیناً چونک گئے ہو گے؟'' وہ مسلسل انکوائری کیے جا رہی تھی۔

''نہیں، چونکا نہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ وہ حویلی میں مجھ سے پہلے ہی اگلوا چکے تھے۔''

وہ اب اطمینان سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''مگر مجھے ان کا کڑوا لہجہ اور کاٹ دار جملے بالکل پسند نہیں آئے۔ کیسے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے تھے مجھے۔'' میں نے منہ بنایا۔

''یہ ان کی عادت ہے۔ طنز سے بات کرنا۔ باقی دل کے برے بالکل نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''اب وہ گھر جا کر اپنی بڑی بہو اور تمہارے بچوں کو تمہارے اس نئے تازے کارنامے سے آگاہ کریں گے۔'' میں نے فیصل کو ڈرانے کی کوشش کی۔

''نہیں، ابا جی کبھی کوئی ایسا کام نہیں کریں گے۔ جس سے مجھے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ وہ ہمیشہ میری خیر خواہی ہی چاہیں گے۔''

''تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بیوی بچوں کو کبھی اس شادی کے متعلق خبر نہیں ہو گی؟''

''ضرور ہو گی۔ دلاور اور اس کی ماں کا نیٹ ورک بہت طاقتور ہے۔ اس خبیث کا زیادہ وقت لاہور میں ہی گزرتا ہے۔ تعلیم تو چھوڑ دی مگر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی نہیں چھوڑی۔'' فیصل جب بھی دلاور کا ذکر کرتا تھا۔ اس کے لہجے میں ناگواری کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔

''بانو کل تیار رہنا۔ تمہیں اپنے ساتھ فیکٹری لے کر جاؤں گا۔'' اس نے اچانک ہی موضوع بدل دیا۔

''میں فیکٹری جا کر کیا کروں گی بھلا؟''میں نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''کرنا کیا ہے۔تم اس فیکٹری کی مالکن ہو۔اپنے اثاثوں کی خبر رکھنی چاہیے تمہیں۔''اس کا موڈ اب کافی حد تک خوشگوار ہو چکا تھا۔

''اچھا چلی چلوں گی مگر وہاں بہت تھوڑا وقت گزاروں گی۔''میں نے اس کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے جانے کی حامی بھر لی۔

''اوکے۔جب کہو گی تمہیں شکور واپس چھوڑ جائے گا۔''

☆......☆......☆

میں فیصل کے عالیشان آفس میں بیٹھی اس کی تزئین آرائش کا جائزہ لے رہی تھی اور وہ سامنے بیٹھا میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کیسا لگا میرا آفس؟''اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بہت عالیشان۔''میں نے دل سے تعریف کی۔

''اتنا ہی شاندار۔جتنا چودھری فیصل کے آفس کو ہونا چاہیے تھا۔''میں نے خوشدلی سے جواب دیا۔میرے ان الفاظ سے وہ کھل اٹھا۔

''یہ بات کی نا۔چودھری فیصل کی بیگم والی۔''اس نے سامنے رکھے انٹر کام کا بزر بجایا۔چند منٹ کے اندر ایک پیون ٹائپ آدمی ہاتھ باندھے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''رحیم!دو کپ فرسٹ کلاس چائے لے کر آؤ۔''

''جی اچھا جی۔''وہ جانے کے لیے مڑا تو فیصل نے آواز دی۔''جانے سے پہلے،فولڈنگ کھاتے کے سپروائزر بابر کو یہاں بھیج دو۔''

''اوکے صاحب۔''اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور باہر نکل گیا۔بابر کا نام سن کر میرا دل زور سے دھڑکا۔اسے اپنے سامنے دیکھنے کا تصور ہی انتہائی ہیجان انگیز تھا۔

''اسے میرے سامنے مت لاؤ فیصل!میں اس شخص کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔''میں ناگواری سے بولی۔وہ مسکرایا اور میری طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میں جان بوجھ کر اسے تمہارے سامنے بلانے لگا ہوں۔اسے اس بات کو احساس دلانا چاہتا ہوں کہ جسے اس نے دھکے دے کر گھر سے نکالا تھا۔بے آسرا اور بے سہارا سمجھ کر اس سے سائبان تک چھین لیا تھا۔وہ اب اس کی مالکن بن چکی ہے اور وہ اس کی فیکٹری میں کام کرنے والا ایک ادنیٰ سا ملازم۔''

اس کی تاویل سن کر میں خاموش ہو گئی مگر بے چینی کی ایک لہر رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی۔چند لمحوں بعد دروازے پر ہلکی آواز میں دستک ہوئی۔

''کم آن۔''فیصل نے ریوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے تحکمانہ آواز میں اندر آنے کی اجازت دی۔

دروازے کی اوٹ سے بابر آہستگی سے چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔وہ مجرمانہ انداز میں سر جھکائے فیصل کے سامنے جیسے کسی سزا کو سننے کا منتظر کھڑا تھا۔

بابر کی اجڑی بچڑی حالت دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔وہ برسوں کا مریض دکھائی دے رہا تھا۔مرجھائے چہرے کے ساتھ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اس کی مفلوک الحالی کی داستان سنا رہی تھیں۔اس کی نظر ابھی تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

''تم نے پھر بنا کوئی اطلاع دیئے دو چھٹیاں کر لیں۔لگتا ہے،اس نوکری سے اب تمہارا دل بھر گیا۔''فیصل کے لہجے سے قہرو غضب جھلک رہا تھا۔

''ایسا مت کہیں چودھری صاحب!اگر آپ نے نوکری سے نکال دیا تو بھوکا مر جاؤں گا۔''اس کی آواز نمناک تھی۔

''یہی تو مصیبت ہے۔تم نے ایڈوانس ہی اتنا اٹھا لیا ہے کہ تمہیں جاب سے نکال بھی نہیں سکتا۔اگر نکال دیا تو میرا قرضہ کون چکائے گا۔''فیصل نے غراتے ہوئے کہا تو بابر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آپ تو جانتے ہیں چودھری صاحب۔میری بچی کے دل میں سوراخ ہے۔ڈھیروں روپیہ اس کے علاج کی مد میں لگا چکا ہوں۔''

یہ انکشاف میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔گوہر کی ناگہانی موت کے بعد فوزیہ نے ایک ایسی بچی کو جنم دیا تھا۔جس کے دل میں سوراخ تھا۔

''اچھا اب جاؤ۔اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔آئندہ کبھی بغیر اطلاع کے چھٹی کی تو دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں گا۔اور یہ مت سمجھنا کہ تمہیں نکال دوں گا تو تمہاری جان قرضے سے چھوٹ جائے گی۔تمہارا مکان بیچ کر اپنا قرضہ وصول کروں گا۔سمجھ گئے نا؟''

فیصل نے رعونت بھرے لہجے میں یہ حکم صادر کیا اور اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اور ہاں......اپنی مالکن یعنی میری بیگم کو تو سلام کرو۔''اس نے استہزائیہ انداز میں کہا تو بابر نے پہلی بار نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔اس کی نگاہیں ایک بار جو میری طرف اٹھیں تو پلکیں جھپکانا بھول گئیں۔یک ٹک میری طرف مجہول سے انداز میں دیکھتا چلا گیا۔

''یہ تمہاری مالکن ہیں۔چودھرانی مہربانو۔''

''سلام چھوٹی چودھرانی صاحبہ۔''وہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لے گیا۔میں نے سر کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا۔منہ سے بولنے کی سکت تو جیسے ختم ہو چکی تھی۔

''اور یہ میرا بیٹا گوہر ہے۔''فیصل کے لہجے سے تفاخر چھلک رہا تھا۔بابر نے ایک بار پھر چونک کر میری گود میں بیٹھے ہوئے گوہر کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اللہ اسے صحت و تندرستی والی طویل عمر عطا کرے۔'' یہ کہتے کہتے اس کے چہرے کے تاثرات بہت اذیت ناک ہو گئے۔ وہ تیز قدم چلتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

فیصل کے ہاتھوں بابر کا یوں ہزیمت اٹھانا مجھے بہت تکلیف میں مبتلا کر گیا۔ بلاشبہ اس شخص نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ مجھے جانوروں کی طرح تشدد کر کے گھر سے نکالا تھا مگر اس کی بچی کی بیماری اور زبوں حالی نے مجھے بے چین کر دیا۔ وہ جیسا بھی تھا۔ سنگدل اور ہرجائی تھا مگر ایک زمانے میں مجھے بہت عزیز بھی تو رہا تھا۔ اسے ٹوٹ کر چاہا بھی تو تھا۔ اس کی محبت میں اس قدر دیوانی ہو گئی تھی کہ اس کے پیچھے ساری دنیا اور دنیا سے جڑے ہر رشتے کو ٹھوکر مار کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور آج جبکہ اس کے دل اور دنیا سے نکالی جا چکی تھی۔ پھر بھی اس کے مصائب سن کر دل دکھ سے بھر گیا۔ میرے دل میں اس کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی مگر نفرت بھی تو نہیں کر سکی تھی اس سے۔

نجانے کب میری آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو گرے اور میری گود میں بیٹھے گوہر کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

''تم رو رہی ہو؟'' فیصل میری طرف دیکھ کر حیرانی سے بولا۔ ''تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تم پر ظلم کرنے والا، مکافات کی چکی میں پس رہا ہے۔''

''فیصل پلیز۔ شکور سے کہو۔ مجھے گھر چھوڑ آئے۔'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''کمال ہے۔ تمہارے ان آنسوؤں کو میں کیا سمجھوں؟ کیا اب بھی تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود ہے؟'' اس کا لہجہ اب طنز لیے ہوا تھا۔

''میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ پلیز مجھے گھر بھجوا دو۔'' میں روہانسی ہو کر بولی۔

''اوکے۔'' اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور شکور کا نمبر ملانے لگا۔

☆......☆......☆

گھر جا کر بھی سارا دن دل بوجھل رہا۔ رہ رہ کر فیصل کے ہاتھوں بابر کی تذلیل کا منظر یاد آتا رہا۔

شام کو فیصل آیا تو وہ بھی چپ چپ سا تھا۔ کھانا بھی خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد میں چائے لے کر کمرے میں گئی تو وہ گوہر کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے ٹرے آگے بڑھایا تو اس نے مگ اٹھا لیا۔ میں اپنا مگ لیے اس کے سامنے صوفے پر آ بیٹھی اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔

''ایک بات بتاؤ گی بانو؟'' اس نے چائے پینے کے دوران گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہاں پوچھیں۔'' میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ میں پہلے سے ہی اس تازہ ترین صورت حال سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔

''کیا ابھی تک تمہارے دل میں بابر کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر اس کی تکلیف پر تڑپ کیوں گئی؟ آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ نکلے؟''

''مت بھولو فیصل۔ جس بچی کی تکلیف کا سن کر میری آنکھیں اشک بار ہوئی تھیں۔ وہ صرف بابر کی بچی نہیں ہے۔ میری عزیز سہیلی فوزیہ کی لختِ جگر بھی ہے۔ وہ فوزیہ جس کے کلیجے کو میں پہلے ہی چھلنی کر چکی ہوں۔ چاہے انجانے میں ہی سہی۔ اور اس سب کے باوجود، کبھی فوزیہ کے منہ سے اپنے لیے کوئی بد دعا یا نامناسب جملہ نہیں سنا۔''

''ہمم۔'' فیصل نے شاید لاجواب ہو کر ایک ہنکارا بھرا۔

''میری ایک بات مانو گے فیصل؟'' میں نے لہجے میں نرمی سمو کر پوچھا۔

''یہ تو بات سن کر ہی بتا سکتا ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اس کی بچی کا علاج کرواؤ۔ اس کے آپریشن اور علاج معالجے پر جتنا پیسہ لگتا ہے۔ لگاؤ پلیز۔ میں نہیں چاہتی کہ میری سہیلی کی زندگی اولاد کی خوشی اور سکون سے خالی ہو۔''

''اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو ضرور سوچوں گا مگر جن لوگوں نے تمہارے ساتھ اتنی زیادتی کی۔ انہیں تکلیف میں دیکھ کر تڑپ رہی ہو، باعثِ تعجب ہے۔'' اس کے لہجے سے بیزاری جھلکنے لگی۔

''میرے ہاتھوں ان لوگوں کا جو نقصان ہو چکا ہے اس کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں شاید۔ حالانکہ جو کچھ ہوا۔ انجانے میں ہوا۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔'' میری آواز جیسے گلے میں رندھ گئی۔

فیصل کا رویہ بھی نرم ہو چکا تھا۔

''اب کیا چاہتی ہو؟'' اس نے لگاوٹ سے پوچھا۔

''ان کی اس قدر مالی مدد کہ وہ اپنی بچی کا آپریشن کروا سکیں۔''

''اوکے۔ میں کل ہی بابر کو پانچ لاکھ کا چیک کاٹ دوں گا اور کچھ؟'' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

ایک خواہش اور......'' میں بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ کیا؟'' وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''میں اپنی سہیلی سے ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور یہ چیک اسے میں اپنے ہاتھوں سے دینا چاہوں گی۔''

''فوزیہ کو؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پھٹ پڑا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔تم اپنی فیکٹری میں کام کرنے والے ایک معمولی سے ورکر کے گھر خود جاؤ گی؟''

''وہ گھر میری بہت عزیز سہیلی کا بھی ہے۔''میں اپنی ضد پر اڑی رہی۔

''کون سی سہیلی؟ کیسی سہیلی؟ جس کے سامنے تم جانوروں کی طرح پٹتی رہی اور وہ چپ چاپ پاس کھڑی تمہارا تماشہ دیکھتی رہی ......وہ سہیلی؟''اس کا لہجہ گہرا طنز لیے ہوئے تھا۔

''وعدہ کرتی ہوں، یہ میری اس سے آخری ملاقات ہوگی۔'' میرے لہجے میں چٹانوں سی مضبوطی دیکھ کر اس نے پسپائی اختیار کر لی اور جانے کی اجازت دے دی۔

''ٹھیک ہے۔شکور کے ساتھ چلی جانا مگر میری بھی ایک شرط ہے۔تم بابر کی غیر موجودگی میں وہاں جاؤ گی۔''

''مجھے منظور ہے۔''میرا دل خوشی سے کھل اٹھا۔آج فیصل پر بہت پیار آ رہا تھا۔اس نے صحیح معنوں میں مجھے بیوی کا درجہ دیا تھا۔

☆......☆......☆

فیصل کے فیکٹری جانے کے بعد میں کچن کی صفائی کا کام کر رہی تھی جبکہ ملازمہ گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ جب ڈور بیل بجنے لگی۔

''حمیرا۔''میں نے حمیرا کو پکارا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں خود ہی ہاتھ دھو کر اپنے دوپٹے سے پونچھتی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک بیس بائیس سال کا قد آور نوجوان کھڑا تھا۔اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے فیصل کی نوجوانی کا عکس سامنے آ گیا ہو۔وہ یقیناً فیصل کا بیٹا دلاور تھا۔اس کے چہرے کے خدوخال میں فیصل کی گہری شباہت پائی جاتی تھی۔ اسے اچانک غیر متوقع طور پر سامنے دیکھ کر میں بوکھلا گئی۔

''کون ہو تم؟ کس سے ملنا ہے؟''میں نے آواز میں درشتی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''اندر تو آنے دو چھوٹی امی۔'' وہ دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا۔''بھئی واہ!اس والی امی کو تو کافی ٹھاٹ باٹ سے رکھا ہوا ہے ڈیڈ نے۔'' وہ ہنسا۔اس کی ہنسی میں مجھے بیک وقت طنز،استہزا اور غصے کی آمیزش دکھائی دی۔

''کون ڈیڈ؟''میں نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی معصومیت سے سوال کیا۔

''چودھری فیصل عرف زنانی مارکہ عیاش اور بدخصلت انسان۔''اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر زہر میں بجھے لہجے میں ادا کیا۔

''تم......دلاور ہو؟ فیصل کے بیٹے؟''میں نے تھوک نگل کر پوچھا۔اس کا سفاک رویہ اور زہریلے الفاظ مجھے ہراساں کر رہے تھے۔

وہ ابھی تک لیونگ روم میں کھڑا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔میرا سوال سن کر میری طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تمہیں ابھی تک شک ہے کہ میں دلاور نہیں ہوں۔؟ تم جیسی آوارہ عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کی ولدیت کو شک کی نگاہ سے دنیا دیکھ سکتی ہے مگر میری ماں جیسی اعلیٰ نسب اور خاندانی عورتوں سے ان کی اولاد کی ولدیت پوچھنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔''

اس کی آواز جیسے کسی سانپ کی پھنکار سے مشابہہ تھی۔ اور ایک ایک لفظ جیسے کسی سریع الاثر زہر میں بجھا ہوا۔ اس کا رویہ میرے ساتھ بہت ہتک آمیز اور ذلت بھرا تھا۔

''مجھے نہ تم سے کوئی دلچسپی ہے نہ تمہاری اس اعلیٰ نسب خاندانی ماں سے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔'' میں انگلی دروازے کی طرف کر کے چلائی۔

میرے چلانے پر ملازمہ گوہر کو گود میں اٹھائے باہر آ گئی۔ میں نے اسے فوراً واپس اندر جانے کے لیے کہا تو وہ پھر سے کمرے میں چلی گئی۔

''چھوٹی امی تو کافی گرم مزاج کی لگتی ہے۔'' وہ باچھیں پھیلا کر ہنسنے لگا اور ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

''یہ میرے باپ کا گھر ہے اور کوئی بھی راہ چلتا ایرا غیرا نتھو خیرا مجھے یہاں سے زبردستی نہیں نکال سکتا۔'' اب وہ اپنی باریک باریک مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور آنکھوں میں خباثت بھر کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پاس کھڑی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

ابھی فیصل کے ابا کی آمد کی کڑواہٹ دماغ سے اتری نہ تھی، اوپر سے بیٹا آ گیا تھا۔ اور یہ دادا سے بھی چند ہاتھ آگے تھا۔ لگتا ہے فیصل کے خاندان میں ایک دوجے سے بڑھ کر نمونے پائے جاتے ہیں۔ میں زیر لب بڑبڑائی تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''دیکھو دلاور! تمہارا باپ اس وقت یہاں موجود نہیں اور اس کی غیر موجودگی میں تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔'' میرا لہجہ اب قدرے نرم تھا۔

''چلا جاؤں گا چھوٹی امی۔ آپ نے تو ایک ہی رٹ پکڑ لی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ بھئی مہمانداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کوئی چائے کوئی پانی وغیرہ۔ اور پھر ابھی تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بھی ملنا ہے۔'' وہ خباثت سے ہنسا۔

''کون سا چھوٹا بھائی؟ کوئی چھوٹا بھائی نہیں ہے تمہارا۔'' مجھے اپنی ٹانگیں بے جان سی ہوتی محسوس ہوئیں۔ میں پاس رکھے صوفے پر گر سی گئی۔

''وہی چھوٹا بھائی۔ جسے نوکرانی باہر لائی تو آپ نے اسے واپس اندر بھیج دیا۔ جسے پیدا کر کے میرے باپ نے ہماری جائیداد میں ایک اور حصہ دار بنا ڈالا۔'' وہ زہر خند سے بولا۔

''وہ تمہارے باپ کا بچہ نہیں ہے۔'' میں نے اٹک اٹک کر جملہ مکمل کیا۔

''اچھا جی۔ پھر کس کا ہے؟'' اس نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''وہ میرا بیٹا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ میرے پہلے شوہر سے ہے۔'' میں بوکھلا چکی تھی۔

''تو اب ابا عورتوں کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی پالنے لگا۔ بھئی واہ۔ کافی خدا ترس ہو گیا چودھری فیصل۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''جا رہا ہوں میں۔ اور یہ مت سمجھنا کہ دوبارہ یہاں نہیں آؤں گا۔'' وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے باہر نکل گیا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

شام کو فیصل کو دلاور کے آنے کی اطلاع دی تو بھی پریشان ہو گیا۔

''وہ حرام خور یہاں کیا لینے آیا تھا؟'' وہ زیر لب اسے گالیاں دینے لگا۔

''یقیناً بڑے چودھری نے اسے یہاں کا ایڈریس دیا ہوگا۔'' میں نے اپنا شک ظاہر کیا۔

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔'' فیصل نے میرے شبہے کی تردید کی۔ ''اس کے اپنے ذرائع معلومات بھی خاصے طاقتور ہیں اور پھر ویسے بھی اس کا زیادہ وقت لاہور ہی میں گزرتا ہے''

''اس کا وقت کہاں گزرتا ہے یا وہ اپنے وقت کو کیسے گزارتا ہے، مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں۔ بس وہ دوبارہ یہاں نہیں آنا چاہیے۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسے سمجھانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' فیصل نے لاپرواہی سے جواب دیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی یہ کوشش زیادہ بار آور ثابت نہیں ہونے والی۔

اس بات کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا کہ دلاور فیصل کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ بلکہ فیصل پر اتنی چڑھائی کر چکا تھا کہ فیصل اب اس سے دبنے لگا تھا اور شاید کسی حد تک اس سے دل ہی دل میں خائف بھی رہنے لگا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ اس کی پشت پر رقیہ جیسی زور آور ماں کا ہاتھ تھا۔

وہ اس بات سے میرا دھیان ہٹانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا اور میں نے بھی اس موضوع کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا اور پھر گوہر کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئی۔

''آج کھانے میں کیا بنایا ہے؟''

''مٹن کورمہ۔'' میں نے نارمل سے انداز میں جواب دیا۔

''واہ۔ کھانا لگاؤ۔ بڑی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔''

کھانا کھانے تک میرا موڈ کافی حد تک بحال ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے فیصل سے پوچھا۔

''کیا کل فوزیہ کے ہاں چلی جاؤں؟''

''ہاں چلی جانا۔لیکن زیادہ دیر وہاں مت بیٹھنا۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے دن فیصل دفتر چلا گیا۔اس کی ہدایت کے مطابق شکورا سے چھوڑ کر گاڑی واپس لے آیا۔میں اس کے واپس آنے تک گوہر کو تیار کر کے خود بھی کپڑے بدل چکی تھی۔ہلکا پھلکا میک اپ کیا اور گوہر کو اٹھاوے باہر نکل آئی،بیرونی دروازے کو لاک کیا اور لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔گاڑی میں بیٹھی۔گاڑی اب بابر کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔وہ گھر جو کبھی میرا بھی گھر تھا اور جس گھر سے مجھے دھکے دے کر اور زدوکوب کر کے نکالا گیا تھا۔

جب گاڑی ان جانے پہچانے راستوں پر گزرنے لگی تو دل کی عجیب سی حالت ہوگئی۔شکور کو راستہ بتاتی گئی اور وہ بابر کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔میں گوہر کو اٹھائے گاڑی سے اتری تو دل بہت تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔چند لمحوں تک لوہے کے اس بوسیدہ پیلے دروازے کو دیکھتی رہی۔جس کا رنگ و روغن گردش ایام کی چیرہ دستیاں سہتے ہوئے اپنی چمک دمک کھو چکا تھا۔

ہمت کر کے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔بیل کی کرخت آواز اندر سے زیادہ شاید باہر سنائی دیتی تھی۔میں دل کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔دروازہ بابر کی ماں نے کھولا۔وہ چند لمحوں تک چندھیائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔میرے چہرے پر چھائی آسودگی اور تمکنت اور جسم پر قیمتی لباس اور گود میں اٹھایا ہوا گوہر،سبھی کچھ تو نا قابل یقین تھا اس کے لئے۔وہ کچھ لمحوں تک خود کو یہی تکلیف دہ یقین دلاتی رہی کہ اس کی آنکھیں کوئی انوکھا خواب دیکھ رہی ہیں۔

یقیناً بابر میری فیصل سے شادی کے متعلق اپنے گھر میں بتا چکا تھا۔بڑھیا چند لمحوں تک گھورنے کے بعد ایک طرف ہوگئی اور میں نے گھر کے اندر قدم رکھ دیا۔فوزیہ سامنے صحن میں چارپائی پر بیٹھی ایک لاغر اور بیمار بچی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔بچی بہت رو رہی تھی اور وہ اسے چپ کراتے کراتے خود بھی ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر فوزیہ کی حالت بھی اپنی ساس جیسی ہوگئی۔وہ کھڑی ہوگئی اور اب پتھر کا بت بنی مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''کیسی ہو فوزیہ؟''میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ میرے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کچھ دیر تک میں نے اسے رونے دیا۔میری آنکھیں بھی اشکبار ہو چکی تھیں۔تھوڑی دیر تک اسے اپنے ساتھ لپٹائے روتی رہی پھر میں نے اسے الگ کیا اور چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔اس نے اس روتی بلکتی بچی کو پھر سے اٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔بابر کی اماں ابھی تک صحن میں کھڑی ہم دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔میں اس کے کمرے میں پہنچی تو اس نے بچی کو بیڈ پر لٹایا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے دواؤں کے ڈھیر میں سے ایک سیرپ اٹھایا۔اس میں سے ایک چمچ بھر کے بچی کے منہ میں انڈیلا اور اسے پھر سے بہلانے لگی۔

بچی تکلیف کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔تھوڑی دیر تک وہ غنودگی محسوس کرنے لگی۔یقیناً وہ سیرپ درد کش اور خواب آور تھا۔ تھوڑی دیر بعد بچی اس کے کندھے سے لگی سوگئی۔اس نے بچی کو بیڈ پر لٹایا اور اس کے اوپر کمبل دے دیا۔اب وہ میرے پاس آبیٹھی اور میری گود میں بیٹھے ہوئے گوہر کو اٹھالیا۔اس کا چہرہ چوم کر پوچھنے لگی۔

''بانو! یہ بچہ کس کا ہے۔بہت پیارا ہے ماشاءاللہ۔''

''یہ بچہ میرا ہے۔''میں نے مسکرا کر جواب دیا۔یہ سن کر وہ حیران ہوگئی اور بے یقینی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''کیا کہہ رہی ہو۔تمہارا بچہ......مگر......؟''

''مگر کیا یہی نا کہ میں ماں نہیں بن سکتی تھی مگر دیکھو بن گئی۔اللہ جب کسی کو نوازنے پر آتا ہے تو کچھ بھی نواز سکتا ہے۔وہ بھی، جو انسان کے تصور سے بالاتر ہوتا ہے۔''

''یہ اس کی پہلی بیوی سے ہوگا۔''وہ مستفسر ہوئی۔

''چلو چھوڑو یہ باتیں۔تم بتاؤ کیسی گزر رہی ہے، بابر کے ساتھ خوش تو ہونا؟''

یہ بات سن کر اس کا چہرہ لٹک گیا۔آنکھیں پھر سے نم ہوگئیں۔

''کیا بتاؤں بانو۔اس بچی کی بیماری نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ڈاکٹروں کے پاس جاجا کر اجڑ چکے ہیں۔بابر اپنی فیکٹری سے بھی اتنا قرض لے چکا ہے کہ شاید اسے چکانے کے لئے یہ مکان بیچنا پڑے۔ڈاکٹر آپریشن بتاتے ہیں۔آپریشن پر بھی تین چار لاکھ کا خرچہ آئے گا تو یہ مکان بیچ کر قرضہ بھی اتر جائے گا اور آپریشن بھی ہوجائے گا۔''

میں مغموم چہرہ لیے اپنی عزیز از جان سہیلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔جو اولاد کی تکلیف پر بہت دکھی تھی جس کی ممتا تڑپ رہی تھی۔

''اچھا چھوڑو یہ باتیں، یہ بتاؤ کیا پیوگی۔چائے کہ ٹھنڈا۔''اس نے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

''ایک کپ چائے کا پلادو۔''میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔وہ بھی مسکرا کر بولی۔

''اچھا ابھی لائی۔''وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور میں گوہر کے ساتھ توتلی زبان میں باتیں کرنے لگی۔

دس منٹ بعد وہ چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھے اندر آئی۔ہم دونوں چائے پینے لگیں۔

''مجھے بابر نے بتایا تھا کہ تم نے فیکٹری کے مالک سے شادی کر لی ہے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ تم اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ایک دن فیکٹری بھی آئی تھی۔''

میں نے صرف سر کو اثبات میں جنبش دی تو وہ پھر ہولے سے بولی۔

''کیا تم بابر سے ملی تھی؟''

''فیکٹری میں دیکھا تھا اسے مگر اس کی ابتر حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا اور اسی کی زبانی، تمہاری بچی کی کنڈیشن کے بارے میں پتا چلا۔''

میں نے چائے پیتے ہوئے کچھ اور ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر خالی کپ تپائی پر رکھ دیا۔ اپنے ہینڈ بیگ سے پانچ لاکھ کا چیک نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ پریشان نظروں سے چیک کی طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا'' یہ میری طرف سے ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔ یہ چیک کیش کروا کر اپنی بیٹی کا علاج کرواؤ۔ اور ہاں بابر سے کہنا فیکٹری کے قرضے کے لیے بھی زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے فیصل سے بات کر لی ہے اس حوالے سے بھی۔ ہر ماہ اس کی تنخواہ سے ایک قلیل رقم کاٹ لی جائے گی، بطور قرضے کی قسط۔''

وہ میری طرف احسان مند نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ احساس تشکر سے اس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور آنکھیں چھلک اٹھیں۔ میرے ہاتھوں کو پکڑ کے چومنے لگی۔

''کتنی ڈھیٹ ہو تم بانو! اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اتنا بڑا احسان کرنے جا رہی ہوں۔ اب ساری زندگی مجھے اس احسان کے نیچے دب کر رہنا ہوگا۔''

''یہ بات دل میں بٹھا لو فوزیہ، یہ احسان نہیں......اور یہ بھی کہ، یہ سب کچھ میں تمہاری خاطر کر رہی ہوں۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔'' میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔ وہ میرے گلے لگ گئی۔

''تم بہت عظیم عورت ہو بانو۔ اس دوستی کو نبھانے چلی آئی جس کی چتا میں کب کی جلا کر راکھ کر چکی تھی۔''

''اچھا یہ رونا دھونا بند کرو اور اپنے موبائل فون میں میرا نمبر سیو کر لو۔ تمہیں جب بھی میری ضرورت پڑے مجھے پکارنا میں تمہاری ایک آواز پر دوڑی چلی آؤں گی۔''

اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا اپنا موبائل اٹھایا اور میرا بتایا ہوا نمبر سیو کر لیا۔ اس کے بعد میں جانے کیلئے کھڑی ہوگئی۔ جانے کی اجازت چاہی تو وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ میرے ہاتھ تھام کر بولی۔

''بانو! تم بہت بدل چکی ہو۔''

''وہ کیسے؟'' میں مسکرائی۔

''تم اب پہلے جیسی بانو نہیں رہی، جو ہر وقت ڈری سہمی اور سمٹی سمٹائی سی رہتی تھی۔ اب تم ایک پروقار اور بارعب رئیس زادی لگ رہی ہو۔ اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے اور تم اسی طرح ہنستی مسکراتی رہو۔ میں تو ہمیشہ تمہیں دعائیں دیتی رہوں گی۔''

میں نے اس کا شانہ تھپکا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

صحن سے گذر رہی تھی جب مجھے محسوس ہوا کہ چھوٹے کمرے کی کھڑکی کی جالی سے لگی دو موٹی موٹی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ بابر کی اماں اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ فوزیہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ جب میں اپنی بڑی سی گاڑی میں بیٹھی تو اس نے الوداعی انداز میں اپنا ہاتھ ہلایا۔

میں نے بھی گاڑی میں بیٹھ کر اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا پھر شکور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ان گلیوں کوچوں سے نکلتے ہوئے میرا دل اب بہت مطمئن انداز میں دھڑک رہا تھا۔ مجھے اس وقت وہی خوشی اور طمانیت محسوس ہو رہی تھی جو کسی بھی نیکی کرنے والے کے حصے میں آتی ہے۔

☆......☆......☆

''بانو! کیا تم واقعی عظیم ہو یا عظیم ہونے کا ڈرامہ کر رہی ہو؟'' میڈم نے شرارت سے پوچھا تو میرے چہرے کی رنگت سرخ ہو گئی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں میڈم؟ وہ میری دوست ہے۔ میرے بچپن کی سہیلی ہے۔ اس کی مدد کر کے مجھے بہت خوشی ملی ہے۔ میں اسے کیسے تکلیف میں دیکھ سکتی ہوں۔''

''او کے سیریس مت ہو جانا۔ میں تو مذاق کر رہی ہوں۔''

''اچھا میڈم یہ بتائیں! کیا کھائیں گی، کیا پیئیں گی؟''

''کھا تو کچھ نہیں سکتی۔ معدے کی تکلیف نے کچھ کھانے کے قابل کہاں چھوڑا ہے۔ صبح ہلکا پھلکا ناشتہ کرتی ہوں تو سارا دن بھوک نہیں لگتی۔ رات کو جا کر کھانا کھاتی ہوں۔ البتہ چائے سارا دن چلتی ہے۔''

''او کے میں ابھی چائے بنا کے لائی۔'' میں کچن کی طرف چل دی۔

چائے پینے کے دوران میڈم فیصل کے رویئے سے متعلق کرید کرید کر سوال پوچھتی رہی اور میں بتاتی رہی۔

''مجھے لگتا ہے دل کا برا نہیں ہے بس کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔''

''ہاں ویسے تو مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس شراب پی کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ایک دم نیا روپ دھار لیتا ہے۔''

''تم نے تو اس کی ساری شراب کی بوتلیں باہر پھینک دی تھی نا؟ تو اب کیا کرتا ہے؟''

''کم کم پیتا ہے......لیکن مکمل طور پہ باز نہیں آتا۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ تو پی کر ہی گھر آتا ہے۔''

''اب پینے کے بعد اس کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟''

''ویسا ہی جیسے پہلے ہوا کرتا تھا مطلب گالی گلوچ کرنا اور چیخنا چلانا اور پھر بدمست ہو کر سو جانا۔ اب تو میں اس کے اس رویے کی عادی ہو چکی ہوں۔ جب دیکھتی ہوں حالات بس سے باہر ہو رہے ہیں تو فوراً دو تین گولیاں کسی بھی لیکوئیڈ میں حل کر کے اسے پلا دیتی ہوں انٹاغفیل ہو کر صبح دس گیارہ بجے تک پڑا رہتا ہے۔''

میڈم کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"کافی شاطر ہوگئی ہو۔"

"تو کیا کروں میڈم؟ حالات نے شاطر بنا دیا۔ آخر زندہ بھی تو رہنا ہے نا۔"

پھر میں نے اسے اپنے سسر اور اپنے سوتیلے بیٹے سے ملاقات کا احوال سنایا تو وہ بہت حیران ہوئیں اور فکرمند بھی۔

"بانو مجھے یہ لڑکا ٹھیک نہیں لگتا۔ یہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گا۔"

"ہمم! مگر میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ فیصل کو کہہ دیا ہے کہ دوبارہ وہ یہاں کا رخ نہ کرے۔"

"اور فیصل کیا کہتا ہے؟"

"فیصل بھی اس لڑکے سے عاجز ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ اس کے بس سے باہر ہو چکا ہے۔"

میڈم یہ سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

"شبانہ کا کیا حال ہے میڈم؟ کیا وہ ملنے آتی ہے؟" میں نے میڈم کا دھیان بٹانے کی غرض سے شبانہ کا ذکر چھیڑ دیا۔

"ٹھیک ہے شبانہ۔ اور کبھی کبھار آ جاتی ہے ملنے۔ ریاض کے بچوں کے ساتھ کافی دل لگ چکا ہے اس کا۔ یہ بچوں کو ترسی ہوئی تھی اور وہ ماں کو۔ دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش ہیں۔"

ایک گھنٹہ بیٹھنے کے بعد میڈم چلی گئی۔ رات کو فیصل گھر آیا تو مجھے وہ کچھ پریشان سا دکھائی دیا۔

"کیا ہوا فیصل؟" میں نے اس کا کوٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟"

"رقیہ نے فون کیا تھا کہ ابا جی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ وہ بستر پر پڑ چکے ہیں۔ میں صبح گاؤں جا رہا ہوں۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" میں نے کوٹ کو ہینگر میں لگاتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"تم کیا کرو گی وہاں جا کر؟"

"بس ایسے ہی میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اپنے سسرال میں جاؤں۔ اپنے شوہر کا آبائی گھر دیکھوں۔ اس کے بچوں سے ملوں۔" میں نے ہینگر زدہ کوٹ کو الماری میں لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"دل نہیں بھرا ایک بچے سے مل کر؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"تمہارے ساتھ وہاں کچھ اچھا نہ ہوا تو میرے سامنے شکایت مت کرنا۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر جرابیں اتارنے لگا۔

میں نے اس کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"کپڑے وغیرہ بیگ میں رکھ لوں ایک دو دن وہاں رکیں گے نا۔"

''ٹھیک ہے۔مگر......اگر اباجی کی طبیعت نہ سنبھلی تو اس سے زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔''

''اور اگر طبیعت آج رات کو ہی زیادہ بگڑ گئی تو؟''میں نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں نے رقیہ سے پوچھا ہے۔ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔تم اپنے اور گوہر کے کپڑے وغیرہ بیگ میں ڈال لو۔صبح سویرے نکل چلیں گے۔''

☆......☆......☆

ہماری گاڑی گاؤں کی طرف جانے والی ذیلی سڑک کی طرف مڑی۔گاؤں کی یہ سڑک پختہ اور بہت شاندار تھی۔یقیناً فیصل نے اپنا ایم پی اے ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

گاڑی گاؤں میں داخل ہوئی تو وہاں کی ہر گلی مجھے پختہ اور کشادہ دکھائی دی۔

یہ گاؤں عام دیہاتوں کی بہ نسبت پختہ اور قدرے صاف ستھرا تھا۔گاؤں کے آخری سرے پر فیصل کی آبائی حویلی پوری شان و شوکت اور کروفر سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔اسے گاؤں کے دوسرے مکانوں اور عمارتوں میں وہی اہمیت حاصل تھی جو دوسری مغل ملکاؤں میں، ملکہ نور جہاں کو حاصل ہے۔

گاڑی وسیع وعریض پورچ میں جا کھڑی ہوئی۔ جہاں پہلے بھی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ان میں ایک لینڈ کروزر اور دوسری ہونڈا سوک تھی۔حویلی ڈیڑھ ایکڑ کے وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔حویلی کی عمارت کے اطراف میں امرود اور جامن کے درخت لہلہا رہے تھے۔میں گاڑی سے باہر نکلی اور گوہر کی انگلی تھام لی۔

وہ پاؤں پاؤں میرے ساتھ چلنے لگا۔اس کے لڑکھڑاتے قدم دیکھ کر میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔فیصل بھی گاڑی کا انجن بند کر کے باہر آ گیا۔حویلی میں کام کرتے ہوئے دو تین ملازم اس کی طرف بڑھے ہاتھ اٹھا کر اسے فرشی سلام کیا۔اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دیا اور قدم آگے کی طرف بڑھائے۔میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کوٹھی کی اندرونی عمارت کی طرف بڑھی۔

بھاری بھرکم چوبی دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوئے تو سامنے لاؤنج میں ایک عورت صوفے پر بیٹھی دکھائی دی۔عورت کیا تھی گوشت کا ایک پہاڑ تھی جو صوفے پر رکھا تھل تھل کر رہا تھا۔گہری سانولی رنگت پر موٹے اور بھدے نقوش اس کے چہرے کی کرختگی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔اس عورت کے قدموں میں ایک ملازمہ بیٹھی اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔اس فربہ اندام عورت نے ہمیں دیکھا تو ملازمہ کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ہم قریب گئے تو فیصل نے پوچھا۔

''رقیہ اباجی کا کیا حال ہے؟''

فیصل کے مخاطب کرنے سے پہلے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ یہی ''چودھرانی رقیہ'' ہے۔

''ابا جی اپنے کمرے میں ہیں۔'' رقیہ نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے ناقدانہ نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور اپنے چہرے پر ابھرنے والے ناگواری کے تاثرات کو چھپانا اس نے ضروری نہ سمجھا۔ وہ قہرناک نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ اس کی نگاہیں جیسے میرے جسم میں چھید کرنے کی کوشش رہی تھیں۔

میں نروس نہ ہوئی، دل کڑا کر کے خود اعتمادی سے اس کے سامنے تن کر کھڑی رہی اور اس کو سلام کیا۔ سلام کرتے وقت میں نے آواز میں حتی الامکان شائستگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے بڑے بھونڈے طریقے سے میرے سلام کا جواب دیا۔

فیصل نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگی۔ اب ہم ایک راہداری میں چل رہے تھے۔ جس میں دائیں بائیں دونوں طرف دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ فیصل تیسرے دروازے پر جا کر رک گیا۔ اس نے ہلکی آواز میں دروازے پر دستک دی۔

اندر سے بڑے چوہدری صاحب کی آواز آئی۔ وہ غالباً ملازم کو دروازہ کھولنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ ایک دو منٹ کے بعد ایک نوعمر لڑکے نے دروازہ کھول دیا۔ ہمیں سامنے کھڑا دیکھ کر وہ مؤدب انداز میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

ہم اندر داخل ہو گئے تو اس نے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ اندر ایک کنگ سائز بیڈ پر بڑے چوہدری صاحب آرام فرما تھے۔ وہ کمبل اوڑھے دو تین تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے۔ ان کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ ہم ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

''ابا جی! آپ کو کیا ہوا؟'' فیصل باپ کی طرف بڑھا۔ جب کہ میں پائنتی جانب خاموشی سے کھڑی رہی۔

''کچھ نہیں پتر۔ آندھی میں رکھا ہوا چراغ ہوں۔ نجانے کس وقت بجھ جاؤں۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں ابا جی؟'' فیصل ان کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگا۔

میں نے بھی دور سے سلام کیا تو انہوں نے اشارے سے پاس بلایا۔ میں جھجکتی ہوئی ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ انہوں نے ہاتھ اٹھایا تو میں نے سر نیچے کیا۔ انہوں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔

''کیسی ہو بہو؟''

''ٹھیک ہوں ابا جی۔'' میں نے یہ لفظ پہلی بار اپنے سسر کے لیے استعمال کیا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ کھڑے گوہر کو اپنی طرف بلایا۔ میں نے گوہر کو ان کے قریب کیا تو انہوں نے اپنے ساتھ لگا کر اس کا منہ چوم لیا۔

''میرا شہزادہ پوتا۔'' وہ بڑے دلار سے بولے اور فیصل کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

''فیصل! چھوٹی بہو پہلی بار اس گھر میں آئی ہے۔اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔''

''جی ابا جی۔''اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

مجھے فیصل نے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔میں بیٹھ گئی۔تھوڑی دیر تک وہ اپنے ابا جی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔انہیں ان کی بیماری کے حوالے سے تسلیاں دیتا رہا اور پھر مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔میں اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔راہداری میں چلتے ہوئے اس نے ایک اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھل گیا۔میں اس کے ساتھ اندر چلی آئی۔

''یہ میرا کمرہ ہے۔''

''تمہارا اور رقیہ کا نہیں؟''

''نہیں،صرف میرا۔''

''کیا مطلب؟ جب تم یہاں آتے ہو تو اکیلے سوتے ہو؟''

''ہاں،میں یہاں اکیلا سوتا ہوں۔وہ اپنے کمرے میں سوتی ہے رانی کے ساتھ۔''

''مگر......ایسا کیوں۔؟''میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''بس جب اسے میری ضرورت محسوس ہوتی ہے تو میرے کمرے میں چلی آتی ہے۔''اس نے لاپرواہ انداز میں شانے اچکائے۔

''اچھا اور تمہیں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟''

''نہیں،اسے دیکھ کر تم سمجھ ہی گئی ہو گی۔''وہ ہنسا تو میں بھی مسکرانے لگی۔

''ہاں! زندگی میں پہلی بار تم سے ہمدردی محسوس ہوئی۔''میرا لہجہ شوخ تھا۔

''تمہارے ساتھ اس کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔اس بات کا اندازہ ہو گیا مجھے۔''اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔''خیر تمہیں مضبوط ہونا پڑے گا وہ اس سے بھی زیادہ برا سلوک کر سکتی ہے۔''

''میری فکر مت کرو۔تمہارے ساتھ رہتے رہتے کافی مضبوط ہو چکی ہوں۔اب میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔''

''اوہ میری بہادر بیگم۔''اس نے سراہنے والے انداز میں میرا شانہ تھپکا۔

''تمہارا چھوٹا بیٹا اور بیٹی نظر نہیں آئے۔وہ کہاں ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''مل لینا۔سب سے مل لینا۔ابھی آرام کرو۔''یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں گوہر کو بیڈ پر لٹا کر اس کے ساتھ لیٹ گئی اور اسے سلانے کی کوشش کرنے لگی۔اس وقت میں نیم غنودگی کی حالت میں تھی جب مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے کمرے میں جھانکا ہے۔

میں پلکوں کی اوٹ سے دیکھنے لگی۔ یہ ایک تیرہ چودہ سال کی کیوٹ سی لڑکی تھی جو دروازے کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔ مجھے سوتا دیکھ کر شاید واپس پلٹنے ہی والی تھی کہ میں نے آواز دے کر اندر بلا لیا۔

وہ جھجکتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ ایک خوبصورت اور گوری چٹی لڑکی تھی۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ یہی فیصل کی بیٹی رانی ہے۔

''تم رانی ہو نا؟''میں نے تصدیق کرنا چاہی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔

''رانی! یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''آپ میری چھوٹی امی ہیں نا؟''اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں۔ میں تمہاری چھوٹی امی ہوں۔''

''اور یہ یہ میرا بھائی ہے نا؟''اس نے گوہر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''یہ تمہارا بھائی ہے۔۔اس کا نام گوہر ہے۔''

وہ خوش ہو گئی۔

''مجھے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ کئی بار بابا کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی ہوں اور انہوں نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ مجھے آپ سے ضرور ملوائیں گے۔''اس کے لہجے سے میرے لیے محبت اور احترام جھلک رہا تھا۔

''آپ کو ہماری حویلی کیسی لگی؟''

''بہت بڑی اور خوبصورت۔''میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اور میری امی۔؟''

اس کے اس سوال کا جواب دینا مجھے قدرے مشکل لگا۔

''وہ بھی اچھی ہیں مگر مزاج کی تھوڑی تیز لگتی ہیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

''ہاں جی۔ کافی گرم مزاج ہیں۔''

''اور تمہارے ابو؟''میں نے کریدا۔

''ابو۔ کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈے۔''وہ شرارت سے بولی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ...... میرے اور سجاول بھائی کے ساتھ ٹھنڈے جبکہ امی اور دلاور بھائی کے ساتھ گرم۔''

اس کی بات سن کر میں بے ساختہ ہنسنے لگی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگی۔

رانی میرے پاس تقریباً آدھا گھنٹہ بیٹھی رہی۔ اس نے مجھے بہت سی باتیں سنائیں۔ اپنے ابو کی، اپنی امی کی اور اپنے دادا جی کی۔ اس کی زبانی مجھے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ رانی واقعی ایک خوش مزاج اور خوش اطوار لڑکی تھی۔ مجھے اس سے ملنا اور بات کرنا بہت اچھا لگا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں پھر سے لیٹ گئی۔



ناول ''تہی دامن'' ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 6

کچھ دیر بعد ایک ملازمہ ایک بڑی ٹرے اٹھائے اندر آئی۔ جس میں چائے کے ساتھ کچھ دوسرے لوازمات بھی تھے۔ وہ ٹرے میرے پاس پڑے ہوئے ٹیبل پر رکھ کے خاموشی سے واپس چلی گئی۔ مجھے اس وقت واقعی چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر چائے پینے لگی۔ مجھے اب اس کمرے میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ باہر حویلی میں جاؤں اور گھوموں پھروں۔

کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔ باغیچے میں بلند و بالا درختوں کے علاوہ چھوٹے موٹے پودے بھی موجود تھے۔ ایک مالی ان پودوں کی دیکھ ریکھ میں مصروف تھا۔ گلاب اور موتیے کے پودوں پر خوشنما پھول لگے ہوئے تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ موسم بڑا سہانہ ہو رہا تھا۔ لان کا دیدہ زیب نظارہ دیکھ کر باہر جانے کی خواہش نے شدت پکڑ لی لیکن اکیلے جاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت رانیہ کی آمد نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا دیکھ رہی ہیں؟''

''تمہاری حویلی میں لگے ہوئے پودوں کو دیکھ رہی ہوں۔ کتنے خوبصورت پھول لگے ہوئے ہیں ان پر۔''

''تو باہر چل کر دیکھیں نا۔ یہاں سے کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں چلو! میں بھی پوری حویلی گھوم پھر کر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''چلیں آئیں میرے ساتھ۔ میں آپ کو دکھاتی ہوں۔''

اچانک گوہر کے غوں غاں کرنے کی آواز کانوں میں پڑی تو میں پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ وہ بیڈ پر بیٹھا تالیاں بجا رہا تھا اور ساتھ مسکرا رہا تھا۔ وہ ایسا ہی بچہ تھا، نہ سونے سے پہلے روتا تھا اور نہ جاگنے کے بعد۔ بلکہ اکثر آنکھ کھلنے کے بعد مسکرانے لگتا تھا۔ میں نے گوہر کو اٹھایا اور رانیہ کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔

پہلے رانیہ نے حویلی کے کمرے دکھانے شروع کیے۔ جن میں سسر جی کا کمرہ تو میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس نے مہمانوں والا کمرہ دکھایا جو ڈرائنگ روم کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد ڈرائنگ روم دکھایا۔ جس کی دیواروں پر تین چار بڑے سائز کے پورٹریٹ لگے ہوئے تھے۔ یہ ماضی بعید کے ان چوہدریوں کی تصویریں تھیں جو یکے بعد دیگرے دنیا میں آئے اور جاہ و حشمت کے رنگ دکھا کر فنا ہو گئے۔ جن کی شکلیں تو مختلف تھیں مگر ایک قدر سب میں مشترک تھی۔ ان کی پگڑیوں کے اونچے کلف زدہ شملے اور ان کے چہروں پر دکھائی دینے والی رعونت۔

وہاں سے نکلنے کے بعد ایک اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہ ایک سادگی سے سجا ہوا خوبصورت سا بیڈ روم تھا۔

''یہ میرے سجاول بھائی کا کمرہ ہے۔'' رانیہ کے لہجے میں اپنے سجاول بھائی کے لئے بہت سارا پیار جھلک رہا تھا۔

''اچھا ہے۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے تعریف کی۔

''سجاول بھائی کہاں ہیں؟'' میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''وہ تو حسن ابدال ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ کیا ابو نے آپ کو نہیں بتایا؟''

''شاید بتایا ہو میرے ذہن سے نکل گیا ہو۔'' مجھے دل میں اب فیصل پر غصہ آ رہا تھا. جس نے اتنی اہم بات مجھے بتانا ضروری نہ سمجھا تھا۔

''کب سے ہے وہ ہوسٹل میں؟''

''انہیں تو چھ ماہ سے بھی زیادہ ہو گئے۔ مہینے بعد گھر کا چکر لگاتے ہیں۔''

''اچھا۔''

پھر اس نے دلاور کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ دلاور کے کمرے میں داخل ہوتے وقت مجھے عجیب سی گھبراہٹ کا احساس ہونے لگا اور دل میں شکرادا کیا کہ اس وقت وہ گھر میں موجود نہیں ہے۔ اس لڑکے سے ایک ہی ملاقات نے میرے دل میں اس کی ہیبت بٹھا دی تھی۔ دلاور کے کمرے کا چکر لگا کر ہم باہر آ ئیں۔ اس سے اگلا کمرہ تھوڑے فاصلے پر تھا۔

وہ کمرہ شاید رانیہ اور اس کی امی کا تھا۔ اس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کا انداز دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''یہ کس کا کمرہ ہے؟''

''یہ امی کا اور میرا مشترکہ کمرہ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر رہنے دو۔ تمہاری امی اعتراض کریں گی۔'' میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''نہیں کریں گی۔'' وہ مسکرائی۔

''تمہاری امی اس وقت کہاں ہیں؟''

''وہ اندر ہی ہیں۔''

''تو پھر رہنے دو۔'' میں نے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا مگر میرے منع کرنے کے باوجود وہ دروازہ کھول چکی تھی اور اندر بھی داخل ہو چکی تھی۔ چار و نا چار مجھے بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر جانا پڑا۔

میں نے دیکھا۔ چودھرانی رقیہ بیڈ پر نیم دراز کسی انڈین ڈرامے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''امی! دیکھیں ذرا چھوٹی امی آئی ہیں۔'' رانیہ پر جوش لہجے میں اسے میری آمد کا بتانے لگی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے ایک نخوت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر سے ٹی وی دیکھنے لگی۔ میں اپنے ساتھ اس کا ہتک آمیز رویہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی اس لیے زیادہ حیرانی نہ ہوئی۔

''چھوٹی امی! آپ ادھر بیٹھیں نا۔ کھڑی کیوں ہیں؟'' رانیہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس بچی کا دل رکھنے کے لئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ یہی سوچا کہ چند منٹ بیٹھ کر چلی جاؤں گی مگر چودھرانی دل میں نجانے کب سے خار کھائے بیٹھی تھی۔

''رانیہ! کچن میں جا کر دیکھو۔ ہاجرہ نے شام کے کھانے کی تیاری کر لی اور اس کی تیاری کہاں تک پہنچی۔''

''جی امی!'' رانیہ نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد چودھرانی رقیہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ اب اس کے چہرے پر رعونت زدہ مسکراہٹ مزید گہری ہو چکی تھی۔

''چودھری فیصل کی عیاشیاں تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جتنا کماتا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ بازاری عورتوں پر لٹا دیتا ہے۔ ہاں مگر تمہاری ڈھٹائی اور خود اعتمادی کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ جو پورے طمطراق کے ساتھ چودھری کے شانہ بشانہ چلتی ہوئی، گود میں اس کا ناجائز بچہ اٹھائے، اس حویلی تک آ پہنچی۔ آج سے پہلے چوہدری کی کسی رکھیل نے اتنی جرأت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔'' اپنی باتوں پر وہ خود ہی ایک زہریلی ہنسی ہنس دی۔ اس کی باتوں اور گھٹیا انداز پر میرا خون کھول اٹھا۔ کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

''میں رکھیل نہیں ہوں۔ چوہدری کی منکوحہ بیوی ہوں اور یہ میرا ناجائز بچہ نہیں ہے۔'' میں کھڑی ہوگئی اور طیش کے عالم میں جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

''چوہدری اگر تمہیں منہ نہیں لگاتا یا تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں گزارتا تو اس میں بھی سب سے بڑی غلطی تمہاری اپنی ہی ہے۔'' میں نے اپنے تئیں اس کی کم صورتی اور بد مزاجی پر گہری چوٹ کی۔

''منکوحہ بی بی! تمہارا منہ بند کرنے کے لئے اس نے دو کلمے کیا پڑھا لیے تم تو خود کو سچ مچ اس کی بیوی سمجھنے لگیں۔ بیوی کا مان اور مرتبہ حاصل کرنے کے لیے ایک مضبوط بیک گراؤنڈ، اعلیٰ نسل کا ہونا پہلی شرط ہے۔''

اسے شاید مجھ سے اس قدر جارحانہ رویے کی توقع نہیں تھی۔ میری باتوں نے اسے شعلہ جوالہ بنا دیا اور غصے کی شدت سے اس کی رنگت مزید کالی ہوگئی۔

''بیوی بننے کے لئے وہ دو کلمے ہی سب سے ضروری ہیں۔ اگر نکاح کرنے کے لیے، خاندانی جاہ وحشمت اتنی ضروری ہوتی تو

پھر عالی نسب خاندانی عورتیں اپنے شوہروں کی قربت حاصل کرنے کے لیے بڑی حویلیوں کی ان اونچی دیواروں کے پیچھے اکیلی نہ تڑپتی اور سسکتی رہتیں۔''

میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کمرے سے باہر نکل آئی۔اب میرا رخ اپنے کمرے یعنی فیصل کے کمرے کی طرف تھا۔

میں کمرے میں غصے سے بل کھاتے ہوئے چکر لگا رہی تھی جب رانی آئی۔

''کیا ہوا۔آپ واپس کیوں آ گئیں؟''

''کچھ نہیں۔گوہر رونے لگا تو واپس آ گئی۔''میں نے بہانہ بنایا۔میں اس پیاری سی لڑکی کا دل برا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''میں سمجھ گئی۔یقیناً امی نے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی ہے۔وہ ایسی ہی ہیں۔''رانی کا منہ اتر گیا۔

میں خاموش رہی۔تو وہ پھر بولی۔

''آیئے باہر باغیچے میں چل کر چہل قدمی کرتے ہیں۔آپ کی طبیعت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔''اس نے خوش دلی سے کہا۔

''نہیں رانی،میرا دل نہیں چاہ رہا اب۔''میں نے بھی اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''اپنی امی کے رویے کے لیے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔پلیز درگزر کر جائیں۔''وہ درخواست گزار لہجے میں بولی تو مجھے اس پر بے حد پیار آیا۔

''رانی!ایسی باتیں کر کے مجھے کیوں شرمندہ کر رہی ہو؟میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔یقین مانو۔''

میں نے اس کے گال پر پیار سے ہاتھ رکھا۔

''تو پھر آئیں میرے ساتھ باہر چلیں۔''اس نے اصرار کیا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گئی۔

''ہاں چلو چلتے ہیں۔''میں نے گوہر کو اٹھایا تو وہ بولی۔

''ٹھہریں۔آپ اسے اٹھا کر گھومیں پھریں گی تو تھک جائیں گی۔میں پرام لے کر آتی ہوں۔ایک منٹ ویٹ کریں۔''یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور چند منٹ بعد ایک بچہ گاڑی دھکیلتی ہوئی لے آئی۔

میں نے گوہر کو اس کے اندر بٹھا دیا اور پھر ہم دونوں پرام کو دھکیلتی ہوئیں کوٹھی سے باہر لان میں آ گئیں۔

''یہ پرام کہاں سے مل گئی تمہیں؟تمہارے گھر میں تو کوئی بھی چھوٹا بچہ موجود نہیں؟''

''یہ پرام میری ہے۔میرے بچپن کی حسین یادگار۔اور امی نے اسے بڑا سنبھال کے رکھا ہوا ہے۔کہتی ہیں کہ اس پرام پر دلاور بھائی کے بچوں کو کھلایا کریں گی۔''

رانیہ کی سنگت میں تھوڑی دیر لان کی چہل قدمی کی اور اس کی معصوم معصوم باتیں سنیں تو واقعی طبیعت پر بہت خوشگوار اثر پڑا۔مجھے

اس بات سے گونا گوں خوشی مل رہی تھی کہ رانیہ نہ صرف شکل وصورت سے بلکہ مزاجاً بھی اپنی ماں پر نہیں گئی تھی۔

''میرے ابو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' اس کے لہجے سے تفاخر جھلک رہا تھا۔

''تم ہو ہی اتنی پیاری اور اتنی اچھی کہ کوئی بھی تم سے پیار کیئے بنا رہ ہی نہیں سکتا۔'' میں نے بھی پیار بھرے لہجے میں جواب دیا تو وہ مزید کھل گئی۔

''سچ کہوں تو آپ خود بھی بہت اچھی ہیں۔ مجھے پسند آئی ہیں۔''

اس کے اس معصومانہ ریمارکس پر میں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پندرہ بیس منٹ گھومنے کے بعد ہم اندر چلی آئیں۔

☆......☆......☆

شام کو سات بجے فیصل نے اپنی شکل دکھائی۔

''کیسا گزرا دن؟'' وہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے شوز اور جرابیں اتارنے لگا۔

''اچھا گزر گیا۔ حالانکہ تمہاری بد مزاج بیوی نے اسے تلخ بنانے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' بات کرتے کرتے میرے لہجے میں بھی تلخی گھل گئی۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا میرے جانے کے بعد بھی کوئی بات ہوئی تھی؟''

''ہاں، لگی تھی چودھرانی مجھے رکھیل ہونے کے طعنے مارنے مگر میں نے بھی کوئی دید لحاظ نہیں کیا۔ جو منہ میں آیا کہہ دیا۔''

فیصل کا مسکراتا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے شوز اور جرابیں اتار کر ایک سائیڈ پر رکھیں اور کمرے میں رکھی ہوئی چپل پہن لی۔ اس کی خاموشی سے مجھے الجھن ہونے لگی۔

''آپ کو یقیناً مجھ پر غصہ آ رہا ہوگا کہ میں نے آپ کی بیگم کا لحاظ نہیں کیا مگر کیا کرتی۔ آخر برداشت کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے نا۔ اس نے منہ پھاڑ کر مجھے رکھیل کہہ دیا۔''

میں تائید طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''دیکھو مہر بانو! میں نے تمہیں اسی لیے یہاں آنے سے روکا تھا۔ رقیہ بہت کینہ پرور اور گھمنڈی عورت ہے۔ تمہاری اس کے آگے بولنے کی جرأت یقیناً اسے بہت ناگوار گزری ہوگی۔ اب وہ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جائے گی۔'' اس کے لہجے کی گمبھیرتا نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

''تو کیا میں چپ چاپ اپنی تذلیل سہتی رہتی؟ وہ چودھرانی رقیہ ہے۔ تو وہ کسی کو کچھ بھی کہہ سکتی ہے؟ اور میں...... میں کیا ہوں؟ کیا میں آپ کی بیوی نہیں؟ کیا میری کچھ حیثیت نہیں؟'' میری آواز نمناک ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ فیصل

کے رویے نے میرا دل توڑ دیا تھا۔اسی اثناء میں ایک ملازمہ نے دروازے پر دستک دینے کے بعد سر اندر گھسایا اور بولی۔

''صاحب جی! بیگم صاحبہ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''ہم آرہے ہیں۔'' فیصل نے ملازمہ کو جواب دیا تو وہ واپس چلی گئی۔

''اٹھو مہربانو! کھانا کھانے چلیں۔'' اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔آپ چلے جائیں۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا تو وہ اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا۔دائیں ہاتھ سے میری ٹھوڑی کو نرمی سے چھوا۔چہرہ تھوڑا اوپر اٹھایا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ جذباتی پن چھوڑو......اور اٹھو کھانا کھا کے آئیں۔''

میں نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔جہاں میرے لیے صرف پیار تھا اور کچھ نہیں۔میں نے پلکیں جھکا لیں۔اور پھر بولی۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' مگر اس بار میرے لہجے میں پہلے جیسی ہٹ دھرمی نہ تھی۔

''کبھی کبھی تو بالکل کسی ضدی اور خودسر بچے کی طرح ری ایکٹ کرنے لگتی ہو۔'' وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرایا۔

''یہ اس کی راجدھانی ہے اور وہ یہاں کی ملکہ......اور تم اس کی سوکن۔یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''وہ ملکہ......اور میں......میں کیا ہوں؟ ایک کنیز یا لونڈی؟'' اس کی باتوں سے میں پھر سے سلگ اٹھی۔

''ایک بادشاہ کی کوئی ایک ملکہ تھوڑی ہوتی ہے۔اس کی تو بہت سی ملکائیں ہوتی ہیں۔'' وہ میرے قریب ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے زچ کرنے میں اسے لطف آرہا ہو۔

''جب بادشاہ نے اپنی ہر ملکہ کے لیے الگ سے محل بنا رکھا ہے تو پھر ملکاؤں کو بھی تو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ ایک دوسرے کے محل میں جا کر آپس میں چونچیں لڑاتی پھریں۔''

''ہر ملکہ؟'' میرا ماتھا ٹھنکا۔''سچ بتاؤ ہم دونوں کے علاوہ اور کتنی ہیں؟''

میری بات سن کر وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔

''تم دونوں سے بچا تو تیسری کے بارے میں ضرور سوچوں گا۔'' وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے چڑا رہا ہے اس لئے چپ چاپ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

''چلو اٹھو اب۔یہ نخرے بازی بند کرو اور کھانا کھانے چلیں۔'' اس نے بیڈ سے اتر کر مجھے بازو سے کھینچ کر اٹھانا چاہا۔

''اچھا چلتی ہوں۔''

کھانے کی میز پر پہنچے تو دلاور سے سامنا ہوگیا۔وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ہمیں دیکھ کر اس کے

ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور چہرے پر خباثت نمودار ہوگئی۔

''ارے واہ! آج تو چھوٹی امی حویلی میں آئی ہوئی ہیں اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔کیسی ہیں چھوٹی امی؟''اس نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔''میں جو پہلے ہی رقیہ کی باتوں پر تاؤ کھائے بیٹھی تھی اسے دیکھتے ہی طبیعت پھر سے مکدر ہوگئی۔فیصل کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات ابھر آئے مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

ہم دونوں کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔گوہر میری گود میں ہمکنے لگا تو میں اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔دلاور کی نظریں ابھی تک ہم پر جمی تھیں۔گوہر کو بے چین دیکھا تو اس نے ملازمہ کو آواز دی۔

''بشیراں!''

بشیراں اپنی چادر کے پلو سے گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے کچن سے برآمد ہوئی۔

''جی چھوٹے مالک؟''وہ استفساریہ نگاہ سے دلاور کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بچے کو چھوٹی امی سے لے لو،جب تک وہ کھانا نہ کھالیں،تب تک اسے بہلاتی رہو۔''

ملازمہ نے گوہر کو اٹھانے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھائے تو میں نے گوہر کو اپنے ساتھ سختی سے بھینچ لیا۔

''نہیں۔میں اسے نہیں دوں گی۔''میرا شدت پسند انداز دیکھ کر چودھرانی رقیہ اور دلاور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔فیصل بھی نظریں اٹھا کر مجھے تکنے لگا۔

''کوئی مسئلہ نہیں۔میں اس کے ساتھ کھالوں گی۔مجھے عادت ہے اسے گود میں بٹھا کر کھانا کھانے کی۔''میں نے خفت مٹانے کی کوشش کی۔

''دے دو چھوٹی امی۔کیوں ضد کرتی ہو؟بشیراں بچوں کو بڑے اچھے طریقے سے بہلاتی ہے۔''دلاور نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔

''نہیں،میں اسے اپنے ساتھ چاول کھلاؤں گی۔''میں نے پھر سے نیا بہانہ تراشا تو وہ ہنسنے لگا۔رقیہ بھی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔جبکہ رانی اور چوہدری فیصل خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

میں نے چکن پلاؤ ایک پلیٹ میں نکالا اور اوپر رائتہ ڈال کر کھانے لگی۔ساتھ گوہر کو بھی چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھلانے لگی۔اس کے بعد کوئی مزید بات چیت نہ ہوئی۔سب خاموشی سے کھاتے رہے۔البتہ رقیہ اور دلاور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے رہے۔

اس کشیدہ ماحول میں سیر ہو کر نہ کھایا گیا۔گزارے لائق کھا کر میں پھر سے کمرے میں آ گئی۔

کمرے میں بھی دل گھبرانے لگا تو سوچا کہ کیوں نہ بڑے چودھری صاحب کی عیادت کی جائے۔یہ سوچ کر گوہر کو اٹھائے کمرے سے باہر نکلی۔راہداری میں چلتے ہوئے چوہدری صاحب کے کمرے کے پاس رکی۔دروازے پر ہلکی آواز سے دستک دی اور پھر ناب کو گھما دیا۔

بڑے چوہدری صاحب سامنے ہی بیڈ پر نیم دراز تھے۔ان کی آنکھیں دروازے کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ایک ملازم ان کے پاس بیٹھا ان کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔میں نے شائستگی سے سلام کیا اور ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے سر کی جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا اور مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کیسی ہو بہو؟"

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں ابا جی۔"میں نے بڑی حلیمی سے جواب دیا۔

انہوں نے گود میں بیٹھے ہوئے گوہر کی طرف شفقت بھری نگاہ ڈالی اور مسکرا دیئے۔

"اور ہمارا چھوٹا چوہدری کیسا ہے؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے ابا جی۔"

گوہر کے لئے "چھوٹے چوہدری" کے الفاظ میرے کانوں کو بہت بھلے لگے۔

"رات کیسی گزری؟"

"اچھی گزری۔"میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اور سناؤ......سوکن سے کوئی منہ ماری تو نہیں ہوئی نا؟"انہوں نے شرارت آمیز انداز میں میری طرف دیکھا تو میں گڑبڑا سی گئی۔

"نہیں ابا جی! کچھ خاص نہیں۔"

"ہمم۔اس کا مطلب ہے کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔"وہ ہلکی سی ہنسی ہنسے۔"وہ مثال تو تم نے سن رکھی ہوگی۔سوکن چاہے مکھن کی بنی ہو۔تب بھی لوہے کی طرح سخت لگتی ہے۔"

ان کی مثال سن کر میں بھی مسکرا دی۔

چوہدری صاحب نے پہلی ملاقات کا جو تاثر چھوڑا تھا میرے ذہن پر۔بعد میں ہونے والی ملاقاتوں نے اس تاثر کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ناپسندیدگی کی جو لہر میرے دل میں پیدا ہوئی تھی ان کے لیے اب وہ زائل ہو چکی تھی۔شاید فیصل ٹھیک کہتا تھا وہ زبان کے کڑوے ضرور تھے مگر دل کے برے نہیں تھے۔

''اوئے شیدے! جا جا کر میری نونہہ کے لئے ڈرائی فروٹ لے کر آ۔'' انہوں نے ٹانگیں دبانے والے ملازم کو تحکمانہ انداز میں حکم دیا۔ تو وہ ''جی اچھا حضور'' کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے بھیجنے کے بعد چودھری صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔

''میری ایک گل دھیان سے سن کڑیئے۔ یہ جو میرا بڑا پوتا دلاور ہے نا۔ یہ بڑا خطرناک منڈا ہے۔ اس سے بچ کر رہنا۔ یہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گا۔''

ان کی باتیں سن کر میں اندر سے لرز گئی۔

''مگر...... وہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کیوں کرے گا ابا جی؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے بھلا؟''

''تم نے اس کے لیے جائیداد کا ایک شریک پیدا کر دیا ہے۔ اس جرم کو معمولی سمجھتی ہو کیا؟ تمہارا یہ بیٹا چودھری فیصل کا نام لکھوا چکا ہے اپنے نام کے ساتھ۔ اس رو سے یہ جائیداد میں برابر کا حصہ دار بن چکا ہے۔ اور یہ بات دلاور اور اس کی ماں کے لئے کبھی قابل قبول نہ ہوگی۔'' بڑے چوہدری کے چہرے پر اس وقت گہری سنجیدگی چھا چکی تھی۔

''مگر ابھی تو سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ابا جی! آپ کے ہوتے ہوئے کوئی بھی کسی کی حق تلفی کیسے کر سکتا ہے؟''

''یہ تمہاری بھول ہے کڑیے! میرے ہاتھ میں اب کچھ نہیں۔ میں تو بس اب مہمان ہوں۔ نجانے کب بلاوہ آ جائے۔''

ابا جی نے تھوڑی دیر توقف کیا اور پھر بولے۔

''مگر مجھ پر اللہ کا ایک احسان رہا ہے کہ میری اولاد نے کبھی میرے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ اسے تم میری خوش قسمتی بھی کہہ سکتی ہو۔ مگر افسوس...... فیصل اس معاملے میں خوش قسمت نہیں ہے میری طرح۔ اس کی اولاد اس کے سامنے نہ صرف بدتمیزی سے بات کرتی ہے۔ بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتی ہے۔ سچ پوچھو تو فیصل دلاور کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے بلکہ اس سے خائف رہنے لگا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب گاؤں بھی کم کم آتا ہے۔ اور اگر آئے بھی تو قیام نہیں کرتا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کے چلا جاتا ہے۔''

مجھے اپنے سسر کی باتوں سے حکمت اور سچائی کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کرخت مزاج اور بدزبان بوڑھا مجھے شفیق اور مہربان دوست دکھائی دینے لگا تھا۔

اگلے دن فیصل نے اپنے ساتھ زمینوں پر لے جانے کی آفر کی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ رانی بھی ہمارے ساتھ ہو لی۔ گاڑی گاؤں کے کچے پکے راستوں پر ہچکولے کھاتی ہوئی زمینوں کے بیچوں بیچ چلتی گئی اور فیصل مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی زمینیں دکھاتا رہا۔ تا حد نگاہ پھیلا ہوا وسیع وعریض رقبہ انہی کی ملکیت تھا۔ زمینوں کے اختتام پر بنا ہوا فارم ہاؤس بھی دکھایا۔ یہ وہی فارم ہاؤس تھا جس پر میں نے بابر کے ہمراہ ایک رات گزاری تھی۔

فارم ہاؤس میں داخل ہوتے ہی پرانی یادیں کسی عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑی تھیں۔ میں جو راستہ بھر خوشی سے قہقہے لگاتی

آئی تھی یہاں آکر ایک دم بجھ گئی۔ گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے اسی طرح فیصل کو سلام کیا جس طرح آج سے چار سال پہلے کیا تھا۔

فیصل ہمیں ایک کمرے میں لے گیا یہ ایک بیڈ روم تھا مگر وہ بیڈ روم نہیں تھا جس میں مجھے اور بابر کو ٹھہرایا گیا تھا۔ اور جس کی دیوار پر ایک دلآویز بار بنا ہوا تھا۔ فیصل نے چوکیدار سے کہہ کر ہمارے لئے چائے بنوائی۔

تقریباً ایک گھنٹہ ہم نے وہاں قیام کیا اور پھر واپسی کے لئے گھر کی طرف ہو لئے۔ جاتے ہوئے میں جتنی پر جوش اور خوش دکھائی دے رہی تھی واپسی پر اتنی ہی اداس اور خاموش تھی۔

فیصل میرے دل کی حالت سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا جبکہ رانی خوب چہک رہی تھی۔ گھر پہنچ کر فیصل گوہر کو اٹھائے مردانہ حصے میں چلا گیا جبکہ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

لاؤنج سے گزرتے ہوئے رقیہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ جو حسب معمول اپنی ملازمہ سے کندھے دبوا رہی تھی۔ میں اس کے پاس سے گزر کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں بھی دل نہ لگا تو پھر باہر نکل آئی۔ راہداری میں ٹہلنے لگی۔ بڑے چودھری صاحب کے کمرے کے آدھے کھلے دروازے پر نظر پڑی تو رک گئی۔

دروازے کو ناک کیا اور اندر چلی آئی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز ایک ٹی وی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ میں نے سلام کیا تو خوش دلی سے جواب دیا۔

میں پاس بیٹھ گئی۔

”ابا جی! کیسی طبیعت ہے اب؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے سے کافی بہتر ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا آپ ہر وقت کمرے میں یوں ہی بند پڑے رہتے ہیں؟ ہوا خوری کے لیے باہر نہیں نکلتے؟“

”نہیں۔ کبھی کبھی جیرا مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر لے جاتا ہے باہر باغیچے میں۔“ انہوں نے ٹانگیں دباتے ہوئے جیرے کی طرف ستائشی انداز میں دیکھا۔

”چلیں آج میں آپ کو باہر لان میں لے کر چلتی ہوں۔“ میں اٹھ کر ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔

”رہنے دو بہو! تم کیوں تکلیف کرتی ہو؟ جب دل چاہے گا۔ جیرے کے ساتھ چلا جاؤں گا۔“ انہوں نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔

”تکلیف کیسی ابا جی! چلیں نا۔“ میں نے ضد کرتے ہوئے کہا تو انہوں نے حامی بھر لی۔ جیرے نے ویل چیئر، جو کہ فولڈ ہوئی ایک دیوار کے ساتھ پڑی تھی، اسے کھولا اور بیڈ کے ساتھ لگا دیا۔ پھر میں نے جیرے کی مدد سے ان کے بھاری بھرکم جسم کو اٹھا کر ویل چیئر پر منتقل کیا۔

میں ویل چیئر کو دھکیلتی ہوئی کمرے سے باہر لے آئی۔ ہم راہداری سے ہوتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر لان میں نکل آئے۔ سرسبز لان کی روش پر چلتے چلتے میں نے پوچھا۔

''آپ کی طبیعت میں بہتری کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟''

''ڈاکٹرز یہی کہتے ہیں کہ میرے دونوں گردے مکمل طور پر ناکارہ ہو چکے ہیں۔ کڈنی ٹرانسپلانٹ کا مشورہ دیتے ہیں مگر میں مرنے سے پہلے کسی مزید عذاب سے گزرنا نہیں چاہتا۔'' انہوں نے وہیل چیر کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندلیں۔

''آج میں فیصل کے ساتھ اپنی زمینوں پر گئی تھی۔'' میں نے پرجوش لہجے میں بتایا۔ مقصد ان کی توجہ بٹانا تھا۔

''بہت اچھا کیا۔ گھومنے پھرنے سے دل بہل جاتا ہے۔''

میں چند منٹ انہیں گھماتی رہی اور پھر ان کی خواہش پر واپس ان کے کمرے میں لے آئی۔ جہاں فیصل گو ہر کو گود میں بٹھائے میرا منتظر تھا۔ مجھے اباجی کے ساتھ اس طرح گھلا ملا دیکھ کر فیصل بھی بہت مسرور دکھائی دے رہا تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے کمرے میں واپس آئے تو ایک خوفزدہ کر دینے والا منظر ہمارا منتظر تھا۔

☆......☆......☆

میں اور فیصل دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیڈ پر گرے ہوئے اس سیلنگ فین کو دیکھ رہے تھے جو نجانے کب چھت سے گرا اور سیدھا بیڈ کے وسط میں میٹرس پر دھنسا پڑا تھا۔ کچھ لمحوں تک ہم بے حس و حرکت کھڑے اس پنکھے کو دیکھتے رہے۔ پھر میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''اگر اس بیڈ پر میں اور گو ہر موجود ہوتے اور یہ بھاری بھرکم پنکھا ہمارے اوپر گرتا تو...... ہمارا کیا حال ہوتا؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ تم دونوں کسی نقصان سے محفوظ رہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ پنکھا گرا کیسے؟''

''تم مانو یا نہ مانو، اسے جان بوجھ کر گرایا گیا ہے۔'' میں طیش کے عالم میں بولی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو؟ جان بوجھ کر کوئی کیوں گرائے گا؟'' فیصل نے میری بات کو جھٹلانے کی کوشش کی مگر اس کا پریشان لہجہ اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ اندر سے وہ بھی مجھ سے متفق ہے۔

''جب ہم زمینوں پر گئے تو ہماری غیر موجودگی میں اس پنکھے کے ساتھ یقیناً کوئی چھیڑ چھاڑ کی گئی۔ کوئی ایسا پروگرام ترتیب دیا گیا جس کی رو سے، جب بھی کوئی اس کا سوئچ نیچے کرتا تو یہ چند منٹ چلنے کے بعد گر جاتا۔''

''مگر پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کون کر سکتا ہے بھلا؟''

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ کون ایسا کر سکتا ہے۔'' میں نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نظر

چرا گیا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں پھر سے خوفزدہ نظروں سے اس پنکھے کی طرف دیکھنے لگی جو اگر ہمارے اوپر گرتا تو شاید جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جاتے مگر جان لینے والے سے جان بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔ اس بات پر ایمان مزید پختہ ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد فیصل ایک ملازم اور ایک الیکٹریشن کے ہمراہ واپس آیا۔

ہم دونوں کمرے سے نکل کر باہر لان میں آ گئے۔ لان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ موضوع گفتگو یہی واقعہ تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر الیکٹریشن نے ملازم کی مدد سے پنکھا پھر سے سیٹ کر دیا اور ہم کمرے میں چلے آئے۔

''فیصل! ہمیں یہاں سے جانا چاہیے۔ یہاں میری اور گوہر کی جان کو خطرہ ہے۔''

''اب تو رات بہت زیادہ ہو گئی۔ صبح نکل چلیں گے۔'' فیصل نے جواب دیا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔ جبکہ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں ساری رات اپنے سر پر موجود اس پنکھے کے گھومتے ہوئے پروں کو دیکھتی رہی۔ جو پروانہ اجل بن کر ہماری جان لینا چاہتا تھا۔

صبح ناشتہ بھی ہم نے اپنے کمرے میں کیا اور اس کے بعد روانگی کی تیاری پکڑ لی۔ جانے سے پہلے میں بڑے چوہدری صاحب سے ملنا چاہتی تھی۔ گوہر کو فیصل کے حوالے کیا اور خود کمرے سے نکل آئی۔

ابا جی کے کمرے میں گئی۔ اس وقت وہ کمرے میں بالکل تنہا لیٹے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ انہیں اپنی روانگی کے متعلق بتایا مگر رات والے واقعے کا ان کے سامنے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ باتیں کرنے کے دوران میری نظر ان کے ہاتھوں پر پڑی۔ ان کے ہاتھوں کے ناخن کافی بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ابا جی! یہ ناخن آپ نے کب سے نہیں تراشے؟''

''بس پتر دھیان نہیں گیا۔ آج ہی جیرے سے کہوں گا۔ وہ تراش دے گا۔'' وہ خجالت آمیز انداز میں مسکرائے۔

''نیل کٹر کہاں ہے۔ لائیے میں آپ کے ناخن تراش دیتی ہوں۔'' میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز کھنگالنے لگی اور حسب توقع مجھے وہاں سے نیل کٹر مل بھی گیا۔

''مگر تم لیٹ ہو جاؤ گی۔'' اب کی بار انہوں نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

''ہم نے کون سا عدالت میں پیشی بھگتنے جانا ہے۔ جو ٹائم کا آگا پیچھا نہیں ہو سکتا۔'' میں شرارت سے بولی تو ابا جی دل کھول کر ہنسنے لگے۔ میری بات ان کے دل کو لگی تھی۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ناخن تراشنے لگی۔ اس وقت کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ میں بڑے انہاک سے ان کے ناخن تراش رہی تھی اور وہ محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''ایک بات تو بتاؤ پتر جی۔''

''پوچھیں ابا جی۔''میں نے نظریں اٹھائے بنا کہا۔

''تم دیکھنے میں کسی بھلے گھر کی لگتی ہو۔تو پھر اس کھوتے کے ہتھے کیسے چڑھ گئی؟''

ان کا غیر متوقع سوال سن کر میرے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔کچھ لمحے خاموش رہی اور پھر افسردگی سے بولی۔

''بس ابا جی......قسمت نے لا پھینکا۔''

ہاتھوں کے ناخن تراشنے کے بعد میں بولی۔

''ابا جی!اپنے پیر بھی دکھائیں۔''میں نے کمبل ہٹا کر ان کے پیروں کا معائنہ کرنا چاہا۔

''کیا کر رہی ہو؟''انہوں نے جھنجلا کر مجھ سے کمبل چھیننے کی کوشش کی۔

''تم نے میرے ہاتھوں کے ناخن تراش دیئے۔تمہاری اتنی ہی بہت وڈی مہربانی ہے۔''ان کا لہجہ تلخی لئے ہوئے تھا۔

''اس میں مہربانی والی کیا بات ہے بھلا؟ یہ تو میرا فرض بنتا ہے۔اب آپ اچھے بچے بن کر اپنے پیروں کے ناخن بھی دکھا دیں۔''میرے اپنائیت بھرے انداز نے ان کو مزاحمت ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے کمبل ہٹایا۔دیکھا تو میرا خدشہ سچ ثابت ہوا۔پیروں کے ناخن بھی خاصے بڑھے ہوئے تھے۔میں نے ان کا ایک پاؤں اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور ناخن تراشنے میں مصروف ہوگئی۔باری باری دونوں پیروں کے ناخن تراش کر میں نے ان کی ٹانگیں سیدھی کیں۔ ان پر کمبل پھیلایا۔پھر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔وہ میری طرف احسان مند نظروں سے دیکھ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''آپ رو رہے ہیں۔''میں پریشان ہوگئی۔

''ہاں بیٹی!میں جو ہمیشہ اللہ سے گلے شکوے کیا کرتا تھا کہ اس نے مجھے بیٹی نہیں دی مگر آج اس پروردگار سے ساری شکایتیں دور ہوگئیں۔آج اس نے میری یہ حسرت پوری کردی۔تمہارے روپ میں مجھے بیٹی مل گئی۔''

یہ بات سن کر میری آنکھیں بھی بھر آئیں اور میں ان کے پاس بیٹھ کر ان کے سینے پر چہرہ ٹکائے رونے لگ گئی۔وہ مجھے ساتھ لگائے میرے سر کو تھپکتے رہے اور روتے رہے۔مجھے اپنا باپ یاد آ گیا۔جو نجانے کس حال میں تھا اور کس اذیت میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔اللہ جانے زندہ بھی تھا یا مر گیا تھا۔

چند لمحوں بعد میں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنی انگلیوں کے پوٹوں سے چوہدری صاحب کی آنکھیں پونچھنے لگی۔

''رخصت ہونے کی اجازت چاہتی ہوں ابا جی۔''

''جگ جگ جیو اور ہمیشہ خوش رہو۔ اللہ تمہیں زمانے کی گرم ہوا سے محفوظ رکھے۔'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ میں آنسو پونچھتی ہوئی ان کے کمرے سے باہر آ گئی۔

جب ہم حویلی سے رخصت ہوئے تو رانیہ ہمیں باہر تک چھوڑنے آئی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تو اس نے بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔ کہا کہ پھر کبھی سہی۔ میں جانتی تھی کہ وہ اپنی ماں کے ڈر کی وجہ سے میرے ساتھ نہیں آ سکتی۔ اس لئے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

میں بوجھل دل اور نمناک آنکھیں لیے وہاں سے رخصت ہوئی۔ بڑے چودھری صاحب کی لاچارگی اور بے بسی نے دل کو بہت بوجھل کر دیا تھا۔ وہ اوپر سے جتنے سخت مزاج دکھائی دیتے تھے۔ اندر سے اتنے ہی دکھی اور اکیلے تھے۔

واپس گھر آئے۔ تو زندگی پھر سے ایک لگی بندھی روٹین سے گزرنے لگی۔ فیصل اب بہت سنجیدہ رہنے لگا تھا۔ شاید باپ کی بیماری کی وجہ سے یا پھر کوئی اور وجہ تھی۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں رشتوں کو اتنی اہمیت دینے کا رواج نہیں تھا۔

گاؤں سے آنے کے بعد میں ہر روز شام کو بڑے چوہدری صاحب سے فون پر بات کیا کرتی اور پھر اس معمول کو میں نے اپنی عادت بنا لیا۔ اگر میرے چند منٹ کی گفتگو سے کسی قریب المرگ انسان کی رنجیدگی میں تھوڑی سی بھی کمی ہو جاتی تھی تو میرے لئے یہ باعث اطمینان امر تھا۔

چند دن گزرے تو کانوں نے ایک اندوہناک خبر سنی۔ کسی کی موت کی خبر۔ مگر یہ اندوہناک خبر میرے سسر کی موت کی نہیں بلکہ میرے اپنے باپ کی موت کی خبر تھی۔ اس باپ کی موت کی، جس نے میری انگلی پکڑ کر، مجھے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔ جو میری ایک مسکراہٹ پر سارے جہاں کی خوشیاں لٹانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔

فوزیہ نے کال کر کے بتایا کہ میرا باپ مر چکا ہے۔ یہ خبر سن کر مجھے کوئی دکھ یا حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ گھر سے فرار ہو کر میں جیتے جی جس سولی پر اسے لٹکا کر آئی تھی۔ اس پر لٹکے لٹکے اس نے جان دینی ہی تھی جلد یا بدیر۔ زندگی تو اس کے لئے ایک عذاب بن گئی تھی۔ اور بہتر ہو گیا کہ اس عذاب سے جان چھوٹ گئی تھی اس کی۔ جتنی دیر زندہ رہتا۔ ذلت کی بھٹی میں سلگتا رہتا۔

''جانتی ہوں کہ تم اپنے باپ کا آخری دیدار نہیں کر سکتی۔ مگر پھر بھی تمہیں آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھا۔ مجھے یہ اطلاع ملی تو سوچا کہ تمہیں بھی باخبر کر دوں۔'' وہ وضاحت پیش کر رہی تھی۔

''اچھا کیا۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ پھر صوفے پر ڈھے گئی اور آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

''میں تم سے کبھی معافی نہیں مانگوں گی ابا۔ میں تمہاری قاتل ہوں اور کوئی بھی قاتل اپنے مقتول سے معافی نہیں مانگا کرتا۔''

کافی دیر تک بیٹھ کر روتی رہی اور دل کی بھڑاس آنکھوں کے راستے نکالتی رہی۔

''کاش! میں بچپن میں ہی مر جاتی۔ شاید اسی لئے زمانہ جاہلیت کے لوگ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔''

شام کو فیصل آیا تو کھانا لگاتے ہوئے سرسری سے انداز میں نے اسے ابا کی موت کی اطلاع دی۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میرا میکانکی لہجہ اور سرد سے تاثرات اسے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔

''اوہ بہت افسوس ہوا۔'' اس نے رسم دنیا نبھائی۔

''مگر مجھے نہیں ہوا۔ کیونکہ انہیں مرنا ہی تھا۔ اچھا ہوا جلدی مر گئے۔'' میں نے برتن ٹیبل پر لگاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''کیسی بیٹی ہو تم؟ اپنے باپ کے مرنے پر کس قدر غیر فطری رویے کا مظاہرہ کر رہی ہو۔''

''میری جیسی بیٹیوں کے ماں باپ ایسے ہی سسک سسک کر اور گھٹ گھٹ کر مرتے ہیں۔'' میں نے اسے اسی لہجے میں جواب دیا۔ کھانا لگایا اور خود کمرے کی طرف چل دی۔

''تم کھانا نہیں کھاؤ گی؟'' اس نے پیچھے سے پکارا۔

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے یہ کہا اور کمرے کا دروازہ پیچھے سے بند کر دیا۔

یہ مہینہ شاید میرے لئے غم کا مہینہ ثابت ہونے والا تھا۔ ابا کی وفات کے ایک ہفتہ بعد ہی سسر جی کی وفات کی خبر بھی مل گئی۔ فجر کے وقت رقیہ نے فون کر کے فیصل کو بڑے چودھری صاحب کی وفات کی اطلاع دی۔ ہم چھ بجے گاؤں پہنچ گئے۔ حویلی کھچا کھچ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔

چوہدری صاحب کی میت کو باہر کھلے دالان میں رکھا گیا تھا جو عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ رقیہ چودھری کے سرہانے والی طرف ایک اونچے رنگین پیڑھے پر بیٹھی رو رہی تھی بلکہ رونے کا ڈرامہ کر رہی تھی۔

میں عورتوں کو روندتی پھلانگتی ہوئی چودھری صاحب کی چارپائی کے پاس پہنچی، چادر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ بیماریوں سے لڑتے لڑتے زندگی کی بازی ہار چکے تھے مگر مردہ چہرے پر اب بھی فتح مندی کا تاثر غالب تھا۔

مجھے ان سے کی گئی آخری ملاقات اور مکالمے یاد آئے تو دل بھر آیا۔ میں ان کی چارپائی کے ساتھ لگ کے بیٹھ گئی اور چہرہ چارپائی کے بازو پر ٹکا کر آنسو بہانے لگی۔

جنازہ کا وقت ظہر کے فوراً بعد رکھا گیا تھا۔ نماز ظہر ہوتے ہی فیصل، دلاور اور چند اور نوجوان میت اٹھانے کے لئے آ گئے۔

جب چوہدری صاحب کی میت کو اٹھایا گیا تو رانیہ بھی پچھاڑیں کھا کر رونے لگی۔ پھر وہ میرے گلے لگ گئی۔ میں نے اسے تسلی تشفی دینے کی بھرپور کوشش کی۔ جنازہ اٹھ جانے کے بعد لوگوں کی مٹن قورمے اور نانوں کیساتھ تواضع کی جانے لگی۔

چوہدرانی رقیہ تھوڑی دیر لوگوں کے درمیان بیٹھی۔ پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ جبکہ میں وہاں عورتوں میں گھری کافی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔

دوسرے دن رسم قل کے بعد ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا کہ فیصل نے مجھے شکور کے ساتھ واپس بھیج دیا جبکہ تیسرے دن شام کو وہ بھی واپس آ گیا۔

قل کا ختم ہو چکنے کے بعد گاؤں کی کافی عورتیں گھروں کو چلی گئیں۔ اب وہاں دریوں پر چند مخصوص عورتیں ہی رہ گئیں۔ جو فیصل کی اپنی ذات برادری کی تھیں۔ ان عورتوں میں سے کسی نے میری طرف اشارہ کر کے رقیہ سے دبی آواز میں پوچھا۔

''رقیہ یہ کون ہے؟''

رقیہ نے تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر نخوت بھرے انداز میں، اونچی آواز میں جواب دیا۔

''یہ چودھری صاحب کی داشتہ ہے۔''

یہ بات سنتے ہی وہاں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔

''بکواس بند کرو۔ داشتہ کس کو کہہ رہی ہو؟'' میں چنگھاڑی تو بھنبھناہٹ یکدم سکوت میں بدل گئی۔ سب کو جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا۔ چوہدرانی رقیہ سے اس لہجے میں بات کرنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میری للکار نے رقیہ پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔ جوش غضب سے اس کا رنگین پیڑھے پر رکھا بھاری بھرکم وجود لرزنے لگا۔

''میری جرأت ابھی تم نے دیکھی ہی کہاں ہے بنورانی۔ تمہارے سارے کس بل نہ نکال دیئے تو چودھرانی رقیہ میرا نام نہیں۔''

اس نے اپنے تمتماتے سیاہ چہرے پر دایاں ہاتھ پھیرا۔

ماحول میں ایک سنگین تناؤ پیدا ہو گیا۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں کے چہروں پر ہیجان جھلکنے لگا۔ یہ تماشہ پتہ نہیں کتنا طول کھینچتا اور تماشائی کتنا محظوظ ہوتے مگر اس سے پہلے ہی فیصل وہاں آ گیا اور اس نے مجھے اٹھ کر باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ چلتی باہر آ گئی۔

اس نے شکور کو گاڑی کی چابی دی اور کہا کہ ''بیگم صاحبہ کو شہر لے جاؤ۔ میں بھی کل شام تک پہنچ جاؤں گا۔''

گھر پہنچ کر میں نے میڈم فرح کو فون کیا۔ کافی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ اسے اپنے سسر اور والد کی وفات کی اطلاعات دیں۔ اگلے دن میڈم اور شبانہ دونوں تعزیت کے لئے آ گئیں۔ انہوں نے مجھ سے میرے والد اور سسر کی اموات پر تعزیت کی۔ وہ تقریباً دو گھنٹے بیٹھی رہیں۔ ان دو گھنٹوں میں ہم نے جی بھر کر باتیں کیں۔ میں نے میڈم کو رقیہ سے ہونے والی لڑائی کا قصہ بھی سنا دیا۔

میڈم خاموشی سے سنتی رہی اور پھر بولی۔

''رقیہ کا بھائی بہت اثر و رسوخ والا بندہ ہے۔ اسی کی پشت پناہی پر رقیہ اور اس کا بیٹا دلاور اتنا اکڑتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے

چوہدری فیصل بیوی اور بیٹے کے سامنے دب کر رہتا ہے۔ سمجھ لو وہ بھی اپنے سالے سے خائف رہتا ہے کیونکہ بہت بڑے بڑے ڈکیت اور گینگسٹر زاس کے دوست ہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے کہ وہ ان لوگوں کی پشت پناہی کرتا ہے اور اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ سمجھ لو جرائم کی دنیا کا ایک طاقتور نام ہے۔"

میڈم کو چوہدری فیصل کے سالے کے بارے میں کافی معلومات حاصل تھیں۔

"مجھے تو اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ رقیہ اور دلاور آخر کس بات پر اتنا مان کرتے ہیں؟"

"بتایا تو ہے تمہیں کہ ان کی پشت پر کس بااثر شخص کی تھپکی ہے۔" میڈم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمم۔تم سناؤ شبانہ کیسی چل رہی ہے خانگی زندگی؟"

"اچھی گزر رہی ہے۔ ریاض میرا بہت خیال رکھتا ہے اور بچے بھی مجھ سے مانوس ہو چکے ہیں۔"

"شکر ہے! اللہ نے تمہاری سن لی۔" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ شکر ہے کہ عزت سے جینے کا آسرا ہو گیا۔" شبانہ کے چہرے پر چھائی آسودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن ہے۔ ان دونوں کے آنے سے میرا دن اچھا گزر گیا۔ ورنہ اکیلے وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے گھر کی صفائی شروع کر دی۔

شام تک فیصل بھی پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ بہت مغموم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

"سناؤ فوزیہ! کیسی ہو۔؟" میں نے فیصل کے فیکٹری جانے کے بعد فوزیہ کا نمبر ملایا اور اب اس سے بات کر رہی تھی۔ میں اس سے اپنے میکے کے حالات جاننا چاہ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم مجھے وہاں کے حالات بتاؤ۔" میں فوراً مدعے پر آ گئی۔

"وہاں کے حالات کافی دگرگوں نظر آئے مجھے۔"

"کیسے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"تمہارے ابا تو دنیا سے چلے گئے مگر تمہاری اماں کی حالت بھی کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔ خالہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔"

"اور بھائی اور بھابھی؟"

''وہ بھی ٹھیک ہیں......مگر شاید تنگ دستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔''

''ان کے حالات کو کیا ہوا اچھے بھلے تو تھے۔اتنی شاندار نوکری تھی بھیا کی۔''میں نے اس کی بات کاٹ کر فوراً کہا۔

''تمہارے بھیا اس شاندار نوکری سے کب کے نکالے جا چکے ہیں۔اب تو اپنی گلی میں ہی ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان کھول کر بیٹھے ہیں۔جس کی آمدنی سے چار بچوں کے اخراجات بمشکل ہی پورے ہوتے ہوں گے۔تمہاری بھابی کا چہرہ اور لباس دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے مالی حالات کیسے ہو سکتے ہیں۔''

''اور......اور میرے......بچے؟''جس سوال کو کرنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔وہ بھی زبان پر آ ہی گیا۔

''تمہارے بچے شاید وقت سے پہلے ہی سمجھدار ہو گئے۔یا حالات کی ستم ظریفی نے انہیں سمجھدار بنا دیا۔شیراز تو بہت خاموش رہتا ہے جبکہ ارباز بالکل نارمل دکھائی دیتا ہے۔ماشاءاللہ سے اب تو کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ویسے بانو! اگر تم چند سال اور صبر کر لیتی تو تمہارے بچے تمہارے لئے بڑا مضبوط سہارا ثابت ہو سکتے تھے۔تم نے ان سے ان کی ماں کو چھین کر بہت برا کیا۔''فوزیہ کی آواز بھرا گئی۔

فوزیہ کی باتیں سن کر میرا دل کٹنے لگا۔پشیمانی کے آنسو گالوں کو بھگونے لگے۔

''وہ کھانا کہاں سے کھاتے ہیں؟ دادی تو ان کی فوت ہو چکی ہے۔اب ان کا گھر عورت کے وجود سے خالی ہو چکا ہے۔''

''میں کون سا ان کے گھر جاتی ہوں۔تمہاری ماں یعنی کہ خالہ اکثر ان کے گھر آتی جاتی رہتی ہیں۔وہی بتاتی ہیں کہ سیٹھ ناصر بھی اب بہت بدل گیا ہے۔بچوں کا بہت خیال رکھتا ہے اور اس نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی ہے۔یہ بزرگ عورت صبح سات بجے سے رات سات بجے تک ان کے گھر رہتی ہے۔یہی کھانا بناتی ہے اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے جبکہ صفائی اور دیگر کاموں کے لئے الگ سے ملازمہ آتی ہے مگر ان ساری سہولتوں کے باوجود بھی بچے خاموش اور سہمے سہمے سے رہتے ہیں۔ان کی زندگیوں میں جو خلا پیدا ہو چکا ہے۔وہ بھلا کیسے بھر سکتا ہے۔''

''ہاں! تم سچ کہتی ہو۔''میں نے دھیرے سے جواب دیا۔''اچھا تمہاری بچی کا کیا حال ہے؟ آپریشن کروایا کہ نہیں ابھی؟''

''ایک سرجن سے بات طے ہو گئی ہے۔آپریشن کی تاریخ بھی دے دی ہے اس نے۔چند دنوں تک انشاءاللہ ہو جائے گا۔بس دعا کرو بانو! یہ آپریشن کامیاب ہو جائے۔''اس کے لہجے میں دنیا بھر کی فکریں سمٹ آئیں۔

''انشاءاللہ، یہ آپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔تم دل چھوٹا مت کرو۔''میں نے الوداعی جملوں کا تبادلہ کیا اور فون بند کر دیا۔

میرے لیے یہ بات کافی اطمینان بخش تھی کہ سیٹھ ناصر اب بچوں کا بہت خیال رکھتا ہے اور اماں بھی ان کے سروں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔بیشک ماں کی کمی تو کوئی عورت پوری نہیں کر سکتی مگر ماں کے بعد سب سے زیادہ بے لوث اور خالص رشتہ دادی یا نانی کا ہی ہوتا ہے۔میں نے ایک گہری سانس لی اور فون ہاتھ سے رکھ دیا۔

☆......☆......☆

ایک مہینہ سکون سے گزر گیا۔اب جبکہ حالات کافی حد تک معمول پر آ گئے تھے۔

ایک دن ڈور بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے دلاور کھڑا تھا۔ چہرے پر وہی خباثت سجائے۔ جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

''سلام چھوٹی امی! کیسی ہیں؟''

میں نے دروازہ بند کرنا چاہا تو اس نے دروازے میں اپنی ٹانگ اڑا دی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں نے پہلے بھی تمہیں منع کیا تھا نا۔ یہاں آنے سے۔'' میں کرخت لہجے میں بولی۔

''بس کیا کروں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے چلا آتا ہوں۔ ورنہ جتنا بے عزت آپ کرتی ہیں۔ قسمے، چٹکی بھر غیرت بھی ہوتو دوبارہ یہاں کا منہ نہ کروں۔'' وہ بے ہنگم آواز میں قہقہے لگانے لگا اور پھر گھر کے اندر چلا آیا۔

''مگر میں نے تمہیں کہا تھا کہ اپنے باپ کی غیر موجودگی میں، کبھی یہاں مت آنا۔'' میں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

''اوہو، آپ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایموشنل ہو جاتی ہیں۔ باپ سے بھی مل کر آ رہا ہوں۔ خرچہ پانی کافی دنوں سے ختم ہو گیا تھا تو اسی سے لینا پڑتا ہے۔ کیا کروں، مجبوری ہے ورنہ ایسے باپ کی طرف تو میں دیکھنا بھی گوارہ نہ کروں۔'' وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور ٹانگیں اٹھا کر سامنے رکھی ہوئی میز پر ٹکا دیں۔

''کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کرختگی سے پوچھا۔

''کچھ زیادہ نہیں۔ اپنے خوبصورت ہاتھوں سے بس ایک کپ چائے کا پلا دو۔ چھوٹی امی! آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ میں آپ کے شوہر کی طرح شراب نہیں پیتا۔ صرف چائے یا جوس پیتا ہوں۔'' ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔

''چلو شراب نہیں پیتے تو کوئی اور خرافات لگا رکھی ہو گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہاری رگوں میں چودھریوں کا خون دوڑ رہا ہو اور تم کسی بھی قسم کے نشے سے پاک ہو۔'' میں زہرخند لہجے میں بولی۔

میری بات سن کر وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔

''ویسے چھوٹی امی! تم کافی ذہین لگتی ہو۔ یہ لگایا تو تم نے قیافہ ہی ہے مگر کیا خوب لگایا ہے۔ میں تو صرف سگریٹ پیتا ہوں۔'' اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''خالی سگریٹ؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''اب کیا ہے کہ خالی سگریٹ کا کچھ اتنا مزہ نہیں آتا۔ اس لیے اس میں چرس یا پھر کبھی کبھی ہیروئن بھی بھر کے پی لیتا ہوں۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

اس کے انکشافات نے میرے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی اور وہ کن کن جان لیوانشوں پر لگ چکا تھا۔ مجھے ایکدم اس پر ترس آنے لگا اور رقیہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اگر یہ مذاق ہے تو بہت ہی بھونڈا مذاق ہے۔''اس بار میرا لہجہ قدرے نرم تھا۔شاید اس کی باتوں کو پرکھنا چاہ رہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں پیاری امی! میرا بھلا آپ کے ساتھ کیا مذاق کا رشتہ ہے؟ یہ دیکھو......''اس نے جیب سے کاغذ کی ایک پڑیا نکالی اور اسے کھول کر ٹیبل پر رکھ دیا۔اس کاغذ کی پڑیا کے اندر سفیدی مائل ہلکے گرے رنگ کا سفوف تھا۔

''یہ دیکھو، یہ ہیروئن ہے۔سب منشیات کی ملکہ۔''اس نے فخر سے میری طرف دیکھا جبکہ میں اس سفوف کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔پھر میں اس کے سامنے والے صوفے پر جا بیٹھی۔

''تمہارے باپ کو پتا ہے......کہ تم اس موذی نشے پر لگ چکے ہو؟''میں نے تاسف بھرے انداز میں پوچھا۔

''پتا نہیں، اسے خبر ہے یا نہیں۔مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔میں نفرت کرتا ہوں اس سے،ساری زندگی ہمیں باپ کا پیار نہیں دیا اس نے۔بس عورتوں کے پیچھے بھاگتے عمر گزار دی اس حریص نے۔''اس کا لہجہ زہر آلود ہو چکا تھا۔

''ٹھیک ہے، تمہیں نفرت ہے اپنے باپ سے......مگر اپنی زندگی سے نفرت کیوں کر رہے ہو؟ اس زہر کو کیوں اپنی رگوں میں اتار رہے ہو؟ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟''

''چھوٹی امی! مجھے تمہاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میں یہاں کوئی وعظ سننے آیا ہوں۔''اس نے حقارت سے جواب دیا۔''تم سے ایک کپ چائے کا مانگا ہے۔اگر زحمت نہ ہو تو......''اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کچن کی طرف چل دی۔اس کے لئے چائے کا کپ تیار کیا اور لا کر اس کے آگے رکھ دیا۔خود پھر سامنے والی سیٹ سنبھال لی۔

''تمہاری امی کو پتا ہے کہ تم نشہ کرتے ہو؟''

''نہیں......شاید اسے نہیں پتا۔''

''مگر تم نے یہ نشہ کہاں سے اور کیوں کر لگا لیا؟''

''بس کسی دوست نے زبردستی دو تین کش کیا لگوائے میں تو اسیر ہو گیا اس مہارانی کا۔''اس نے چائے پیتے ہوئے جواب دیا۔

''چھوڑ دو اسے......ابھی بھی وقت ہے۔''

''نہیں چھوڑ سکتا۔عادی ہو چکا ہوں۔چند گھنٹے اوپر نیچے ہو جائیں تو اس کی طلب میں تڑپنے لگتا ہوں۔''

وہ چائے کی چسکیاں لیتا رہا اور ہیروئن کے فوائد پر روشنی ڈالتا رہا۔میں پاس بیٹھی سن سن کے کلستی رہی اور اس کی عقل اور اس کی

ماں کی قسمت پر ماتم کرتی رہی۔

واہ چودھرانی رقیہ! تم خود کو بہت بڑی تیس مار خان سمجھتی ہونا۔ مگر جس بیٹے کو تناور درخت سمجھ کر اس کی آڑ میں تم خود کو اتنا محفوظ سمجھتی ہو اور غرور کی بیماری میں مبتلا ہو۔ اس کی جڑیں تو کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ جلد ہی یہ تناور درخت پورے کا پورا کھوکھلا ہو کر زمین بوس ہونے والا ہے۔

اس نے چائے پی اور پھر گوہر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔

''چھوٹی امی! تم مجھ سے اتنی بدگمان کیوں رہتی ہو؟ یقین کرو میں بظاہر جتنا برا دکھائی دیتا ہوں، حقیقت میں اتنا ہوں نہیں۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

''میرا اندازہ یہ بھی ہے کہ منشیات کے علاوہ تم ایکشن فلمیں بھی بہت زیادہ دیکھتے ہو۔''

''ارے واہ! کیا غضب کی قیافہ شناس ہیں آپ تو...... آپ کا ہر اندازہ ہی درست ثابت ہو رہا ہے۔ میں واقعی مار دھاڑ والی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتا ہوں اور مجھے فلموں میں ہیرو نہیں بلکہ ولن اٹریکٹ کرتا ہے۔ جس فلم کا ولن جتنا زیادہ پاورفل اور سفاک ہوتا ہے۔ وہ فلم اتنی ہی جاندار ہوتی ہے اور مجھے وہ فلم اتنی ہی زیادہ پسند آتی ہے۔'' اب وہ بڑے خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں بات کر رہا تھا۔

''تم گوہر کو کیوں اٹھانا چاہتے ہو؟ کیونکہ تمہیں اس سے کوئی بھی محبت یا لگاؤ نہیں ہے۔ اس بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے تو پھر کیوں اس کو اٹھانے کی خواہش کرتے ہو؟'' میں نے یہ چبھتے ہوئے سوال کیے تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔

''بس ویسے ہی، مجھے بچے پسند ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے اسے اٹھاؤں اور پیار کروں۔ آخر کو ہے تو میرا بھائی۔ کیا ہوا وہ کسی خاندانی عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔ ہے تو چوہدری فیصل کا ہی خون۔''

''کیا تم گوہر کے بارے میں کوئی برا ارادہ رکھتے ہو؟'' میرے اندیشوں نے الفاظ کا روپ دھار لیا۔

''یہ بات تو آپ بھی سمجھ گئی ہونگی کہ میں بہت صاف گو ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر اس حد تک سچ بولنا بھی تو خطرناک ہے کہ جس سے بندے کی اپنی جان ہی خطرے میں پڑ جائے۔''

وہ پھر ہنسنے لگا اور خالی کپ ٹیبل پر رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا چھوٹی امی! اب میں چلتا ہوں۔ آج کی ملاقات بہت اچھی رہی۔ تمہارے بارے میں میرے قائم کردہ کچھ اندازے غلط ثابت ہوئے۔ تم ایک ذہین اور باوقار عورت ہو۔''

میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی باریک مونچھوں کو بل دیا اور باہر کی طرف چل دیا۔

''بائے بائے چھوٹی امی......زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

''سنو دلاور......تم دوبارہ یہاں کبھی مت آنا پلیز۔'' میں نے درخواست گزار لہجے میں کہا۔

وہ رکا پیچھے۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اور بولا۔

"آپ کی ہر ریکویسٹ سر آنکھوں پر۔ مگر یہ درخواست نہیں مان سکتا۔ میں یہاں آؤں گا۔ اور بار بار آؤں گا۔ مجھے یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور میں سٹپٹا کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

"آج پھر دلاور آیا تھا۔" رات کو سونے سے پہلے میں نے یہ بات چھیڑی۔ فیصل بیڈ پر نیم دراز تھا۔ گوہر اس کے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا۔

"ہاں فیکٹری بھی آیا تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ یہاں بھی آئے گا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تم اسے یہاں آنے سے روک نہیں سکتے؟ کیا اس سے ڈرتے ہو؟" میں نے تنک کر پوچھا۔

"ہاں شاید...... مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ میں اس سے ڈرنے لگا ہوں۔" فیصل کے برملا اعتراف نے مجھے شاکڈ کر دیا۔

"کیا کہہ رہے؟ تم اپنے بیٹے سے ڈرتے ہو؟ بہرحال وہ یہاں آ کر مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔ ذہنی اذیت دیتا ہے۔ تم پلیز اسے منع کر دو کہ یہاں مت آیا کرے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اسے منع نہیں کرتا؟ بہت بار منع کر چکا ہوں مگر وہ کم بخت میری سنتا ہی کب ہے۔ ماں اور اور ماموں کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔"

تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد وہ پھر بولا۔

"چوہدری ساجد اس کو بطور مہرہ میرے خلاف استعمال کر رہا ہے۔"

"کون چوہدری ساجد؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا ماموں اور میرا تایا زاد بھائی۔ یہ اسی کے پڑھائے ہوئے قاعدے پر عمل کرتے ہوئے میرے خلاف ہر جگہ زہر اگلتا رہتا ہے۔"

"مگر وہ اسے تمہارے خلاف کیوں استعمال کرتا ہے؟ اس کا اس میں کیا مفاد ہے؟"

"شریکا ہے نا۔ اس کی نظریں ہماری زمینوں پر لگی ہوئی ہیں۔ میرے مرنے کے بعد وہ اس سے ہر چیز ہتھیا لے گا۔ فیکٹری اور زمینیں سب کچھ۔"

"فیصل! تمہارے لئے ایک بہت بری خبر بھی ہے۔ سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیسے تمہیں وہ منحوس خبر سناؤں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"دلاور نشہ کرنے لگا ہے۔ اور وہ بھی ہیروئن کا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ یہ سن کر اس نے کوئی بھی ردعمل ظاہر نہ کیا بلکہ ایک

ٹھنڈی سانس بھر کے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگالی۔ میں چند منٹ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

''مجھے تمہارے دکھ کا اندازہ ہے۔ مگر کیا تم بالکل اس بات سے بے خبر تھے؟''

''بالکل بے خبر تو نہیں تھا۔ مجھے چند ماہ پہلے بھی کسی نے بتایا تھا کہ دلاور منشیات کا استعمال کرنے لگا ہے مگر تب زیادہ کان نہیں دھرا تھا۔ یہی سوچا کہ شاید افواہ ہو۔ اب اگر تم بھی یہی کہہ رہی ہو تو یقیناً یہ خبر حقیقت پر مبنی ہوگی۔ مگر تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''وہ ایسے کہ میرے سامنے اس نے اپنی جیب سے ہیروئن کی پڑیا نکال کر مجھے دکھائی تھی۔'' میں نے کہا۔

''یعنی اب شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔'' اس کی آواز بوجھل ہو چکی تھی۔

''فیصل! تم اسے یہ نشہ چھڑوانے کی کوشش کرو۔ اس سے بات کر کے دیکھو۔ اپنا رویہ بدل کے دیکھو۔ تمہارے مشفق رویے کا یقیناً اس پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔''

''نہیں، اب ان سب باتوں کا وقت نکل گیا۔ اب وہ میری کوئی بات نہیں سنتا۔ اس کی ماں نے اسے اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف ایک محاذ کھول رکھا ہے۔'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

''مگر اس کا انجام کیا ہوگا؟''

''صرف موت...... یہ حقیقت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بلکہ مجھے تو یہ یقین ہے کہ وہ میرے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں۔ اس نے ہر چیز پر قبضہ کر لینا ہے۔ رانی اور سجاول کا حصہ بھی ہڑپ کر جائے گا یہ۔''

''مگر تم اپنی زندگی میں ہی کوئی ایسا قدم اٹھا جاؤ...... مطلب...... سب بچوں کا حصہ ان کے نام لگوا دو۔'' میں نے صلاح دی۔

''اگر یہ کام کیا، تو وہ میری زندگی میں ہی اپنا حصہ بیچ کر کھا جائے گا۔''

''اوہ...... یہ تو واقعی بڑی افسوسناک صورتحال ہے۔'' میں تاسف سے سر ہلانے لگی۔

''ایک بات کہوں بانو! میرا باپ اولاد کے معاملے میں بڑا بدقسمت تھا مگر میں اس معاملے میں اپنے باپ سے بھی بڑا بدقسمت نکلا۔ خدا گواہ ہے۔ میں نے کبھی اپنے باپ کی موت کی دعا نہیں کی۔ ہمیشہ اس کی تندرستی اور طویل عمر کی دعا کی۔ مگر میرا بیٹا میرے مرنے کی دعا کرتا ہے۔''

فیصل بہت زیادہ دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔

''سجاول کا ردعمل کیا ہے ان معاملات میں؟ کبھی اس سے ان مسائل پر بات کی؟''

''اس سے کیا بات کروں؟ وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اسے ان باتوں میں الجھانے لگا تو اس کی پڑھائی کا حرج ہوگا اور پھر ویسے

بھی میں نہیں چاہتا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے مدمقابل آ کر ایک دوسرے کے حریف بن جائیں۔ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تل جائیں۔رقیہ تو ناعاقبت اندیش ہے، جو بیٹے کو باپ کے خلاف ورغلا رہی ہے۔مگر میں اس جیسا کم عقل نہیں ہوں۔''

''ہمم۔'' میں نے لاجواب ہو کر ہنکارہ بھرا۔

اس رات کا ایک بڑا حصہ ہم نے فیصل اور اس کی فیملی کے حوالے سے باتوں میں گزار دیا۔

☆......☆......☆

وقت کا گھوڑا دلکی چال چلتا رہا۔

تین ماہ خیریت سے گزر گئے مگر سکون اور خیریت جیسے الفاظ شاید میرے لئے ایجاد نہیں ہوئے تھے۔میری زندگی میں پھر ایک بار بھونچال آ گیا اور اب کی بار کچھ ایسا آیا۔جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

فیصل کافی دنوں سے مضمحل اور نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔میں جب بھی ڈاکٹر کے پاس جانے کا نام لیتی تو ٹال مٹول سے کام لینے لگتا۔اب تو پچھلے ایک ماہ سے اس نے شراب نوشی بھی نہیں کی تھی اور گاؤں جانا تو بالکل ہی کم کر دیا تھا۔اگر وہاں رانی نہ ہوتی تو شاید بالکل چھوڑ دیا جاتا۔

آج بھی فیکٹری سے گھر آیا تو اس کی رنگت زرد دکھائی دے رہی تھی اور چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔

''خیریت تو ہے نا؟ تم ٹھیک نہیں لگ رہے۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس پکڑا۔

''ہاں یار! آج بڑی تکلیف میں سارا دن گزارا۔''

''کیا ہوا؟'' میری پیشانی پر فکروں کا جال بن گیا۔

''بس کمر اور پیٹ کے دونوں اطراف میں سخت درد ہوتا رہا۔بہرحال اب تو کافی افاقہ ہے۔تم پریشان مت ہو۔''

''تم کھانا کھالو۔پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔اور خبردار! اگر آج تم نے مجھ سے ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی۔''

''اوکے! اب تو میں بھی سنجیدگی سوچ رہا ہوں کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کروا لینا چاہیے۔''

میں نے کھانا لگایا۔اس نے کھانا بھی برائے نام کھایا۔اور پھر ہم شکور کے ہمراہ شہر کے مشہور فزیشن کے پاس پہنچ گئے۔اس نے علامات سن کر کچھ ٹیسٹ لکھ دیئے۔جو میرے زور دینے پر اسی وقت کروائے گئے۔

ان ٹیسٹس کی رپورٹس دو دن بعد ملنا تھیں۔ڈاکٹر نے کچھ ایسی ادویات لکھ دیں۔جن سے دو دن سکون سے گزر گئے۔تیسرے دن رپورٹس لینے گئے تو ان رپورٹس کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے ایک ایسا جان لیوا انکشاف کیا۔جس نے میری دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔وہی ہوا جس کا خدشہ مجھے پچھلے کئی مہینوں سے لاحق تھا۔

ان رپورٹس کی رو سے فیصل کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے تھے اور وجہ کثرت شراب نوشی تھی۔ میں نے تو یہ خبر سنتے ہی رونا شروع کر دیا۔ فیصل بھی افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ واپسی کا راستہ شکور کی موجودگی کی وجہ سے، ہم نے خاموشی سے کاٹا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میں اونچی آواز میں رونے لگی۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟ کیوں رو رہی ہو؟ میں مرتو نہیں گیا؟ ابھی زندہ ہوں؟'' اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا مگر اس کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ بھی خاموش آواز میں رو رہا ہے۔

''کیا ملا شراب پی پی کر؟ شراب نے تمہارے جسم کو کھوکھلا کر دیا۔ تمہارے اعضا ختم ہو گئے۔'' میں شکوہ کناں ہوئی۔

وہ خاموش کھڑا میرے کندھے کو تھپکتا رہا۔ اس واقعے کے بعد زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی۔ سچ کہتے ہیں آگاہی بہت بڑا عذاب ہے اور بے خبری ایک عظیم نعمت۔

فیصل کی بیماری سے آگاہ ہونے کے بعد ہم دونوں جیسے مرنے سے پہلے مر گئے۔ اب وہ فیکٹری بھی کم کم جاتا۔ ہر وقت اٹوائی کھٹوائی لیے پڑا رہتا۔

میں سارا وقت اس کی دلجوئی اور خدمت میں جتی رہتی۔ گو ہر کو بھی مناسب توجہ نہ دے پاتی۔

فیصل دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی اذیت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر فیصل نے کڈنی ٹرانسپلانٹ نہ کروایا تو اس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کی طرح پہلے تو ٹرانسپلانٹ کرانے سے صاف انکار کر دیا مگر میرے منت سماجت کرنے پر وہ یہ آپریشن کروانے پر آمادہ ہو گیا۔

آپریشن کروانے سے پہلے ڈونر کا انتظام کرنا اور دوسرے معاملات طے کرنے میں دو ماہ لگ گئے اور یہ ساری بھاگ دوڑ میں نے شکور کے ساتھ مل کر کی۔ آخر ان تمام مراحل سے گزر کر، ڈاکٹر سے آپریشن کا وقت لیا گیا اور پھر شہر کے مشہور و معروف سرجن سے اس کا آپریشن کروایا گیا۔

جب تک وہ آپریشن تھیٹر میں رہا۔ میں باہر بیٹھی دعائیں مانگتی رہی۔ خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتی رہی۔ اس کے بچے اور رقیہ بھی آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے مگر سوائے رانی کے کسی نے مجھ سے بات نہ کی۔ ایک طویل اور صبر آزما وقت گزرنے کے بعد، ڈاکٹرز نے یہ خوشخبری سنائی کہ آپریشن کامیاب ہو چکا ہے۔ میں وہیں ہسپتال کے فرش پر سجدہ شکر بجا لائی۔

فیصل کو پندرہ دن ہوسپٹل میں رکھا گیا اور پھر ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں اسے اپنے ساتھ فلیٹ پر لے آئی۔ حالانکہ اس کے بچوں نے بڑی کوشش کی کہ ان کا باپ ان کے ساتھ حویلی میں چلا جائے مگر فیصل نے میرے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

وہ تیزی سے روبہ صحت ہو رہا تھا۔ میری توجہ اور محبت نے اسے زندگی کی طرف واپس لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں اس کے

کپڑے بدلتی۔اس کو نہلاتی۔اپنے ہاتھوں سے زود ہضم غذائیں تیار کر کے کھلاتی جبکہ دیگر دوسرے کاموں کے لئے شکور کی مدد حاصل کی جاتی۔

ایک دن میں اس کے پاس بیٹھی اسے دلیہ کھلا رہی تھی۔دلیہ کھلانے کے بعد میں نے اس کا منہ صاف کیا اور برتن اٹھا کر اٹھنے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر سے پاس بٹھا لیا۔

''بانو! یاد ہے۔میں نے ایک بار کہا تھا کہ میری بیوی بننے کی کبھی کوشش مت کرنا۔مجھے بیوی کی ضرورت نہیں مگر تم باز نہیں آئی۔بیوی بن کر ہی چھوڑا۔'' وہ محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور ساتھ مسکرا رہا تھا۔

میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''ہاں سچ کہتے ہو۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بہت بڑی ڈھیٹ واقع ہوئی ہوں۔شروع دن سے بیوی بن کر آئی۔بیوی بن کر رہی۔''

میری بات سن کر وہ ہنس پڑا۔

''سچ پوچھو تو...... میں بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے تم جیسی عورت کا ساتھ نصیب ہوا'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔''اب مر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں۔''

''مجھے تو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ تمہیں مرنے کا آخر اتنا شوق کیوں ہے؟ مرنے کی بات مت کیا کرو۔تم جیو گے۔ہم دونوں اکٹھے ایک ساتھ جیئیں گے۔اور بہت جیئیں گے۔''

''تمہیں ایک بات تو بتانا میں بھول ہی گیا۔''

''کون سی بات؟'' میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''دلاور اب بہت بدل گیا ہے۔اس نے نشہ چھوڑ دیا ہے اور اب وہ با قاعدگی سے فیکٹری جا کر میری سیٹ پر بیٹھنے لگا ہے۔منشی اکرم بتا رہا تھا کہ وہ کام کو کافی حد تک سمجھنے لگا ہے۔''

وہ خوشی خوشی بتا رہا تھا اور میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا دلاور اتنا کیسے بدل سکتا ہے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے میری بیماری نے اسے بدل دیا۔اس کے اندر احساس ذمہ داری پیدا کر دیا ہو۔'' اس نے جواب دیا۔

''چلیں یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ویسے میں نے سنا ہے کہ جو لوگ ہیروئن کے عادی ہو جاتے ہیں۔وہاں زندگی بھر اس موذی نشے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔اللہ کرے میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلے۔''

''آمین......'' فیصل نے صدق دل سے کہا۔

کچھ دن مزید گزرے تو دلاور، سجاول اور رانی کو لے کر فلیٹ پر آیا۔انہوں نے ہاتھوں میں پھولوں کے بوکے فروٹس اور جوس

کے ڈبے اٹھا رکھے تھے۔تینوں بہن بھائی باپ کے گلے لگ کر اسے ملے اور پاس بیٹھ کر کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

گو ہر بھی ان کے ساتھ جلدی ہی گھل مل گیا۔رانی اور میں نے اس دن ساتھ مل کر کھانا تیار کیا۔فیصل کے بچوں کی موجودگی سے میں ایک مکمل فیملی محسوس کر رہی تھی۔

فیصل کے چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔اس کے چاروں بچے اس کے آس پاس موجود تھے اور وہ ان چاروں کو آپس میں ہنستا کھیلتا دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

وہ دن ایک یادگار دن ثابت ہوا۔سارا دن ہم نے ایک فیملی کی طرح گزارا۔شام کو بچے رخصت ہوئے تو گھر جیسے ایک دم خالی خالی سا نظر آنے لگا۔

آج دلاور کا بدلہ ہوا رویہ میں نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا تھا۔اسے دیکھ کر مجھے فیصل کی باتوں پر خود بخود یقین آ گیا۔وہ واقعی بہت بدل چکا تھا۔

ان کے جانے کے ایک ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔اب جبکہ فیصل کافی حد تک صحت یاب ہو چکا تھا۔اب وہ خود ہی نہا کر کپڑے بدل لیتا تھا اور چلنے پھرنے بھی لگا تھا۔میں نے اس سے شبانہ کے ہاں جانے کی اجازت طلب کی۔کیونکہ میڈم کی زبانی پتہ چلا تھا کہ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی طبیعت ناساز تھی۔فیصل نے بخوشی اجازت دے دی کیونکہ وہ بھی جانتا تھا کہ میں پچھلے تین ماہ سے اس کی پائنتی سے لگی بندھی بیٹھی تھی۔

میں ناشتے سے فارغ ہو کر اور فیصل کو بھی ناشتہ کروا کر شبانہ کے ہاں چلی گئی۔چائے پینے کا ارادہ بھی موخر کر دیا۔سوچا آج شبانہ کے ہاتھ سے ہی چائے پیوں گی۔وہ سارا دن شبانہ کے ہاں گزارا اور سرِ شام گھر واپس آئی۔

واپس آتے ہوئے دل میں ڈر رہی تھی کہ فیصل اتنی دیر لگانے پر ڈانٹے گا۔مگر اس نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا تو ساری شرمندگی دور ہو گئی۔اس سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد شام کا کھانا تیار کرنے لگی۔اس کا پرہیزی کھانا الگ سے تیار کیا اور پھر ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔کھانے کے بعد اس کے پاس بیٹھ کر گپ شپ لگانے لگی۔دن بھر کی روداد سنانے لگی۔

اس نے کہا۔

”بانو! ایک کپ چائے کا بنا دو۔“

میں نے کہا۔”اچھا۔“

میں نے دو کپ چائے تیار کی۔ایک کپ اس کے ہاتھ میں پکڑا یا۔دوسرا بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا کیونکہ زیادہ گرم چائے پینے کی مجھے عادت نہیں۔

اسی اثنا میں گوہر جو کہ اب پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ بلکہ دوڑیں لگاتا تھا۔ اس نے خود کو چوٹ لگوا لی۔ اس کے رونے پر میں اس کی طرف لپکی۔ وہ غالباً کسی چیز سے ٹکرایا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون رس رہا تھا۔

میں نے اسے اٹھایا۔ اس کی چوٹ پر سنی پلاسٹ لگا دیا اور پھر اسے اپنے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی مگر وہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ فیصل اس دوران چائے پیتا رہا اور ٹی وی دیکھتا رہا۔

چند منٹوں بعد جب گوہر بے سدھ ہو گیا تو میں سمجھ گئی کہ وہ میرے کندھے سے لگا سو گیا ہے۔ میں نے اسے اس کی کاٹ میں ڈالا اور بیڈ کی طرف بڑھی۔ چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دیکھا کہ میری چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔

''اوہ۔ میری چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ ابھی گرم کر کے لاتی ہوں۔'' میں چائے کا کپ ہاتھ میں لئے کچن کی طرف جانے لگی تو فیصل کی اچانک بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے کو مسل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا ہوا فیصل؟'' میں نے چائے کا کپ دوبارہ ٹیبل پر رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''مجھے بتاؤ کیا ہو رہا ہے۔''

میں بری طرح گھبرا گئی تھی۔

''بانو یہ چائے مت پینا۔ اور جتنی جلدی ہو سکے۔ یہ فلیٹ چھوڑ کر یہاں سے چلی جاؤ۔ جلدی کرو۔''

''مگر کیوں ایسا کیا ہو گیا؟'' میں چلا کر بولی۔

''بانو! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کسی نے یقیناً دودھ میں زہر ملا دیا تھا۔ کس نے ملایا۔ کیسے ملایا۔ یہ باتیں سوچنے کا وقت نہیں رہا۔ میں اب زندہ نہیں بچوں گا۔ تم گوہر کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ تم دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی نکلو یہاں سے۔''

اب وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو دبا رہا تھا اور لوٹ پوٹ ہو رہا تھا مگر میں پتھر کا بت بنی اس کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی اور آسمان جیسے سر پہ آ گرا تھا۔

''کون ہو سکتا ہے؟ کس نے کیا یہ سب؟'' میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''دلاور نے......'' فیصل جان کنی کی کیفیت میں بمشکل بولا۔ ''دلاور کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔''

''میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' میں نے اپنا موبائل اٹھایا۔ فیصل نے اپنا ہاتھ کھڑا کر کے مجھے روکنے کی کوشش کی۔

''اب کوئی فائدہ نہیں۔ زہر بہت سریع الاثر ہے۔ اپنا اثر دکھا چکا ہے۔''

''نہیں فیصل تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔''

میں ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ ڈاکٹر کو فیصل کی سیریس کنڈیشن کا بتایا اور اپنے فلیٹ کا ایڈریس سمجھایا اور کہا۔

"جلدی سے آجاؤ ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر نے جلدی آنے کی یقین دہانی کرائی مگر اس کے آنے سے پہلے ہی فیصل دنیا چھوڑ چکا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اینٹھتا ہوا جسم چند جھٹکوں کے بعد پرسکون ہو گیا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں زندگی کی چمک سے خالی ہو گئیں اور چہرے کی رنگت نیلی پڑنے لگی۔ میں اس کے بے جان جسم سے لپٹ کر چیخیں مار کر رونے لگی۔ اس کی کھلی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کیا اور میڈم کا نمبر ملایا۔

"ہیلو میڈم...... فیصل مر گیا۔" میڈم کے فون اٹھاتے ہی میں نے بلا توقف یہ خوفناک اطلاع دی۔ میڈم میرے منہ سے یہ خبر سن کر جیسے حواس باختہ ہو گئی۔

"کیا...... کیسے؟ کیا ہوا؟" میڈم کے منہ سے چند بے ربط الفاظ نکلے۔

"میڈم! اس نے زہریلی چائے پی لی۔"

"زہریلی چائے...... مگر چائے زہریلی کیسے ہوئی؟"

"میڈم! فیصل کے کہنے کے مطابق دودھ میں زہر ملا ہوا تھا۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں گوہر کو لے کر صبح ہی شبانہ کے ہاں چلی گئی تھی اور اس طرح ہم دونوں ماں بیٹا اس زہریلے دودھ کو پینے سے محفوظ رہے۔ گھر واپس آ کر میں نے فیصل کے کہنے پر اسے چائے بنا کے دی۔ اپنا کپ بھی ساتھ ہی بنایا تھا۔ مگر اسے پینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چائے پی کر میرے سامنے تڑپ تڑپ کر اس نے جان دے دی۔" میں بلک بلک کر رونے لگی۔ دوسری طرف کچھ لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر میڈم کی حواس باختہ سی آواز میرے کان سے ٹکرائی۔

"بانو! تمام ضروری چیزیں مثلاً فلیٹ کے کاغذات، زیورات اور کیش اور پہننے کے لئے چند جوڑے کپڑے ایک بیگ میں ڈالو۔ میں دس منٹ تک گاڑی لے کر تمہاری بلڈنگ کے سامنے آ رہی ہوں۔ تم جلدی سے اس فلیٹ سے باہر نکلو۔"

"مگر میڈم! میں فیصل کو اس حالت میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟"

"ارے پاگل۔ تمہیں مارنے والے بہت طاقتور ہیں۔ وہ تمہاری موت کی تصدیق کرنے کے لیے ضرور وہاں آئیں گے۔ جلدی نکلو...... جلدی...... اور ویسے بھی جس انسان کے سہارے تمہاری پوزیشن مستحکم تھی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب تو صرف جیل کی ہوا کھاؤ گی وہاں رہ کر۔ ہوش کے ناخن لو۔ یہ وقت جذبات سے کام لینے کا نہیں ہے۔ تم فوراً جو چیزیں میں کہہ رہی ہوں اکٹھی کرو۔ میں آ رہی ہوں۔"

میڈم نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور میں روتے ہوئے بیگ میں مطلوبہ چیزیں رکھنے لگی۔ دس بارہ منٹ کے بعد میرے موبائل پر میڈم کی کال آنے لگی۔ میں نے فون اٹھایا تو میڈم کی آواز سنائی دی۔

"فوراً نیچے آؤ۔"

میں نے ایک کندھے پر بیگ لٹکایا اور دوسرے کندھے پر گوہر کو لگا لیا۔ بیڈ پر بکھرے ہوئے فیصل پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ دل خون کے آنسو رونے لگا۔ تیزی سے فلیٹ سے باہر نکل آئی۔ لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر آئی تو بلڈنگ کے مین گیٹ کے سامنے ہی میڈم کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھی۔ اس نے جھک کر فرنٹ ڈور کھولا اور میں اسکے مقابل بیٹھ گئی۔ گاڑی زن سے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

میڈم مجھے لے کر شبانہ کے گھر پہنچ گئی۔ شبانہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھے اندر پہنچایا۔ میڈم نے مجھ سے کہا۔

''اپنا فون نمبر فوراً بند کر دو۔ میں نے تم سے رابطہ کرنا ہوا تو شبانہ کے فون پر کر لیا کروں گی۔ تم نے اپنا موبائل بند ہی رکھنا ہے۔''

''اوکے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میڈم واپس چلی گئی۔ شبانہ نے بیرونی دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ پھر وہ مجھے لیے ہوئے برآمدے تک آئی۔ اس کے بچے سو چکے تھے جبکہ شوہر ابھی جاگ رہا تھا۔ وہ ہماری آوازیں سن کر باہر آ گیا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں شوہر سے لڑائی ہو گئی اس کی۔ اس لئے پریشان ہے۔'' شبانہ کو وقتی طور پر اور کچھ نہ سوجھا تو یہ بہانہ بنا دیا۔

''اوہ! خدا خیر کرے۔ میاں بیوی میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ باجی جی، آپ بالکل نہ گھبرائیں۔'' اس نے مجھے تسلی تشفی دی اور واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شبانہ مجھے لیے ہوئے ایک ایسے کمرے میں آ گئی۔ جو غالباً سٹور روم تھا۔ اس میں بستر رکھنے والے صندوق اور دوسری چیزوں کے علاوہ ایک پرانے زمانے کا پلنگ بھی بچھا ہوا تھا۔ جس پر دھلے ہوئے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ شبانہ نے وہ کپڑے وہاں سے اٹھائے اور میں اس پر بیٹھ گئی۔

شبانہ بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔

''اب بتاؤ! ایسی کیا افتاد آ پڑی کہ تمہیں رات کے اس پہر گھر سے نکلنا پڑا؟''

میں اس کے کندھے پر سر رکھے پھر سے رونے لگی۔

''میں بہت بدنصیب ہوں شبانہ۔ میری زندگی میں خوشیوں کا دورانیہ بہت کم وقت کے لئے آتا ہے۔ جبکہ دکھوں کا اندھیرا ختم ہونے میں نہیں آتا۔''

''اب کیا ہوا؟'' اس نے مجھے خود سے الگ کر کے پوچھا۔

''فیصل مر گیا۔''

''کک......کیا......کیسے؟'' اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

''پتا نہیں......کیسے.......بس وہ مر گیا۔ بلکہ اس کو کسی نے مار دیا۔''

''کیا......مطلب......اس کو کسی نے قتل کر دیا؟''اس نے پوچھا۔''مگر کس نے قتل کیا اسے۔؟''

''شاید اس کے بیٹے نے یا کسی اور نے۔ ابھی کوئی بھی بات کنفرم نہیں ہے۔''میں ہچکیوں کے دوران بتاتی رہی اور وہ تاسف سے سر ہلاتی رہی۔

''اب کیا ہوگا بانو؟ اگر اس قتل کا الزام تم پر لگ گیا تو......؟''اس کے لہجے میں اندیشوں کے ناگ سرسرا رہے تھے۔

''اس بات کا تو پورا امکان ہے۔یہی سوچ کر میڈم مجھے وہاں سے نکال کر لائی ہیں۔''

وہ دو گھنٹے تک میرے پاس بیٹھی مجھے تسلیاں دیتی رہی۔

''تم آرام کرو اور حوصلہ رکھو۔ اللہ بہتر کرے گا۔''یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میرے لئے وہ رات پہاڑ جیسی کٹھن اور قیامت خیز ثابت ہوئی۔ میں ساری رات بیٹھ کر روتی رہی۔ جب بیٹھ بیٹھ کر تھک گئی تو لیٹ گئی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ فجر کے وقت ایک دو گھنٹے کے لیے شاید آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ بچوں کے شور کی آواز سے کھلی۔ وہ شاید اسکول کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ باہر صحن سے چڑیوں کی چہچہاہٹ اور بچوں کی ملی جلی آوازیں کانوں میں پڑنے لگیں۔ بیچ بیچ میں شبانہ کا بھی کوئی ایک آدھ فقرہ سنائی دے جاتا تھا۔ وہ یقیناً ان کے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ ایک گھنٹہ یہ کھٹر پٹر کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

بچے اسکول جبکہ ان کا باپ فیکٹری جا چکا تھا۔ شبانہ نے بیرونی دروازے کی کنڈی لگائی اور میرے کمرے میں آ گئی۔

''تم ناشتے میں کیا لینا پسند کرو گی؟''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔بس گوہر کو فیڈر میں دودھ ڈال دو۔''میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''مگر کچھ تو کھانا پڑے گا۔اس طرح بھوکی کب تک رہو گی؟''

''ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ جب دل کیا کھا لوں گی۔تم بس گوہر کو فیڈر بنا دو۔''

وہ گوہر کا فیڈر لے کر باہر نکل گئی اور میں پھر سے سوچوں کے تانے بانے بننے لگی۔

دس بجے کے قریب میڈم نے شبانہ کے فون پر کال کی۔ مجھ سے بات کی اور بتایا کہ فیصل کے قتل کی خبر ہر سو پھیل چکی ہے۔ ٹی وی پر بھی یہ خبر بریکنگ نیوز کی صورت بار بار چل رہی ہے۔

''دلاور میڈیا کے سامنے یہی بیان دے رہا ہے کہ مہر بانو، یعنی اس کی سوتیلی ماں اس کے باپ کو قتل کر کے دو لاکھ روپیہ کیش اور سات لاکھ کا زیور لے کر فرار ہو گئی ہے۔ اب وہ یقیناً پولیس کے سامنے بھی یہی بیان دے گا اور ایف آئی آر بھی تمہارے خلاف ہی کٹوائے

گا۔یعنی تم دنیا والوں کی نظر میں فیصل کی قاتلہ بن چکی ہو۔''

''اب کیا ہوگا میڈم؟''میری آواز خوف سے لرز رہی تھی۔

''پتا نہیں......ابھی تو میرا دماغ بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔تمہارا کیس بہت کمزور دکھائی دے رہا ہے۔دلاور اور اس کے ماموں ساجد کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ تمہیں سزائے موت ہو جائے یا پھر عمر قید۔تاکہ ان کے راستے کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں۔''

''مگر میں کب تک پولیس سے چھپتی پھروں گی؟ وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔''میں رونے لگی۔میڈم بھی بہت غمزدہ دکھائی دے رہی تھی۔اس کے لہجے اور آواز سے یہ بات صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

''واقعی! قانون کی نظروں سے بھلا کب تک کوئی چھپ سکتا ہے۔''میڈم کا لہجہ شکستگی لیے ہوئے تھا۔

''کیوں نہ میں خود ہی تھانے میں پیش ہو کر پولیس والوں کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں؟''میں نے میڈم سے رائے لینا چاہی۔

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو، جیسے وہ تمہاری ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کرلیں گے۔اور دلاور کو گرفتار کرلیں گے۔تمہارے پیش ہونے سے ان کا کام مزید آسان ہو جائے گا۔تمہیں پکڑ کے حوالات میں بند کریں گے اور پھر چارج شیٹ لگا کر جیل بھیج دیں گے۔اللہ اللہ خیر صلا۔بہرحال تم فکر مت کرو۔میں شہر کے قابل ترین وکیل کی خدمات حاصل کروں گی اور تمہارا کیس پوری جی جان سے لڑوں گی۔''میڈم نے مجھے تسلی دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

''شکریہ میڈم! مگر قابل وکیل کو ہائر کرنے کے لیے ڈھیر سارا پیسہ بھی چاہیے ہوگا۔بڑے وکیلوں کی فیس بھی کافی بڑی ہوتی ہے۔میرے پاس پچاس ساٹھ ہزار روپیہ کیش اس کے علاوہ پانچ چھ لاکھ کا زیور بھی ہوگا۔وہ سب لے لیں اور وکیل کی فیس ادا کر دیں۔اگر ان چیزوں سے بھی کام نہ چلے تو میرا فلیٹ بیچ دیں۔''

''میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔جب ضرورت ہوگی تو یہ چیزیں بھی بیچ دیں گے۔''میڈم نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا بانو! یہ دودھ والا کون ہے؟ اور کہاں سے آتا ہے؟ جانتی ہو اسے؟''

''نہیں میڈم میں اسے نہیں جانتی۔میں نے کبھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔وہ بھی چپ چاپ دودھ پکڑا کر چلا جاتا تھا۔''

''اس کے نام کا تو پتہ ہی ہوگا؟''

''نہیں، مجھے اس کے نام کا بھی نہیں پتا۔شکور جانتا ہوگا۔شاید اسی نے وہ دودھ والا لگوایا تھا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔میں شکور سے بات کرتی ہوں۔اگر کسی طرح اس گوالے تک پہنچ جائیں تو اس کیس کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔''

میڈم نے چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

تقریباً بارہ بجے کے قریب شبانہ کے گھر کا بیرونی دروازہ بڑے زور سے کسی نے دھڑ دھڑایا۔میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

میں خوف زدہ ہوگئی۔شبانہ بھی میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ بھی سراسیمہ دکھائی دے رہی تھی۔

''اس وقت کون ہوسکتا ہے؟'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''یقیناً یہ پولیس ہے۔مجھے گرفتار کرنے آئی ہے۔مجھے اپنے ساتھ لے جائے گی۔میری تم سے ایک ہی التجا ہے شبانہ۔تم میرے بچے کا خیال رکھنا۔اسے اپنی اولاد سے زیادہ چاہنا۔''

میں رونے لگی۔اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ہلکا سا دبایا اور بیرونی دروازے کی طرف سست روی سے جانے لگی۔

قریب جا کر اس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں......ریاض......دروازہ کھولو شبانہ۔'' دوسری طرف سے ریاض کی آواز سنائی دی تو شبانہ نے اطمینان بھری گہری سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔وہ تیزی سے اندر آیا اور جھپٹ کر پیچھے سے دروازہ لاک کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے کمرے کی طرف آیا۔

''بانو بہن! تمہارے لئے ایک بہت بری خبر ہے۔''اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔''چودھری فیصل کو کسی نے قتل کر دیا۔ابھی ابھی خبروں میں سنا ہے۔اور قتل کا الزام بھی تم پر لگ رہا ہے۔'' وہ خاموش ہوگیا۔اس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔

میں نے سر جھکا دیا۔

''ہاں بھائی! میں جانتی ہوں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''مگر تمہیں کس نے بتایا؟ تم تو رات سے یہاں ہونا؟'' وہ اچنبھے سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''جب میں گھر سے نکلی تھی۔فیصل مر چکا تھا۔اس کے جان دینے کے بعد ہی میں گھر سے نکلی تھی۔''

''تو کیا وہ قتل نہیں ہوئے؟ طبعی موت مرے ہیں؟'' اس کی حیرانی دوچند ہو چکی تھی۔

''وہ قتل ہی ہوئے ہیں۔ان کے بیٹے نے دودھ میں زہر ملایا ہوا تھا۔اسی دودھ سے میں نے چائے بنا کر انہیں دی اور وہ چائے پیتے ہی انہوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔''

''اوہ خدایا!'' ریاض نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''اور میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر ہی وہاں سے فرار ہو آپ کے گھر پناہ لے رکھی ہے۔اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہے تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ لوگ کسی مصیبت میں پڑ جائیں۔'' میرا گلا رندھ گیا۔

''بہن! ایسی بات نہیں ہے۔جب تک دل چاہے یہاں رہو مگر شبانہ تمہاری گہری دوست ہے۔اس بنا پر سب سے پہلا شک اسی

پڑ جائے گا۔'' اس نے رسانیت سے جواب دیا۔

''تو میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔؟ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

''تم شام تک یہاں رہو۔ اب میں بھی فیکٹری واپس جاتا ہوں تاکہ میری غیر موجودگی سے کسی کو کوئی شک نہ پڑے۔ کل جمعہ ہے۔ فیکٹری سے چھٹی ہے مجھے۔ تو کل صبح ہی صبح ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں تمہیں اپنے آبائی گاؤں چھوڑ آؤں گا۔ جو یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ تم جب تک دل چاہے وہاں سکون سے رہ سکتی ہو۔''

اس نے مجھے تسلی تشفی دی اور فیکٹری واپس چلا گیا۔

شبانہ نے میرے لئے ناشتہ تیار کیا اور چائے بنائی۔ مجھے زبردستی ناشتہ کروایا۔ ناشتہ کرنے اور چائے پینے سے حواس کچھ کام کرنے لگے۔ بارہ بجے کے قریب میڈم کی کال آ گئی۔ اس نے مجھ سے بات کی اور کہا۔

''وہی بات ہوئی بانو۔ جس کا ڈر تھا۔ دلاور نے تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوائی ہے۔ اب پولیس تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ ہوسٹل میں بھی آئی تھی۔ مجھ سے بھی کافی دیر تک پوچھ تاچھ کرتے رہے۔ میں نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایس ایچ او مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور کاٹ دار لہجے میں سوالات پوچھتا رہا مگر میں پرسکون انداز میں نپے تلے جوابات دیتی رہی۔''

میڈم! آپ اپنے نمبر سے شبانہ کو کال کر رہی ہیں۔ اگر آپ کا نمبر ٹریس کیا جا رہا ہوا تو؟''

''نہیں، میں نے اپنی ملازمہ بشیراں سے اس کا فون، نمبر سمیت خرید لیا ہے۔ اسے پیسے دیئے ہیں کہ بازار سے نیا فون اور نئی سم خرید لو۔ اب میں اسی کے فون سے بار بار رابطہ کر رہی ہوں۔''

''اوکے۔'' پھر میں نے ریاض سے ہونے والی ساری گفتگو میڈم کے گوش گزار کی۔ میڈم نے ریاض کے فیصلے کی تائید کی اور کہا۔

''یہی بہتر ہے کہ تم ایک دو ماہ کے لئے منظر سے غائب ہو جاؤ۔ معاملات ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ تب تک کوئی حل بھی نکال لیں گے۔''

پھر میڈم نے کال بند کر دی۔ میں پاس سوئے ہوئے گوہر کے ساتھ لیٹ گئی۔ رہ رہ کے فیصل کا مردہ چہرہ آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اب تو مجھے اپنے منحوس ہونے کا پختہ یقین ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر کانوں کی لوئیں بھگونے لگے۔

☆......☆......☆

شام کو ریاض کام سے واپس آیا۔ سب نے مل بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا۔ شبانہ کے پرزور اصرار پر میں نے بھی چند لقمے زہر مار کئے۔ بچے سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جبکہ ریاض اور شبانہ میرے پاس رات گئے تک بیٹھے رہے۔ ریاض نے کہا۔

''باجی! تیار رہنا، صبح چھ سات بجے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں بھی گوہر کو ساتھ لگائے، سونے کی کوشش کرنے لگی۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ جب زوروں سے بیرونی دروازے کے پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بھونچال آ گیا ہو۔ میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

کمرے سے باہر نکلی تو ریاض اور شبانہ بھی اپنے کمرے سے باہر نکل کر سراسیمگی سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابھی ہم تینوں کسی فیصلے پر بھی نہ پہنچے تھے کہ بیرونی دیوار جو کہ آٹھ نو فٹ اونچی تھی۔ اسے پھلانگتے ہوئے تین پولیس اہلکار صحن میں کودے۔ دو ہماری طرف بڑھے جبکہ تیسرے نے بیرونی دروازہ کھول دیا۔

آٹھ دس پولیس والے دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان سب کا رخ ہماری طرف تھا۔ ان کے ساتھ ایک لیڈی کانسٹیبل بھی تھی۔ اس نے مجھے ہتھکڑیاں لگائیں اور اپنے ساتھ کھینچنے لگی۔

میں چلانے لگی۔ شبانہ بھی چلا رہی تھی۔ ریاض نے اسے دھکیل کر پیچھے کیا اور آگے بڑھ کر ایس ایچ او سے بات کرنے لگا۔ ایس ایچ او نے انتہائی کرخت لہجے میں اس کی باتوں کے جواب دیئے اور ساتھ ہی لیڈی کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر باہر لے جانے لگی۔

شبانہ کے گھر سے باہر نکلتے ہوئے ایک ہی جملہ میری زبان پر تھا۔ ”شبانہ میرے بچے کا خیال رکھنا۔“

انہوں نے مجھے پولیس موبائل میں دھکیلا، وین اسٹارٹ ہوئی۔ اب اس کا رخ مقامی پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

مجھے تھانے میں لے جا کر عورتوں والی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ میں ایک کونے میں سکڑ سمٹ کے بیٹھ گئی۔ گھٹنے اکٹھے کر کے ان پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔ کانسٹیبلز آپس میں معنی خیز سرگوشیاں کرتے ہوئے خبیثانہ انداز میں میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ایس ایچ او بھی حوالات کے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور تمسخرانہ انداز میری طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں تو مہر بانو صاحبہ! تم نے چوہدری فیصل کو کیوں قتل کیا؟ اور کیسے قتل کیا؟“

”میں نے انہیں قتل نہیں کیا انسپکٹر صاحب! پلیز میری بات پر یقین کریں۔ میں نے اپنے شوہر کو نہیں مارا۔“ میں پھر سے رونے لگی۔

”بی بی! ہر قاتل یہی کہتا ہے۔ ایسے جملے تو ہم آئے دن پتہ نہیں کتنے مجرموں کے منہ سے سنتے ہیں۔ کبھی چور بھی چوری کر کے مانا ہے۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ”ویسے تم نے اپنے شوہر کو مار کے کوئی عقلمند عورت ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ مثال تو تم نے سنی ہو گی کہ ہر روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح نہیں کیا کرتے۔ بلکہ ہر روز ایک انڈا لے کر سنبھال لیتے ہیں۔“ یہ بات کر کے وہ بھونڈے انداز میں ہنسا تو پاس کھڑے ہوئے کانسٹیبلز بھی گھٹیا انداز میں ہنسنے لگے۔

میں اور شدت کے ساتھ رونے لگی۔ اتنے میں ایس ایچ او کے فون پر کسی کی کال آنے لگی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

''ہاں جی دلاور صاحب! آپ کی مجرمہ کو پکڑ لیا ہے۔ وہ حوالات میں بیٹھی رو رہی ہے اور یہی کہہ رہی ہے کہ میں نے اپنے شوہر کو نہیں مارا...... جی ہر مجرم یہی کہتا ہے صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ ہیں جی؟ اس وقت تو آپ کا آنا مناسب نہیں۔ صبح ہونے کا انتظار کر لیں۔ اتنی بے تابی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے قبضے میں ہے یہاں سے بھاگی تھوڑی جا رہی ہے۔'' پھر وہ بے ہودہ انداز میں قہقہے لگانے لگا اور فون کان کے ساتھ لگائے لگائے اپنے روم میں چلا گیا۔

میں سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی۔ آنے والے وقت کا سوچ سوچ کر ہی میری جان نکل رہی تھی۔ قتل کا الزام لگنا اور پھر گرفتار ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

آدھی سے زیادہ رات تو ویسے بھی گزر چکی تھی اور جو باقی تھوڑی سی بچی تھی۔ وہ میں نے گھٹنوں میں سر دیئے رو کر گزار دی۔ صبح صادق کے وقت دلاور تھانے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ حوالات کی بیرک کچھ اس رخ پر تھی کہ ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہونے والا ہر شخص میری نظروں میں آسکتا تھا۔ دلاور کا رخ بھی یقیناً ایس ایچ او کے کمرے کی طرف ہی تھا۔

اس کے چہرے پر وہی خباثت رقص کر رہی تھی۔ جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ وہ ایس ایچ کے کمرے میں چلا گیا اور چند منٹ بعد ایس ایچ او کے ساتھ ٹہلتا ہوا، میرے سامنے آ گیا۔ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کیا۔

''سلام چھوٹی امی! مزاج کیسے ہیں؟ اب تک تو ٹھکانے پر آ چکے ہوں گے۔ چودھری فیصل سے نکاح کر کے چوہدرانی بننے کا جو بھوت دماغ پر سوار ہو چکا تھا۔ یقیناً اتر چکا ہوگا۔ اب باقی کی ساری زندگی جیل میں بیٹھ کر چکی پیسنا ہوگی۔ وہ بھی اگر پھانسی کے پھندے سے یہ نرم و نازک گردن بچ گئی تو......''

وہ کافی دیر کھڑا بکواسیات بکتا رہا اور ساتھ کھڑا ایس ایچ او ہنستا رہا۔ پھر دونوں واپس اسی کمرے میں چلے گئے، جہاں سے نکلے تھے۔ میں نے دلاور کی کسی بات کا بھی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی سنتی رہی۔

پندرہ بیس منٹ بعد دلاور کو میں نے ایس ایچ او کے کمرے سے نکل کر باہر کی طرف جاتے دیکھا۔ تقریباً نو، ساڑھے نو بجے میڈم تھانے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک کالے کوٹ والا بارعب شخص بھی تھا۔ یہ یقیناً وکیل تھا۔

میڈم پورے طمطراق اور تمکنت کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کی ملازمہ بشیراں بھی پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس نے شاید ناشتے کے لوازمات اٹھائے ہوئے تھے۔

میڈم اور وکیل ایس ایچ او کے کمرے میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد ایس ایچ او کے ہمراہ میڈم حوالات کی طرف آئی۔ اس نے مجھے اشارے سے پاس بلایا۔

''کیسی ہو مہر بانو؟''

''ٹھیک ہوں میڈم۔'' میرے حلق سے بمشکل کمزور سی آواز نکلی۔

''حوصلہ رکھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ بس ہمت مت ہارنا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساتھ کھڑے وکیل نے ایک فائل سلاخوں کے راستے اندر داخل کی۔

''بی بی! ان کاغذات پر تمہارے سائن چاہئیں۔'' جہاں جہاں وہ بتاتا گیا۔ میں وہاں وہاں دستخط کرتی گئی۔ سائن کر کے اس کو فائل واپس کر دی۔ پھر میڈم نے ایس ایچ او کی طرف دیکھا اور کہا۔

''میں اپنی عزیزہ کو ناشتہ کروانا چاہتی ہوں۔ یہ ناشتہ اندر پہنچا دیں۔''

ایس ایچ او نے ایک کانسٹیبل کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ بشیراں سے ناشتہ پکڑا اور اندر پہنچا دیا۔ میڈم نے ایک بار پھر مجھے تسلی تشفی دی اور کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

پھر میڈم جس طمطراق سے اندر آئی تھی اسی رعب اور تمکنت سے واپس چلی گئی۔ میڈم کے آنے سے میرے اعصاب پر بڑا خوشگوار اثر پڑا تھا۔

میں نے ناشتے کے برتن کھول کر دیکھے۔ اس میں پرتکلف اور شاہی ناشتہ تھا۔ حلوہ، پوری، چنوں کے علاوہ پائے اور نان بھی موجود تھے۔ میں نے چند لقمے کھائے اور باقی ناشتہ کانسٹیبل کو دے دیا اور کہا کہ آپ سب لوگ مل بانٹ کر کھا لیں۔ اس نے رسمی طور پر بھی انکار کرنا ضروری نہ سمجھا۔ خوشی خوشی آیا اور برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔

میں پھر سے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے اب تو کمر بھی دکھنے لگی تھی۔ ایک بات میں نے نوٹ کی کہ میڈم کی تھانے آمد کے بعد سے کانسٹیبلز اور ایس ایچ او کا رویہ مجھ سے بہت بدل گیا تھا۔ وہ اب کسی حد تک مجھ سے مرعوب دکھائی دینے لگے تھے۔

اسی دن مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ عدالت نے جیوڈیشل ریمانڈ پر مجھے جیل بھیج دیا۔ میں ایک مہینہ اس زنداں میں رہی۔ جیل میں ایک ماہ گزارنا میری زندگی کا ایک انوکھا اور ناقابل فراموش دورانیہ تھا۔ میڈم نے یہاں بھی دو وقت کا کھانا مجھ تک پہنچانے کا بہترین انتظام کر رکھا تھا۔

میں جانتی تھی کہ ان سہولیات کو مجھ تک پہنچانے کے لئے کئی سرکاری ملازموں کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہو گی مگر میڈم یہ سارے کام با احسن طریقے سے سرانجام دے رہی تھی۔ اس کی پھرتی اور قابلیت قابل داد تھی اور یہ بات مجھ پر مزید واضح ہو گئی کہ میڈم کا اثر ورسوخ اور تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ کوئی بھی کام میڈم کے لیے ناممکن یا مشکل نہیں تھا۔

اس ایک ماہ میں میڈم مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے متعدد مرتبہ جیل آئی۔ جمعہ کا دن قیدیوں سے ان کے ملاقاتیوں کے لیے

مخصوص تھا۔

میڈم ہر ملاقات میں میری ڈھارس بندھاتی تھی مگر اس کی حوصلہ افزائی کے باوجود میں جانتی تھی کہ میرا کیس بہت کمزور ہے۔

ایک دن میڈم سے گوہر کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ شبانہ اس کو لے کہیں دور اپنے کسی سسرالی گاؤں میں چلی گئی ہے کیونکہ اسے اس کی جان خطرے میں دکھائی دے رہی تھی۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ شبانہ میرے لیے بہت زیادہ قربانی دے رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ریاض کے بچوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہوگا۔ اس کی غیر موجودگی میں گھر سنبھالنا اور بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجنا ریاض کے لئے بہت مشکل عمل ثابت ہو رہا ہوگا مگر وہ دونوں میاں بیوی میرے لیے بہت کچھ کر رہے تھے۔

''میڈم اس گوالے کا کچھ پتہ چلا؟'' میرے ذہن میں اچانک سوال آیا۔

''شکورا سے ہر جگہ ڈھونڈ رہا ہے مگر ابھی تک اس کی کچھ آگ سگ نہیں مل سکی۔ بہر حال اس کی روپوشی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دلاور کے ساتھ اس جرم میں برابر کا شریک رہا ہے۔''

''ہاں جی۔ ظاہر ہے۔'' میں نے میڈم کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ایک ماہ بعد کیس عدالت میں لگ گیا اور اس کے پیچھے بھی یقیناً دلاور اور اس کے ماموں ساجد کا اثر ورسوخ تھا۔ وہ اس کیس کو جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچانا چاہتے تھے۔ پہلی دو تین پیشیوں پر تو کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہو سکی۔ چوتھی پیشی پر دلاور نے اپنا بیان قلمبند کروایا۔

اس کے بیان کے مطابق، میں ایک آوارہ اور بد چلن عورت تھی۔ میرے کئی مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ پھر میں نے اپنے حسن کی مدد سے اس کے باپ کو پھانس لیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ اور یہ نکاح کرنے کے پیچھے یہی مقصد تھا کہ چوہدری فیصل کی جائیداد ہتھیا سکوں اور اپنے بینک بیلنس میں مزید اضافہ کر سکوں۔

وہ کٹہرے میں کھڑا اسی طرح کی بے بنیاد الزام تراشیاں کرتا رہا اور میں سر جھکائے کھڑی سنتی رہی۔ اس نے اپنے بیان کے اختتام پر جج سے یہ درخواست بھی کی کہ مجھ جیسی سفاک اور شقی القلب عورت کو پھانسی سے کم سزا نہیں ملنی چاہیے۔

ہر پیشی کو بھگتنے کے بعد، امید کی ایک ڈوری ہاتھ سے چھوٹ جاتی۔

اگلے جمعہ کو میڈم ملاقات کے لیے آئی تو اس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا اور باتوں میں بھی وہ پہلے جیسا دم خم باقی نہ رہا تھا۔

''میڈم! آپ کا قابل اور مہنگا وکیل آخر کر کیا رہا ہے؟'' میری چڑ چڑاہٹ میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''میں اور شکور اس گوالے کو ڈھونڈنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ شکور ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی ساری ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں مگر کمبخت کی سمجھ نہیں لگ رہی کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اس لئے اب ہماری کوشش یہی ہوگی کہ پیشیاں بڑھاتے جائیں۔ تمہاری بیماری کا بہانہ کر کے کیس کو لٹکانے کی کوشش کریں گے۔''

پھر میڈم نے وہی کیا۔ڈاکٹر سے میری بیماری کا جعلی نتیجہ بنوالیا اور دو تین پیشیوں پر میری غیر حاضری یقینی بنادی۔جج کو یہی بتایا گیا کہ ملزمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔عدالت میں حاضر ہونے سے معذور ہے۔دلاور کا وکیل اور دلاور پیچ وتاب کھا کر رہ جاتے تھے اور پھر ایک دن قدرت کو شاید مجھ پر ترس آ گیا یا پھر ظالموں کے ظلم کا گھڑا ابھر کے پھوٹ گیا۔

وہ معجزہ ہو گیا جس کی ہمیں توقع نہیں تھی۔میڈم ملاقات کے لئے آئی تو اس کا چہرہ کسی اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔

''کیا بات ہے میڈم! آج بڑی خوش دکھائی دے رہی ہیں؟''

''تم سنو گی، تو تم بھی خوشی سے جھوم اٹھو گی۔اب یہ کیس جیتنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔''

''آخر ہوا کیا ہے۔؟ کچھ بتائیں تو سہی۔کیا دودھ والا مل گیا؟''میں نے قیافہ لگایا۔

''اب وہ بھی مل جائے گا۔جس درندے کے ڈر سے وہ چھپا بیٹھا ہے وہ درندہ آج صفحہ ہستی سے مٹ چکا۔''میڈم مسرور لہجے میں بولی۔

''کچھ بتائیں گی بھی یا صرف پہیلیاں ہی بجھواتی رہیں گی۔''میں اب کوفت میں مبتلا ہونے لگی تھی اور میڈم میری اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''اچھا تو پھر سنو! چوہدری ساجد قاتلانہ حملے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔قاتل نے گولیوں سے اس کا جسم چھلنی کر دیا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔''

میڈم کی اطلاع واقعی بڑی دھماکہ خیز تھی۔میں ہونق چہرہ لئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔



ناول ''تہی دامن'' ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 15 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔